الفاظِ قرآنی کی تفہیم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

قرآن و سنّت اکیڈمی نئی دہلی ۲۵

الفاظ قرآنی کی تفہیم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب

طلحہ ایوب اصلاحی

قرآن و سنت اکیڈمی

N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

©مرتب
طبع اول : جنوری ۲۰۰۵ء
ناشر: قرآن وسنت اکیڈمی، N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵
تقسیم کنندہ :

البلاغ پبلی کیشنز

۱۰۔ اعظمی اپارٹمنٹ، N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

Alfaz-e- Quraani ki Tafheem

By: Maulana Syed Abul Aala Maududi

Compiled by: Talha Ayyub Islahi

Distributed by: Al-Balagh Publications

N-1, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025

Price Rs 140/=

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمہ کی تفسیر قرآن مجید ''تفہیم القرآن'' دورِ حاضر کی ایک مشہور و معروف تفسیر ہے۔ تفہیم القرآن میں تفسیر کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی مفید اور بیش قیمت معلومات بھی فراہم کر دی گئی ہیں جو تفسیر سے براہِ راست تعلق نہ رکھنے کے باوجود نہایت اہم ہیں۔ ان سے قرآن کے حقائق کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً آثارِ قدیمہ نے تاریخ کے جن پوشیدہ حقائق پر سے پردے اٹھائے ہیں اس تفسیر میں ان سے بھی کام لیا گیا ہے اسی طرح جدید سائنس اور فلکیات کی تحقیقات سے بھی حسبِ ضرورت استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی سورہ کی تفسیر سے پہلے یہ ضروری سمجھا گیا کہ جس پس منظر میں اس سورہ کا نزول ہوا ہے وہ قارئین کے پیشِ نظر رہے تاکہ سورہ کے مباحث کی اہمیت کا انھیں صحیح اندازہ ہو سکے۔

ہم دیکھتے ہیں عیسائی علماء نے بائبل سے متعلق کئی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً ''بائبل کی تاریخ'' جس میں تاریخ کے مختلف ادوار اور مختلف قوموں کے بارے میں تاریخی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے بائبل کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح کتاب مقدس (بائبل) کے ادبی محاسن پر مستقل کتاب تصنیف کی گئی ہے، جس میں کتاب مقدس کا ادبی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح بائبل کے چھوٹے بڑے اٹلس (Atlas) شائع کیے گئے ہیں جو ان لوگوں کے لیے نہایت کارآمد ہیں جو بائبل کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ کو اس کا احساس رہا ہے کہ قرآن سے متعلق بھی مختلف پہلوؤں سے تحقیق و تصنیف کی ضرورت ہے۔ حتی الوسع تفہیم القرآن میں اس ضرورت کے تحت مولانا علیہ الرحمہ نے بہت کچھ علمی و تاریخی سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ پھر بھی یہ ایک ضرورت ہے کہ قرآن سے متعلق مختلف اہم موضوعات پر الگ الگ ایسی کتابیں لکھی جائیں جو قرآن کے سمجھنے میں مددگار ہو سکیں۔ اس سلسلے میں امام حمید الدین فراہیؒ کی بعض کتب بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ مثلاً 'اقسام القرآن' اور 'حکمت قرآن' وغیرہ۔

مولانا مودودیؒ نے اپنی تفسیر میں جہاں تاریخ، سیرت نبویؐ اور دوسری چیزوں سے استناد کیا

ہے وہیں انھوں نے قرآن کے بعض اہم الفاظ واصطلاحات کی تشریح وتوضیح بھی لغت اور دیگر کتب کی روشنی میں کی ہے۔ ان میں سے بعض الفاظ تو نہایت کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھیں آپ Keywords کہہ سکتے ہیں۔ ان سے قرآن کی روح اور اس کے اصل پیغام کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے جن قرآنی الفاظ کی تشریح وتوضیح فرمائی ہے وہ چونکہ تفہیم القرآن کی جلدوں میں مختلف مقامات پر منتشر شکل میں درج ہیں اس لیے ان سے استفادہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ تفہیم کی تمام ہی جلدوں کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ اس لیے یہ ایک ضرورت تھی کہ مولانا کی اس سلسلے کی کاوشوں کو یکجا کر دیا جائے تاکہ ان سے استفادہ ہر ایک کے لیے آسان ہو سکے۔

یہ بڑی ہی مسرت کی بات ہے کہ عزیزی ابو طلحہ اصلاحی نے اپنی تالیف ''الفاظ قرآنی کی تفہیم'' میں قرآن کے اہم الفاظ کے مولانا کے بیان کردہ مفاہیم ومعانی کو مرتب شکل میں جمع کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بڑی خدمت ہے جو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پا سکی ہے۔ اس کتاب میں الفاظ کو ترتیب دیتے ہوئے عربی لغت کا طرز اختیار کیا گیا ہے۔ البتہ الفاظ کی ردیف وار فہرست بھی کتاب کے شروع میں دیدی گئی ہے تاکہ اردو داں طبقہ کو بھی کسی لفظ کی تلاش میں دشواری پیش نہ آئے۔

اللہ تعالیٰ اس اہم خدمت کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں یہی ہماری دعا ہے۔

خاکسار

محمد فاروق خاں

۶ جون ۲۰۰۳ء

عرضِ مرتّب

فہم قرآن کے خارجی وسائل میں قرآن کی زبان اور اسلوب بیان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ زبان وبیان پر قدرت حاصل کیے بغیر قرآن کی گہرائیوں تک رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

ابتدائے عہدِ اسلام ہی سے الفاظ کے معانی کی تعیین اور اسلوب کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے اگر ایک طرف کلام عرب کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے تو دوسری طرف خود قرآنی استعمالات کو بھی اصل اور مرجع کی حیثیت دی گئی، چنانچہ عہد صحابہ میں ایسے لوگ موجود تھے جنہیں لغت عرب کا ماہر خیال کیا جاتا تھا خود ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے لغت کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا تھا جس میں کلام عرب کو بنیاد بنا کر الفاظ کے معانی متعین کیے گئے تھے۔

بعد کے ادوار میں قرآنی الفاظ کی تشریح اور ان کے معانی کی تعیین کے لیے متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ ابو عبیدہ (وفات ۲۱۰ھ) کی 'مجاز القرآن'، فراء (وفات ۲۰۷ھ) کی 'معانی القرآن' الاخفش (وفات ۲۱۰ھ) کی 'غریب القرآن' اور ابن قتیبہ (وفات ۲۷۶ھ) کی 'تفسیر غریب القرآن' اس موضوع پر اہم کتابیں ہیں۔ البتہ امام راغب اصفہانی (وفات ۵۰۲ھ) کی 'مفردات غریب القرآن' کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان میں سے کسی کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ برہان الدین زرکشی نے امام راغب کی مفردات کو سب سے عمدہ کتاب قرار دیا ہے۔

مفردات قرآن کے سلسلے میں دورِ حاضر کے عظیم مفسر امام حمید الدین فراہی (۱۸۶۳-۱۹۳۰) کا

نقطہ نظر یہ ہے کہ لفظ کے صحیح معنی کی تعیین کلام کو سمجھنے کے لئے پہلا قدم ہے اور لفظ کے معنی سے عدم واقفیت پورے کلام کو سمجھنے کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے اور آیتوں کا نظام درہم برہم ہو کے رہ جاتا ہے۔

مولانا فراہی نے الفاظ قرآن کو سمجھنے کے لئے قدیم کلام عرب اور خود آیتوں کے سیاق وسباق کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''باقی رہے دوسرے الفاظ اور حقیقت ومجاز کے مختلف اسالیب تو اس باب میں ماخذ قدیم کلام عرب اور خود قرآن مجید ہے۔ لغت کی کتابیں ان چیزوں کی تحقیق میں کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کرتیں۔ ان سے بالعموم نہ تو الفاظ کی پوری حقیقت معلوم ہوتی، نہ عربی خالص اور عربی مولد کے درمیان کوئی امتیاز ہوتا ہے اور نہ لفظ کی جرہ کا پتہ لگتا ہے کہ معلوم ہو سکے کہ کیا اصل ہے کیا فرع اور کیا حقیقت ہے کیا مجاز۔ تو جو لوگ کلام عرب میں مہارت نہیں بہم پہنچاتے بلکہ صرف لغت کی کتابوں پر قانع ہو جاتے ہیں وہ بسا اوقات قرآن مجید کے معانی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔'' (تفسیر نظام القرآن: ۴۰)

مولانا فراہی نے عربی زبان میں 'مفردات القرآن' کے نام سے کتاب کی تالیف شروع کی جسے وہ مکمل نہ کر سکے۔ مولانا کی یہ کتاب ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی کے تحقیق واضافہ کے ساتھ حال ہی میں بیروت سے شائع ہوئی ہے اور دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر نے اسی ایڈیشن کو ہندوستان سے بھی شائع کر دیا ہے۔

مولانا فراہی کے دو خاص شاگردوں مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے علاوہ جو علماء مولانا فراہی کے افکار سے متاثر ہوئے اور جن کی تحریروں میں ان کے افکار کی جھلک نمایاں ہوتی ہے، ان میں نمایاں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا ابوالاعلی مودودی ہیں۔ اول الذکر تین علماء نے مولانا فراہی کی مجالس قرآنی سے باقاعدہ استفادہ کیا ہے۔ البتہ مولانا مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹) بعض مجلسوں میں شریک ضرور رہے ہیں لیکن

ان کا اصل استفادہ مولانا کی کتابوں کے حوالے سے ہے۔ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں جا بجا مولانا فراہی کے منہج تفسیر سے استفادہ کیا ہے اور بعض مقامات پر ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔

ہم نے قرآنی الفاظ کی اسی اہمیت کے پیش نظر تفہیم القرآن میں بیان کئے ہوئے قرآنی مفردات کو ایک ترتیب سے جمع کر دیا ہے تا کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والے اس سے استفادہ کر سکیں۔

اس کتاب کی ترتیب میں چند امور کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۱۔ اصل کتاب ''تفہیم القرآن'' پر مشتمل ہیں۔ البتہ چند الفاظ ''رسائل و مسائل'' حصہ پنجم اور ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' سے ماخوذ ہیں۔ ان کے حوالے الفاظ کی تشریح کے آخر میں دے دیے گئے ہیں۔

۲۔ ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' سے الہ، رب، عبادۃ اور دین ماخوذ ہیں اور ان کی تفصیلات بقدر ضرورت نقل کر دی گئی ہیں۔

۳۔ شروع میں لفظ اور اس کے فوراً بعد بریکٹ میں سورہ نمبر اور آیت نمبر دیا گیا ہے۔ تا کہ تفصیل کی ضرورت ہو تو اصل کی جانب رجوع کیا جا سکے۔

۴۔ کتاب کی ترتیب مادہ کے اعتبار سے رکھی گئی ہے یہی عربی لغات کا معروف طریقہ ہے۔ البتہ ایک الف بائی یا ابجدی فہرست بھی کتاب کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے تا کہ غیر عربی داں قارئین کو کتاب سے استفادہ میں دشواری نہ محسوس ہو۔

اللہ تعالیٰ اس متواضع کوشش کو قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے مفید بنائے۔

طلحہ ایوب اصلاحی
۱۰۔ اعظمی اپارٹمنٹ، ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی
جنوری ۲۰۰۵ء

(ء)

اَبَقَ: (۱۴۰/۳۷)اصل میں لفظ ابق استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں صرف اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ غلام اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ جائے، الاباق هرب العبد من سیده ۔"اباق کے معنی ہیں غلام کا اپنے آقا سے فرار ہو جانا" (لسان العرب)

اَبَابِیل: (۳/۱۰۵)اصل میں طیرا ابابیل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ۔اردو زبان میں چونکہ ابابیل ایک خاص قسم کے پرندے کو کہتے ہیں اس لیے ہمارے ہاں لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ابرہہ کی فوج پر ابابیلیں بھیجی گئی تھیں لیکن عربی زبان میں ابابیل کے معنی ہیں بہت سے لشکر جو پے درپے مختلف سمتوں سے آئیں، خواہ وہ آدمیوں کے ہوں یا جانوروں کے۔ عکرمہ اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہ جھنڈ کے جھنڈ پرندے بحر احمر کی طرف سے آئے تھے، سعید بن جبیر اور عکرمہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے پرندے نہ پہلے کبھی دیکھے گئے تھے نہ بعد میں دیکھے گئے۔ یہ نہ نجد کے پرندے تھے، نہ حجاز کے اور نہ تہامہ یعنی حجاز اور بحر احمر کے درمیانی ساحلی علاقے کے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ ان کی چونچیں پرندوں جیسی تھیں اور پنجے کتے جیسے، عکرمہ کا بیان ہے کہ ان کے سر شکاری پرندوں کے سروں جیسے تھے اور تقریباً سب راویوں کا متفقہ بیان ہے کہ ہر پرندے کی چونچ میں ایک ایک کنکر تھا اور پنجوں میں دو دو کنکر۔ مکہ کے بعض لوگوں کے پاس یہ کنکر ایک مدت تک محفوظ رہے، چنانچہ ابو نعیم نے نوفل بن ابی معاویہ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے وہ کنکر دیکھے ہیں جو اصحاب فیل پر پھینکے گئے تھے۔ وہ مٹر کے چھوٹے دانے کے برابر سیاہی مائل سرخ تھے، ابن عباس کی روایت ابو نعیم نے یہ نقل کی ہے کہ وہ چلغوزے کے برابر تھے اور ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ بکری کی مینگنی کے برابر۔ ظاہر ہے کہ سارے سنگریزے ایک ہی جیسے نہ ہوں گے۔ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہو گا۔

آباءِ بُعُولَتِهِنَّ: (۳۱/۲۴)اصل میں لفظ آباء استعمال ہوا ہے جس کے مفہوم میں صرف باپ ہی نہیں بلکہ دادا پر دادا اور نانا پر نانا بھی شامل ہیں۔ لہذا ایک عورت اپنی ددھیال اور ننھیال اور اپنے شوہر کی ددھیال اور ننھیال کے ان سب بزرگوں کے سامنے اسی طرح آسکتی ہے جس طرح اپنے والد اور خسر کے سامنے آسکتی ہے۔

یُؤتُوْن: (۶۰/۲۳)عربی زبان میں "دینے" (ایتاء) کا لفظ صرف مال یا کوئی مادی چیز دینے ہی کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ معنوی چیزیں دینے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کی اطاعت قبول کر لینے کے لیے کہتے ہیں کہ آتیته من نفسی القبول کسی شخص کی اطاعت

سے انکار کر دینے کے لیے کہتے ہیں آتیتہ من نفسی الاباتہ۔ پس اس دینے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ وہ راہ خدا میں مال دیتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب اللہ کے حضور طاعت و بندگی پیش کرنے پر بھی حاوی ہے۔

اَثَارُوا : (۹/۳۰) اصل میں لفظ اثاروا الارض استعمال ہوا ہے۔ اس کا اطلاق زراعت کے لئے ہل چلانے پر بھی ہو سکتا ہے اور زمین کھود کر زیر زمین پانی، نہریں، کاریزیں اور معدنیات وغیرہ نکالنے پر بھی۔

الاٰثِمَ : (۷/۳۳) جس کے معنی کوتاہی کے ہیں۔ آثمۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیز چل سکتی ہو مگر جان بوجھ کر سست چلے، اسی سے اس لفظ میں گناہ کا مفہوم پیدا ہوا ہے، یعنی انسان کا اپنے رب کی اطاعت و فرماں برداری میں قدرت و استطاعت کے باوجود، کوتاہی کرنا اور اس کی رضا کو پہنچنے میں جان بوجھ کر قصور دکھانا۔

اَحَدٌ : (۱/۱۱۲) یہاں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ احد جس طرح استعمال کیا گیا ہے وہ عربی زبان میں اس لفظ کا غیر معمولی استعمال ہے۔ معمولاً یہ لفظ یا تو مضاف یا مضاف الیہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جیسے یوم الاحد، ہفتے کا پہلا دن اور فابعثوا احدکم، ''اپنے کسی آدمی کو بھیجو''۔ یا نفی عام کیلئے استعمال ہوتا ہے، جیسے ما جائنی احد ''میرے پاس کوئی نہیں آیا''۔ یا عمومیت کا پہلو لیے ہوئے سوالیہ فقرے میں بولا جاتا ہے، جیسے هل عندك احد؟ ''کیا تمہارے پاس کوئی ہے؟ یا اس عمومیت کے پہلو سے شرطیہ جملہ بولا جاتا ہے جیسے ان جاءك احد، ''اگر تمہارے پاس کوئی آئے'' یا گنتی کے لئے بولا جاتا ہے جیسے احد اثنان، احد عشر، ایک دو گیارہ، ان استعمالات کے سوا نزول قرآن سے پہلے کی عربی زبان میں اس امر کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ محض لفظ احد وصف کے طور پر کسی شخص یا چیز کے لئے بولا گیا ہو اور نزول قرآن کے بعد یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے استعمال کیا گیا ہے، دوسرے کسی کے لئے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس غیر معمولی طرز بیان سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یکتا و یگانہ ہونا اللہ کی خاص صفت ہے، موجودات میں سے کوئی دوسرا اس صفت سے متصف نہیں ہے۔ وہ ایک ہے، کوئی اس کا ثانی نہیں۔

پھر جو سوالات مشرکین اور اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ سے آپؐ کے رب کے بارے میں کئے تھے ان کو نگاہ میں رکھتے ہوئے دیکھئے کہ ھو اللہ کہنے کے بعد احد کہہ کر ان کا جواب کس طرح دیا گیا ہے:

اولاً اس کے معنی یہ ہیں کہ وہی اکیلا رب ہے، کسی دوسرے کا ربوبیت میں کوئی حصہ نہیں ر[illegible]نکہ الہ (معبود) وہی ہو سکتا ہے جو رب (مالک و پروردگار) ہو، اس لئے الوہیت میں بھی کو[illegible]ں کا شریک نہیں۔

ثانیاً، اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہی تنہا کائنات کا خالق ہے، تخلیق کے اس کام میں کوئی اور اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اکیلا مالک الملک ہے، نظام عالم کا مدبر و منتظم ہے، اپنی مخلوقات کا رزق رساں ہے اور آڑے وقت میں مدد کرنے والا فریادرس ہے۔ خدائی کے ان کاموں میں جن کو تم خود مانتے ہو کہ یہ اللہ کے کام ہیں، کسی دوسرے کا قطعاً کوئی حصہ نہیں ہے۔

ثالثاً چونکہ انہوں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ کس چیز سے بنا ہے؟ اس کا نسب کیا ہے؟ وہ کس جنس سے ہے؟ کس سے اس نے دنیا کی میراث پائی ہے؟ اور اس کے بعد کون اس کا وارث ہو گا؟ اس لئے ان کے ان سارے سوالات کا جواب بھی اللہ تعالیٰ کے لئے صرف ایک لفظ احد بول کر دے دیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ (۱) وہی ایک خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ اس سے پہلے کوئی خدا تھا نہ اس کے بعد کوئی خدا ہو گا۔ (۲) خداؤں کی کوئی جنس نہیں ہے جس کا وہ فرد ہو بلکہ وہ اکیلا خدا ہے اور کوئی اس کا ہم جنس نہیں۔ (۳) اس کی ذات محض واحد نہیں بلکہ احد ہے جس میں کسی حیثیت سے بھی کثرت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وہ اجزاء سے مرکب وجود نہیں ہے جو قابل تجزیہ و تقسیم ہو، جو کوئی شکل اور صورت رکھتا ہو جو کسی جگہ میں رہتا ہو یا کوئی چیز اس کے اندر جگہ پاتی ہو، جس کا کوئی رنگ ہو، جس کے کچھ اعضا ہوں، جن کی کوئی سمت اور جہت ہو اور جس کے اندر کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوتا ہو۔ تمام اقسام کی کثرتوں سے بالکل پاک اور منزہ وہ ایک ہی ذات ہے جو ہر لحاظ سے احد ہے (اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ عربی زبان میں ''واحد'' کا لفظ بالکل اسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح ہم اردو میں ''ایک'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بڑی سے بڑی کثرتوں پر مشتمل کسی مجموعہ کو بھی اس کی مجموعی حیثیت کے لحاظ سے واحد یا ایک کہا جاتا ہے، جیسے ایک آدمی ایک قوم ایک ملک ایک دنیا حتی کہ ایک کائنات اور کسی مجموعہ کے ہر جز کو الگ الگ بھی ایک ہی کہا جاتا ہے لیکن احد کا لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس لئے قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لئے واحد کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں الٰہ واحد ایک ہی معبود، یا اللہ الواحد القہار اکیلا اللہ جو سب کو مغلوب کر کے رکھنے والا ہے کہا گیا ہے، محض واحد کہیں نہیں کہا گیا، کیونکہ یہ لفظ ان چیزوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو اپنی ذات میں طرح طرح کی کثرتیں رکھتی ہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کے لئے اور صرف اللہ ہی کے لئے احد کا لفظ مطلقاً استعمال کیا گیا ہے کیونکہ وجود میں صرف وہی ایک ہستی ایسی ہے جس میں کسی حیثیت سے بھی کوئی کثرت نہیں ہے جس کی وحدانیت ہر لحاظ سے کامل ہے)۔

الآخِرَة: (۲/۴) ''آخرت'' ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق بہت سے عقائد کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ اس میں حسب ذیل عقائد شامل ہیں:

(۱) یہ کہ انسان اس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اپنے تمام اعمال کے لیے خدا کے سامنے

جواب دہ ہے۔ (۲) یہ کہ دنیا کا موجودہ نظام ابدی نہیں ہے بلکہ ایک وقت پر، جسے صرف خدا ہی جانتا ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا (۳) یہ کہ اس عالم کے خاتمے کے بعد خدا ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں پوری نوع انسانی کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت دوبارہ پیدا کرے گا، اور سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ (۴) یہ کہ خدا کے اس فیصلے کی رو سے جو لوگ نیک قرار پائیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو لوگ بد ٹھیریں گے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ (۵) یہ کہ کامیابی و ناکامی کا اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوشحالی و بدحالی نہیں ہے بلکہ در حقیقت کامیاب انسان وہ ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ٹھیرے اور ناکام وہ ہے جو وہاں ناکام ہو۔

اُذِنَتْ لِرَبِّهَا: (۸۴/۲) اصل میں اذنت لربھا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کے لفظی معنی ہیں "وہ اپنے رب کے حکم سنے گا"۔ لیکن عربی زبان میں محاورے کے طور پر اذن لہ کے معنی صرف یہی نہیں ہوتے کہ اس نے حکم سنا بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے حکم سن کر ایک تابع فرمان کی طرح اس کی تعمیل کی اور ذرا سرتابی نہ کی۔

تَاَذَّنَ: (۷/۱۶۷) اصل میں لفظ تاذن استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو نوٹس دینے یا خبردار کر دینے کا ہے۔

الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ: (۵/۲۱) اس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، اور حضرت یعقوبؑ کا مسکن رہ چکی تھی، بنی اسرائیل جب مصر سے نکل آئے تو اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نامزد فرمایا اور حکم دیا کہ جا کر اسے فتح کر لو۔

الْاَرَائِک: (۱۸/۳۱) ارائک اریکہ کی جمع ہے۔ اریکہ عربی زبان میں ایسے تخت کو کہتے ہیں جس پر چتر لگا ہوا ہو۔ اس سے بھی یہی تصور دلانا مقصود ہے کہ وہاں ہر جنتی تخت شاہی پر متمکن ہو گا۔

اِسْرآئِیل: (۲/۴۰) اسرائیل کے معنی ہیں عبداللہ یا بندۂ خدا، یہ حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا، جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا، وہ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے انہی کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔

اِسرآئِیل: (۳/۹۳) "اسرائیل" سے مراد اگر بنی اسرائیل لئے جائیں تو مطلب یہ ہو گا کہ نزول توراۃ سے قبل بعض چیزیں بنی اسرائیل نے محض رسماً حرام قرار دے لی تھیں اور اگر اس سے مراد حضرت یعقوبؑ لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آنجناب نے بعض چیزوں سے طبعی کراہت کی بنا پر یا کسی مرض کی بنا پر احتراز فرمایا تھا اور ان کی اولاد نے بعد میں انہیں ممنوع سمجھ لیا۔ یہی موخر الذکر روایت زیادہ مشہور ہے۔

اٰسِنٍ: (۴۷/۱۵) اصل الفاظ ہیں ماءٍ غیر اٰسنٍ۔ آسن اس پانی کو کہتے ہیں جس کا مزا اور

رنگ بدلا ہوا ہو یا جس میں کسی طرح کی بو پیدا ہو گئی ہو۔ دنیا میں دریاؤں اور نہروں کے پانی عموماً گدلے ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ریت مٹی اور بسا اوقات طرح طرح کے نباتات کے مل جانے سے انکا رنگ اور مزا بدل جاتا ہے۔ اور کچھ نہ کچھ بو بھی ان میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے جنت کے دریاؤں اور نہروں کے پانی کی یہ تعریف بیان کی گئی کہ وہ غیر آسن ہو گا۔ یعنی وہ خالص، صاف ستھرا پانی ہو گا کسی قسم کی آمیزش اس میں نہ ہو گی۔

اَشِرُ: (۲۶/۵۴) اصل میں لفظ اشر استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں ایسا خود پسند اور بر خود غلط شخص جس کے دماغ میں اپنی بڑائی کا سودا سما گیا ہو اور اس بنا پر وہ ڈینگیں مارتا ہو۔

اَلاِفْک: (۱۱/۲۴) افک کے معنی ہیں بات کو الٹ دینا۔ حقیقت کے خلاف کچھ سے کچھ بنا دینا۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ قطعی جھوٹ اور افترا کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور اگر کسی الزام کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی سراسر بہتان کے ہیں۔

اَلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُھُمْ: (۶۰/۹) تالیف قلب کے معنی ہیں دل موہنا، اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سر گرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوش عداوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو یا جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر مال سے انہیں توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہوں، یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی استمالت نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا مطیع و فرماں بردار، یا کم از کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے۔ اس مد پر غنائم اور دوسرے ذرائع آمدنی سے بھی مال خرچ کیا جا سکتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو زکوٰۃ کی مد سے بھی۔ اور ایسے لوگوں کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں تب ہی ان کی مدد زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے بلکہ وہ مالدار اور رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دیے جانے کے مستحق ہیں۔

اِیْلَاف: (۱/۱۰۶) اصل الفاظ ہیں **لایلاف قریش**، ایلاف الف سے ہے جس کے معنی خوگر ہونے، مانوس ہونے، پھٹنے کے بعد مل جانے اور کسی چیز کی عادت اختیار کرنے کے ہیں۔ اردو زبان میں الفت اور مالوف کے الفاظ بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔ ایلاف سے پہلے جو لام آیا ہے اس کے متعلق عربی زبان کے بعض ماہرین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ عربی محاورے کے مطابق تعجب کے معنی میں ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں کہ **لزید و ماصنعنا به**، یعنی ذرا اس زید کو دیکھو کہ ہم نے اس کے ساتھ کیسا نیک سلوک کیا اور اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ پس **لایلاف قریش** کا مطلب یہ ہے کہ قریش کا رویہ بڑا ہی قابل تعجب ہے کہ اللہ ہی کے فضل کی بدولت وہ منتشر ہونے کے بعد جمع ہوئے اور ان تجارتی سفروں کے خوگر ہو گئے جو ان کی خوشحالی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں اور وہ اللہ ہی کی بندگی سے روگردانی کر رہے ہیں۔ یہ رائے اخفش، کسائی اور فراء کی

ہے اور اس رائے کو ابن جریر نے ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب جب اس لام کے بعد کسی بات کا ذکر کرتے ہیں تو وہی بات یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے جو شخص کوئی رویہ اختیار کر رہا ہے وہ قابل تعجب ہے۔ بخلاف اس کے خلیل بن احمد سیبویہ اور زمخشری کہتے ہیں کہ یہ لام تعلیل ہے اور اس کا تعلق آگے کے فقرے فلیعبدوا رب هذا البیت سے ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ یوں تو قریش پر اللہ کی نعمتوں کا کوئی شمار نہیں لیکن اگر کسی اور نعمت کی بنا پر نہیں تو اسی ایک نعمت کی بنا پر وہ اللہ کی بندگی کریں کہ اس کے فضل سے وہ ان تجارتی سفروں کے خوگر ہوئے کیونکہ یہ بجائے خود ان پر اس کا بہت بڑا احسان ہے۔

اللہ: اس لفظ کا مادہ ال ہ ہے۔ اس مادہ سے جو الفاظ لغت میں آئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:۔ **اَلِهَ اِذَا تحیّر**، حیران وسرگشتہ ہوا۔

الهت الی فلان ای سکنت الیه۔ اس کی پناہ میں جا کر یا اس سے تعلق پیدا کر کے میں نے سکون واطمینان حاصل کیا۔

اله الرجل یأ له اذا فزع من امر نزل به۔ فاٰلهه غیره ای اجاره۔ آدمی کسی مصیبت یا تکلیف کے نزول سے خوف زدہ ہوا اور دوسرے نے اس کو پناہ دی۔

اله الرجل اتجه الیه لشدة شوقه الیه۔ آدمی نے دوسرے کی طرف شدتِ شوق کی وجہ سے توجہ کی۔ **اله الفصیل اذا ولع بامه**۔ اونٹنی کا بچہ جو اس سے بچھڑ گیا تھا، ماں کو پاتے ہی اس سے چمٹ گیا۔

لاہ یلیه لیها ولاهاً اذا احتجب۔ پوشیدہ و مستور ہوا۔ نیز ارتفع یعنی بلند ہوا۔ **اله الهة والوهة والوهیة عَبَدَ**۔ عبادت کی۔

ان تمام معانی مصدر یہ پر غور کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اَلَهَ یالہُ الٰهة کے معنی عبادت (پرستش) اور اِلٰہ کے معنی معبود کس مناسبت سے پیدا ہوئے:۔

(۱) انسان کے ذہن میں عبادت کے لیے اولین تحریک اپنی حاجتمندی سے پیدا ہوتی ہے وہ کسی کی عبادت کا خیال تک نہیں کر سکتا، جب تک اسے یہ گمان نہ ہو کہ وہ اس کی حاجتیں پوری کر سکتا ہے، خطرات و مصائب میں اسے پناہ دے سکتا ہے، اضطراب کی حالت میں اسے سکون بخش سکتا ہے۔

(۲) پھر یہ بات کہ آدمی کسی کو حاجت روا سمجھے، اس تصور کے ساتھ لازم وملزوم کا تعلق رکھتی ہے کہ وہ اسے اپنے سے بالاتر اور نہ صرف مرتبے کے اعتبار سے اس کی برتری تسلیم کرے، بلکہ طاقت اور زور کے اعتبار سے بھی اس کی بالا دستی کا قائل ہو۔

(۳) پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سلسلہ اسباب وعلل کے تحت جن چیزوں سے بالعموم انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور جن کی حاجت روائی کا سارا عمل انسان کی آنکھوں

کے سامنے یا اس کے حدودِ علم کے اندر واقع ہوتا ہے، ان کے متعلق پرستش کا کوئی جذبہ اس میں پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً مجھے خرچ کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے، میں جا کر ایک شخص سے نوکری یا مزدوری کی درخواست کرتا ہوں، وہ درخواست کو قبول کر کے مجھے کوئی کام دیتا ہے اور اس کام کا معاوضہ مجھے دے دیتا ہے، یہ سارا عمل چونکہ میرے حواس اور علم کے دائرے کے اندر پیش آیا ہے، اور میں جانتا ہوں کہ اس نے میری یہ حاجت کس طرح پوری کی ہے، اس لیے میرے ذہن میں اس کے لائق پرستش ہونے کا وہم تک نہیں گزرتا۔ پرستش کا تصور میرے ذہن میں صرف اسی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے، جب کہ کسی کی شخصیت یا اس کی طاقت یا اس کی حاجت روائی واثر اندازی کی کیفیت پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہو۔ اسی لیے معبود کے معنی میں وہ لفظ اختیار کیا گیا، جس کے اندر رفعت کے ساتھ پوشیدگی وحیرانی وسرگشتگی کا مفہوم بھی شامل ہے۔

(۴) پھر جس کے متعلق بھی انسان یہ گمان رکھتا ہو کہ وہ احتیاج کی حالت میں حاجت روائی کر سکتا ہے، خطرات میں پناہ دے سکتا ہے۔ اضطراب میں سکون بخش سکتا ہے، اس کی طرف انسان کا اشتیاق کے ساتھ توجہ کرنا ایک امر ناگزیر ہے۔

پس معلوم ہوا کہ معبود کے لیے الٰہ کا لفظ جن تصورات کی بنا پر بولا گیا وہ یہ ہیں:۔

حاجت روائی، پناہ دہندگی، سکون بخشی، بالاتری، بالادستی۔ ان اختیارات اور ان طاقتوں کا مالک ہونا جن کی وجہ سے یہ توقع کی جائے کہ معبود قاضی الحاجات اور پناہ دہندہ ہو سکتا ہے اس کی شخصیت کا پراسرار ہونا یا منظر عام پر نہ ہونا۔ انسان کا اس کی طرف مشتاق ہونا۔

قرآن مجید میں لفظ الٰہ کے استعمالات اور ان کے مفاہیم

اس لغوی تحقیق کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ الوہیت کے متعلق اہلِ عرب اور امِم قدیمہ کے وہ کیا تصورات تھے، جن کی تردید قرآن کرنا چاہتا ہے۔

(۱) ﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا﴾۔ (مریم۔۸۱)

"اور انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا رکھے ہیں، تا کہ وہ ان کے لیے ذریعۂ قوت ہوں (یا ان کی حمایت میں وہ آ کر محفوظ رہیں")

﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾. (یٰس. ۷۴)

"اور انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا لیے ہیں، اس امید پر کہ ان کی مدد کی جائے گی (یعنی وہ الٰہ ان کی مدد کریں گے۔")

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جاہلیت جن کو الٰہ کہتے تھے، ان کے متعلق وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کے پشتیبان ہیں۔ مشکلات اور مصائب میں ان کی حفاظت کرتے ہیں، اور

ان کی حمایت میں وہ خوف اور نقصان سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

(۲) ﴿فَمَآ اَغۡنَتۡ عَنۡهُمۡ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیۡ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمۡرُ رَبِّکَ وَمَازَادُوۡهُمۡ غَیۡرَ تَتۡبِیۡبٍ﴾. (ھود. ۱۰۱)

"پھر جب تیرے رب کے فیصلے کا وقت آ گیا تو ان کے وہ الٰہ جنھیں وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ بھی کام نہ آسکے، اور وہ ان کے لیے تباہی وہلاکت کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ کا سبب نہ بنے۔"

﴿وَالَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّهُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ ○ اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ وَّمَا یَشۡعُرُوۡنَ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ ○ اِلٰهُکُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾. (النحل. ۳. ۲ع ۲۰. ۲۱. ۲۲)

"اور اللہ کے بجائے جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں ہیں، بلکہ خود مخلوق ہیں، مردہ ہیں نہ کہ زندہ، اور انہیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ انھیں کب دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔"

﴿وَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾۔ (قصص۔۸۸)

"اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہ پکار، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں"۔

﴿وَمَا یَتَّبِعُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ شُرَکَآءَ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ﴾. (یونس. ٦٦)

"جو لوگ اللہ کے بجائے دوسرے شریکوں کو پکارتے ہیں، وہ محض وہم پر چلتے ہیں اور نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں"۔

ان آیات سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ اہل جاہلیت جن کو الٰہ کہتے تھے انھیں مشکل کشائی وحاجت روائی کے لیے پکارتے یا بالفاظ دیگر ان سے دعا مانگتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کے یہ الٰہ صرف جن یا فرشتے یا دیوتا ہی نہ تھے بلکہ وفات یافتہ انسان بھی تھے، جیسا کہ ﴿اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ وَّمَا یَشۡعُرُوۡنَ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ﴾ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان الٰہوں کے متعلق وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ان کی دعاؤں کو سنتے ہیں اور ان کی مدد کو پہنچنے پر قادر ہیں۔

یہاں دعا کے مفہوم اور اس امداد کی نوعیت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے، جس کی الٰہ سے توقع کی جاتی ہے۔ اگر مجھے پیاس لگتی ہے اور میں اپنے خادم کو پانی لانے کے لیے پکارتا ہوں، یا اگر میں بیمار ہوتا ہوں اور علاج کے لیے ڈاکٹر کو بلاتا ہوں تو اس پر نہ دعا کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ اس کے معنی خادم یا ڈاکٹر کو الٰہ بنانے کے۔ کیونکہ یہ سب کچھ سلسلۂ اسباب کے تحت ہے نہ کہ اس سے مافوق، لیکن اگر میں پیاس کی حالت میں یا بیماری میں خادم یا ڈاکٹر کو پکارنے کے بجائے کسی ولی یا کسی دیوتا کو پکارتا ہوں، تو ضرور اس کو الٰہ بنانا اور اس سے دعا مانگنا ہے، کیونکہ جو ولی صاحب مجھ سے سیکڑوں میل دور کسی قبر میں آرام فرما رہے ہیں، ان کو پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ

میں ان کو سمیع وبصیر سمجھتا ہوں اور یہ خیال رکھتا ہوں کہ عالم اسباب پر ان کی فرماں روائی قائم ہے، جس کی وجہ سے وہ مجھ تک پانی پہنچانے یا میری بیماری کو دور کردینے کا انتظام کرسکتے ہیں۔ علیٰ ہذالقیاس ایسی حالت میں کسی دیوتا کو پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ پانی یا صحت یا مرض پر اس کی حکومت ہے اور وہ فوق الطبعی طور پر میری حاجت پوری کرنے کے لیے اسباب کو حرکت دے سکتا ہے، پس الٰہ کا وہ تصور، جس کی بنا پر اس سے دعا مانگی جاتی ہے، لامحالہ ایک مافوق الطبعی اقتدار اور اس کے ساتھ ہی فوق الطبعی قوتوں کے مالک ہونے کا تصور ہے۔

(۳) ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾. (احقاف. ۲۷. ۲۸)

"تمہارے اردگرد جن بستیوں کے آثار ہیں، ان کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ انھیں ہم نے بار بار بدل کر اپنی نشانیاں دکھائی تھیں تاکہ وہ رجوع کریں۔ تو جن کو انہوں نے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اللہ کے سوا اپنا الٰہ بنا دیا تھا۔ انہوں نے نزول عذاب کے وقت کیوں نہ ان کی مدد کی؟ مدد تو درکنار وہ تو انھیں چھوڑ کر غائب ہوگئے۔ یہ تھی حقیقت ان کے جھوٹ اور ان کی من گھڑت باتوں کی۔"

﴿وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ﴾ (یٰسٓ. ۲۲. ۲۳)

"کیوں نہ میں اس کی عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے، اور جس کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے کیا اس کے سوا میں ان کو الٰہ بناؤں، جن کا حال یہ ہے کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے، تو ان کی سفارش میرے کچھ کام نہیں آسکتی ہے، اور وہ مجھے چھڑا نہیں سکتے"۔

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْمَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○﴾ (الزمر. ۳)

"اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے حامی یا کارساز ٹھیرا رکھے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے قریب کردیں۔ اللہ ان کے درمیان اس معاملہ کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں"۔

﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (یونس. ۱۸)

"وہ اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچانے پر قادر ہیں۔ نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

ان آیات سے چند مزید باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جاہلیت اپنے

الٰہوں کے متعلق یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ساری خدائی ان ہی کے درمیان تقسیم ہوگئی ہے، اور ان کے اوپر کوئی خداوند اعلیٰ نہیں ہے۔ وہ واضح طور پر ایک خداوند اعلیٰ کا تصور رکھتے تھے جس کے لیے ان کی زبان میں اللہ کا لفظ تھا، اور دوسرے الٰہوں کے متعلق ان کا اصل عقیدہ یہ تھا کہ اس خداوند اعلیٰ کی خدائی میں ان الٰہوں کا کچھ دخل اور اثر ہے۔ ان کی بات مانی جاتی ہے۔ ان کے ذریعے سے ہمارے کام بن سکتے ہیں، ان کی سفارش سے ہم نفع حاصل کر سکتے ہیں، اور نقصانات سے بچ سکتے ہیں۔ ان ہی خیالات کی بنا پر وہ اللہ کے ساتھ ان کو بھی الٰہ قرار دیتے تھے۔ لہٰذا ان کی اصطلاح کے مطابق کسی کو خدا کے ہاں سفارشی قرار دے کر اس سے مدد کی التجا کرنا، اور اس کے آگے مراسمِ تعظیم و تکریم بجالانا اور نذر و نیاز پیش کرنا، اس کو الٰہ بنانا ہے۔

(۴) ﴿وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ (النحل. ۵۱)

''اللہ فرماتا ہے کہ دو الٰہ نہ بناؤ، الٰہ تو ایک ہی ہے۔ لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرو۔''

﴿وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ رَبِّيْ شَيْـــًٔا﴾. (انعام. ۸۰)

''اور ابراہیم نے کہا کہ میں ان سے ہرگز نہیں ڈرتا، جنھیں تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو۔ الا یہ کہ میرا رب ہی کچھ چاہے، تو وہ البتہ ہو سکتا ہے''۔

﴿اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْۗءٍ﴾ (ھود. ۵۴)

''ہود کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا کہ ہم تو کہتے ہیں کہ تجھ پر ہمارے الٰہوں میں سے کسی کی مار پڑی ہے''۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اہل جاہلیت اپنے الٰہوں سے یہ خوف رکھتے تھے کہ اگر ہم نے ان کو کسی طرح ناراض کر دیا، یا ہم ان کی توجہات و عنایات سے محروم ہوگئے، تو ہم پر بیماری' قحط، نقصانِ جان و مال اور دوسری قسم کی آفات نازل ہو جائیں گی''۔

(۵) ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾. (التوبہ. ۳۱)

''انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا۔ اور مسیح ابن مریم کو بھی رب ٹھیرایا ، حالانکہ انھیں صرف ایک الٰہ کی عبادت کا حکم دیا گیا جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے''۔

﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا﴾ (الفرقان. ۴۳)

''تیرا کیا خیال ہے اس شخص کے متعلق جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا الٰہ بنایا ہے؟ کیا تو اس کی ذمہ داری لے سکتا ہے''۔

﴿وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاۗؤُهُمْ﴾. (انعام. ۱۳۷)

''اس طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں (یعنی شرکاء فی

الالوہیت) نے اپنی اولاد کو قتل کرنے کا فعل خوشنما بنادیا"۔

﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ﴾ (الشوریٰ ۔ ۲۱)

"کیاوہ ایسے شرکاء (یعنی شرکاءفی الالوہیت) رکھتے ہیں، جنھوں نے ان کے لیے از قسم دین ایسی شریعت مقرر کی ہے، جس کی اجازت اللہ نہیں دی"۔

ان آیات میں الٰہ کا ایک اور مفہوم ملتا ہے، جو پہلے مفہومات سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں فوق الطبعی اقتدار کا کوئی تصور نہیں۔ جس کو الٰہ بنایا گیا ہے، وہ یا تو کوئی انسان ہے یا انسان کا اپنا نفس ہے۔ اور الٰہ اس کو اس معنیٰ میں نہیں بنایا گیا ہے، کہ اس سے دعا مانگی جاتی ہو یا اس کو نفع ونقصان کا مالک سمجھا جاتا ہو اور اس کی پناہ ڈھونڈی جاتی ہو، بلکہ وہ الٰہ اس معنی میں بنایا گیا ہے کہ اس کے حکم کو قانون تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے امر و نہی کی اطاعت کی گئی۔ اس کے حلال اور اس کے حرام کو حرام مان لیا گیا اور یہ خیال کر لیا گیا کہ اس کو بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا اختیار حاصل ہے، کوئی اور اقتدار اس سے بالاتر نہیں ہے، جس کی سند لینے اور جس سے رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔

پہلی آیت میں علماء اور راہبوں کو الٰہ بنانے کا ذکر ہے۔ اس کی واضح تشریح ہم کو حدیث میں ملتی ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ جس چیز کو تمہارے علماء اور راہبوں نے حلال کیا، اسے تم لوگ حلال مان لیتے تھے اور جسے انہوں نے حرام قرار دیا، اسے تم حرام تسلیم کر لیتے تھے، اور اس بات کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے کہ اللہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے۔

رہی دوسری آیت، تو اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جو شخص اپنی خواہشِ نفس کی اطاعت کرتا ہو اور اسی کے حکم کو بالاتر رکھتا ہو، وہ دراصل اپنے نفس ہی کو اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہے۔

اس کے بعد والی دونوں آیتوں میں، اگرچہ الٰہ کے بجائے شریک کا لفظ آیا ہے، مگر جیسا کہ ہم نے ترجمہ میں واضح کیا ہے، شریک سے مراد الٰہیت میں شریک کا ٹھیرانا ہے۔ اور یہ دونوں آیتیں صاف فیصلہ کرتی ہیں کہ جو لوگ اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے مقرر کیے ہوئے رواج یا ضابطے یا طریقے کو جائز قانون سمجھتے ہیں، وہ اس قانون ساز کو الٰہیت میں شریک ٹھیراتے ہیں۔

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

اِلٰهُکُم: (۴ر۳ر۷) "الٰہ" کے لفظ کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے ایک وہ معبود جس کی بالفعل بندگی و عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرے وہ معبود جو فی الحقیقت اس کا مستحق ہو کہ اس کی بندگی و عبادت کی جائے۔ یہاں الٰہ کا لفظ دوسرے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے معنی میں تو انسانوں نے دوسرے بہت سے الٰہ بنا رکھے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے "الٰہ" کا ترجمہ "معبود حقیقی" کیا ہے۔

آلاء: (۵۵/ ۱۳) اصل میں لفظ آلاء استعمال ہوا ہے جسے آگے کی آیتوں میں بار بار دہرایا گیا ہے اور ہم نے مختلف مقامات پر اس کا مفہوم مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے، اس لیے آغاز ہی میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس لفظ میں معنی کی کتنی وسعت ہے اور اس میں کیا کیا مفہومات شامل ہیں۔

آلاء کے معنی اہل لغت اور اہل تفسیر نے بالعموم ''نعمتوں'' کے بیان کیے ہیں۔ تمام مترجمین نے بھی یہی اس لفظ کا ترجمہ کیا ہے اور یہی معنی ابن عباس، قتادہ اور حسن بصری سے منقول ہیں۔ سب سے بڑی دلیل اس معنی کے صحیح ہونے کی یہ ہے کہ خود نبی ﷺ نے جنوں کے اس قول کو نقل فرمایا ہے کہ وہ اس آیت کو سن کر بار بار لا بشیء من نعمك ربنا نكذب کہتے تھے، لہذا زمانہ حال کے بعض محققین کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ آلاء نعمتوں کے معنی میں سرے سے استعمال ہی نہیں ہوتا۔

دوسرے معنی اس لفظ کے قدرت اور عجائب قدرت یا کمالات قدرت ہیں۔ ابن جریر طبری نے ابن زید کا قول نقل کیا ہے کہ ﴿فَبِأَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا...﴾ کے معنی ہیں فبای قدرة الله، ابن جریر نے خود بھی آیات ۳۷-۳۸ کی تفسیر میں آلاء کو قدرت کے معنی میں لیا ہے۔ امام رازی نے بھی آیات ۱۴-۱۵-۱۶ کی تفسیر میں لکھا ہے۔ ''یہ آیات بیان نعمت کے لیے نہیں بلکہ بیان قدرت کے لیے ہے''۔ اور آیت ۲۲-۲۳ کی تفسیر میں وہ فرماتے ہیں ''یہ اللہ تعالیٰ کے عجائب قدرت کے بیان میں ہے نہ کہ نعمتوں کے بیان میں۔''

اس کے تیسرے معنی ہیں خوبیاں، اوصاف حمیدہ اور کمالات و فضائل۔ اس معنی کو اہل لغت اور اہل تفسیر نے بیان نہیں کیا ہے مگر اشعار عرب میں یہ لفظ کثرت سے اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ نابغہ کہتا ہے:

هم الملوك و ابناء الملوك لهم فضل على الناس فى الآلاء و النعم

(وہ بادشاہ اور شاہزادے ہیں ان کو لوگوں پر اپنی خوبیوں اور نعمتوں میں فضیلت حاصل ہے)

مہلہل اپنے بھائی کلیب کے مرثیہ میں کہتا ہے:

الحزم و العزم كانا من طبائعه ما كل آلائه يا قوم احصيها

(حزم اور عزم اس کے اوصاف میں سے تھے لوگوں میں اس کی ساری خوبیاں شمار نہیں کر رہا ہوں)

فضالہ بن زید العدوانی غریبی کی برائیاں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ غریب اچھا کام بھی کرے تو برا بنتا ہے اور: و تحمد آلاء البخيل المدرهم (مالدار بخیل کے کمالات کی تعریف کی جاتی ہے۔)

ورضيت آلاء الكميت فمن يبع فرسافليس جوادنا بمباع

(مجھے کمیت کے عمدہ اوصاف پسند ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی گھوڑے کو بیچتا ہے تو بیچے، ہمارا گھوڑا بکنے والا نہیں ہے۔)

حماسہ کا ایک شاعر جس کا نام ابو تمام نے لیا ہے، اپنے ممدوح ولید بن ادھم کے اقتدار کا مرثیہ کہتا ہے:

اذا ما امرؤ اثنی بآلاء میت — فلا یبعد الله الولید بن ادهما

(جب بھی کوئی شخص کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کرے تو خدا نہ کرے کہ ولید بن ادھم اس موقع پر فراموش ہو۔)

فما کان مفراحا اذا الخیر مسه — ولا کان منانا اذا هو انعما

(اس پر اچھے حالات آتے تو پھولتا نہ تھا اور کسی پر احسان کرتا تو جتاتا نہ تھا۔)

کامل یجمع آلاء الفتی نبه — سید سادات خضم

(وہ کامل اور جوانمردی کے اوصاف کا جامع ہے۔ شریف ہے، سرداروں کا سردار، دریادل۔)

ان شواہد و نظائر کو نگاہ میں رکھ کر ہم نے لفظ آلاء کو اس کے وسیع معنی میں لیا ہے اور ہر جگہ موقع و محل کے لحاظ سے اس کے جو معنی مناسب تر نظر آئے ہیں وہی ترجمے میں درج کر دیے ہیں لیکن بعض مقامات پر ایک ہی جگہ آلاء کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور ترجمے کی مجبوریوں سے ہم کو اس کے ایک ہی معنی اختیار کرنے پڑے ہیں کیونکہ اردو زبان میں کوئی لفظ اتنا جامع نہیں ہے کہ وہ ان سارے مفہومات کو بیک وقت ادا کر سکے۔ مثلاً اس آیت میں زمین کی تخلیق اور اس میں مخلوقات کی رزق رسانی کے بہترین انتظامات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے رب کے کن کن ''آلاء'' کو جھٹلاؤ گے۔ اس موقع پر آلاء صرف نعمتوں کے معنی ہی میں نہیں ہے بلکہ اللہ جل شانہٗ کی قدرت کے کمالات اور اس کی صفات حمیدہ کے معنی میں بھی ہے۔ یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ اس نے اس کرہ خاکی کو اس عجیب طریقے سے بنایا کہ اس میں بے شمار اقسام کی زندہ مخلوقات رہتی ہیں اور طرح طرح کے پھل اور غلے اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ اس کی صفات حمیدہ ہی ہیں کہ اس نے ان مخلوقات کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں ان کی پرورش اور رزق رسانی کا بھی انتظام کیا اور انتظام بھی اس شان کا کہ ان کی خوراک میں نری غذائیت ہی نہیں ہے بلکہ لذت کام و دہن اور ذوق نظر کی بھی ان گنت رعایتیں ہیں۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی کاریگری کے صرف ایک کمال کی طرف بطور نمونہ اشارہ کیا گیا ہے کہ کھجور کے درختوں میں پھل کس طرح غلافوں میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے۔ اس ایک مثال کو نگاہ میں رکھ کر ذرا دیکھئے کہ کیلے، انار، سنترے، ناریل اور دوسرے پھلوں کے پیکنگ میں آرٹ کے کیسے کمالات دکھائے گئے ہیں اور یہ طرح طرح کے غلے اور دالیں اور حبوب جو ہم بے فکری کے ساتھ پکا پکا کر کھاتے ہیں ان میں سے ہر ایک کیسی کیسی بالوں اور خوشوں کی شکل میں پیک کر کے اور نازک چھلکوں میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے۔

يُؤْلُون: (۲/۲۲۶) اصطلاح شریعت میں اس کو ایلاء کہتے ہیں میاں اور بیوی کے درمیان

تعلقات ہمیشہ تو خوش گوار نہیں رہ سکتے، بگاڑ کے اسباب پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ایسے بگاڑ کو خدا کی شریعت پسند نہیں کرتی کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ قانونی طور پر رشتہ ازدواج میں تو بندھے رہیں مگر عملاً ایک دوسرے سے اس طرح الگ رہیں کہ گویا وہ میاں اور بیوی نہیں ہیں، ایسے بگاڑ کے لیے اللہ تعالٰی نے چار مہینے کی مدت مقرر کردی کہ یا تو اس دوران میں اپنے تعلقات درست کرلو ورنہ ازدواج کا رشتہ منقطع کردو۔

اَمۡرٍ حَکِیۡم: (۴/۴۴)اصل میں لفظ "امر حکیم" استعمال ہوا ہے۔ جس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ وہ حکم سراسر حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ کسی غلطی کا خامی کا اس میں کوئی امکان نہیں دوسرے یہ کہ وہ ایک پختہ اور محکم فیصلہ ہوتا ہے، اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں۔

اُمُّ الۡکِتَاب: (۱۳/۳۹)ام الکتاب کے معنی ہیں "اصل کتاب" یعنی وہ منبع و سرچشمہ جس سے تمام کتب آسمانی نکلی ہیں۔

اُمَّةً وَّسَطًا: (۲/۱۴۳)"امت وسط" کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا، اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور توسط کی روش پر قائم ہو جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

اُمَّة: (۱۰/۴۷)"امت" کا لفظ یہاں محض قوم کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایک رسول کی آمد کے بعد اس کی دعوت جن جن لوگوں تک پہنچے وہ سب اس کی امت ہیں نیز اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ رسول ان کے درمیان زندہ موجود ہو بلکہ رسول کے بعد بھی جب تک اس کی تعلیم موجود رہے اور ہر شخص کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن ہو کہ وہ درحقیقت کس چیز کی تعلیم دیتا تھا اس وقت تک دنیا کے سب لوگ اس کی امت ہی قرار پائیں گے۔ اور ان پر وہ حکم ثابت ہوگا جو آگے بیان کیا جارہا ہے، اس لحاظ سے محمد ﷺ کی تشریف آوری کے بعد تمام دنیا کے انسان آپؐ کی امت ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک قرآن اپنی خالص صورت میں شائع ہوتا رہے گا، اسی وجہ سے آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ "ہر قوم میں ایک رسول ہے" بلکہ ارشاد یہ ہوا ہے کہ "ہر امت کے لئے ایک رسول ہے"۔

اُمُّ الۡکِتَاب: (۴۳/۴)ام الکتاب سے مراد ہے "اصل الکتاب" یعنی وہ کتاب جس سے تمام انبیاء علیہم السلام پر نازل ہونے والی کتابیں ماخوذ ہیں اسی کو سورہ واقعہ میں کتاب مکنون (پوشیدہ اور محفوظ کتاب) کہا گیا ہے اور سورہ بروج میں اس کے لیے لوح محفوظ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں یعنی ایسی لوح جس کا لکھا ہوا مٹ نہیں سکتا اور جو ہر قسم کی دراندازی سے محفوظ ہے۔ قرآن کے متعلق یہ فرما کر کہ یہ "ام الکتاب" میں ہے ایک اہم حقیقت پر متنبہ

فرمایا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف زمانوں میں مختلف ملکوں اور قوموں کی ہدایت کے لیے مختلف انبیاء پر مختلف زبانوں میں کتابیں نازل ہوتی رہیں، مگر ان سب میں دعوت ایک ہی عقیدے کی طرف دی گئی ہے، حق ایک ہی سچائی کو قرار دیا گیا ہے۔ خیر و شر کا ایک ہی معیار پیش کیا گیا ہے، اخلاق و تہذیب کے یکساں اصول بیان کیے گئے ہیں اور فی الجملہ ایک ہی دین ہے جسے یہ سب کتابیں لے کر آئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سب کی اصل ایک ہے اور صرف عبارتیں مختلف ہیں۔ ایک ہی معنی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک بنیادی کتاب میں ثبت ہیں اور جب کبھی ضرورت پیش آئی ہے، اس نے کسی نبی کو مبعوث کر کے وہ معنی حال اور موقع کی مناسبت سے ایک خاص عبارت اور خاص زبان میں نازل فرما دیے ہیں۔ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کا فیصلہ محمد ﷺ کو عرب کے بجائے کسی اور قوم میں پیدا کرنے کا ہوتا تو یہی قرآن وہ حضورؐ پر اسی قوم کی زبان میں نازل کرتا۔ اس میں بات اسی قوم اور ملک کے حالات کے لحاظ سے کی جاتی، عبارتیں کچھ اور ہوتیں، زبان دوسری ہوتی، لیکن بنیادی طور پر تعلیم و ہدایت یہی ہوتی اور وہ یہی قرآن ہوتا اگرچہ قرآن عربی نہ ہوتا۔ اسی مضمون کو سورہ شعراء میں یوں ادا کیا گیا ہے ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ...... بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (۱۹۲۔۱۹۶) ’’یہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے۔۔۔۔۔۔۔ صاف صاف عربی زبان میں، اور یہ اگلے لوگوں کی کتابوں میں موجود ہے۔

الاُمِّی : (۷/۱۵۷) یہاں نبی ﷺ کے لیے ’’امی‘‘ کا لفظ بہت معنی خیز استعمال ہوا ہے، بنی اسرائیل اپنے سوا دوسری قوموں کو امی (Gentiles) کہتے تھے اور ان کا قومی فخر و غرور کسی امی کی پیشوائی تسلیم کرنا تو در کنار، اس پر بھی تیار نہ تھا کہ امیوں کے لیے اپنے برابر انسانی حقوق ہی تسلیم کرلیں، چنانچہ قرآن ہی میں آتا ہے کہ وہ کہتے تھے ﴿لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ (آل عمران آیت ۷۵) ’’امیوں کے مال کھانے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔‘‘ پس اللہ تعالیٰ انہی کی اصطلاح استعمال کر کے فرماتا ہے کہ اب تو اسی امی کے ساتھ تمہاری قسمت وابستہ ہے، اس کی پیروی قبول کرو گے تو میری رحمت سے حصہ پاؤ گے ورنہ وہی غضب تمہارے لیے مقدر ہے جس میں صدیوں سے گرفتار چلے آ رہے ہو۔

الاُمِّيّٖنَ: (۶۲/۲) یہاں امی کا لفظ یہودی اصطلاح کے طور پر آیا ہے اور اس میں ایک لطیف طنز پوشیدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن کو یہودی حقارت کے ساتھ امی کہتے ہیں اور اپنے مقابلہ میں ذلیل سمجھتے ہیں انہی میں اللہ غالب و دانا نے ایک رسول اٹھایا۔ وہ خود نہیں اٹھ کھڑا ہوا ہے بلکہ اس کا اٹھانے والا وہ ہے جو کائنات کا بادشاہ ہے، زبردست اور حکیم ہے جس کی قوت سے لڑ کر یہ لوگ اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید میں ’’امی‘‘ کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور سب جگہ اس

کے معنی ایک ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف مواقع پر وہ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں وہ اہل کتاب کے مقابلہ میں ان لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جس کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے جس کی پیروی وہ کرتے ہوں۔ مثلاً فرمایا: ﴿قُلْ لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ وَالْاُمِّيّنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ﴾ (آل عمران: ۲۰) ''اہل کتاب اور امیوں سے پوچھو کیا تم نے اسلام قبول کیا؟'' یہاں امیوں سے مراد مشرکین عرب ہیں اور ان کو اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے الگ ایک گروہ قرار دیا گیا ہے۔ کسی جگہ یہ لفظ خود اہل کتاب کے ان پڑھ اور کتاب اللہ سے ناواقف لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے، جیسے فرمایا ﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّا اَمَانِيَّ﴾ (البقرة: ۷۸) ''ان یہودیوں میں کچھ لوگ امی ہیں، کتاب کا کوئی علم نہیں رکھتے، بس اپنی آرزوؤں ہی کو جانتے ہیں''۔ اور کسی جگہ یہ لفظ خالص یہودی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے جس سے مراد دنیا کے تمام غیر یہودی ہیں مثلاً فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّنَ سَبِيْلٌ﴾ (آل عمران۔ ۷۵) یعنی ''ان کے اندر یہ بد دیانتی پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں کا مال مار کھانے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے''۔ یہی تیسرے معنی ہیں جو آیت زیر بحث میں مراد لیے گئے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی زبان کے لفظ گوئیم کا ہم معنی ہے جس کا ترجمہ انگریزی بائیبل میں (Gentiles) کیا گیا ہے اور اس سے مراد تمام غیر یہودی یا غیر اسرائیلی لوگ ہیں۔

لیکن اس یہودی اصطلاح کی اصل معنویت محض اس تشریح سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دراصل عبرانی زبان کا لفظ گوئیم ابتداءً محض اقوام کے معنی میں بولا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہودیوں نے اسے پہلے تو اپنے سوا دوسری قوموں کیلئے مخصوص کردیا پھر اسکے اندر یہ معنی پیدا کردیے کہ یہودیوں کے سوا باقی تمام اقوام ناشائستہ، بدمذہب، ناپاک اور ذلیل ہیں۔ حتیٰ کہ حقارت اور نفرت میں یہ لفظ یونانیوں کی اصطلاح (Barbarian) سے بھی بازی لے گیا جسے وہ تمام غیر یونانیوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ربیوں کے لٹریچر میں گوئیم اس قدر قابل نفرت لوگ ہیں کہ ان کو انسانی بھائی نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان کے ساتھ سفر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اگر ان میں سے کوئی شخص ڈوب رہا ہو تو اس کو بچانے کی کوشش بھی نہیں کی جاسکتی یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ آنے والا مسیح تمام گوئیم کو ہلاک کردیگا اور جلا کر خاکستر کر ڈالے گا۔

المُؤمِن: (۵۹ / ۲۳) اصل میں لفظ المومن استعمال ہوا ہے جس کا مادہ امن ہے۔ امن کے معنی ہیں خوف سے محفوظ ہونا اور مومن وہ ہے جو دوسرے کو امن دے۔ اللہ تعالیٰ کو اس معنی میں مومن کہا گیا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو امن دینے والا ہے اس کی خلق اس خوف سے بالکل محفوظ ہے کہ وہ کبھی اس پر ظلم کرے گا یا اس کا حق مارے گا یا اس کا اجر ضائع کرے گا یا اس کے ساتھ اپنے کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کرے گا۔ پھر چونکہ اس فاعل کا کوئی مفعول بیان نہیں کیا گیا ہے کہ وہ کس کو امن دینے والا ہے بلکہ مطلقاً المومن کہا گیا ہے، اس لئے اس سے

یہ مفہوم آپ سے آپ نکلتا ہے کہ اس کا امن ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کے لئے ہے۔

اٰمَنَ: (۱۰/۸۳) متن میں فمآ آمن لموسیٰ کے الفاظ ہیں، اس سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید بنی اسرائیل سب کے سب کافر تھے اور ابتداءً ان میں سے صرف چند آدمی ایمان لائے لیکن ایمان کے ساتھ جب لام صلہ آتا ہے تو وہ بالعموم اطاعت و انقیاد کے معنی دیتا ہے، یعنی کسی کی بات ماننا اور اس کے کہے پر چلنا، پس دراصل ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ چند نوجوانوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کی پوری قوم میں سے کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ حضرت موسیٰ کو اپنا رہبر و پیشوا مان کر ان کی پیروی اختیار کر لیتا اور اس دعوت اسلامی کے کام میں ان کا ساتھ دیتا، پھر بعد کے فقرے نے اس بات کو واضح کر دیا کہ ان کے اس طرز عمل کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں حضرت موسیٰ کے صادق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اور خصوصاً ان کے اکابر و اشراف، حضرت موسیٰ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیری کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھے، اگرچہ یہ لوگ نسل اور مذہب دونوں حیثیتوں سے ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور یوسف علیہم السلام کے امتی تھے اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے لیکن ایک مدت دراز کے اخلاقی انحطاط نے اور اس پست ہمتی نے جو زیردستی سے پیدا ہوئی تھی، ان میں اتنا بل بوتا باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر و ضلالت کی فرمانروائی کے مقابلہ میں ایمان و ہدایت کا علم لے کر خود اٹھتے، یا جو اٹھا تھا اس کا ساتھ دیتے۔

تَاوِیْلِ الاَحَادِیْث: (۱۲/۶) "تاویل الاحادیث" کا مطلب محض تعبیر خواب کا علم نہیں ہے جیسا کہ گمان کیا گیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے معاملہ فہمی اور حقیقت رسی کی تعلیم دے گا اور وہ بصیرت تجھ کو عطا کرے گا جس سے تو ہر معاملہ کی گہرائی میں اترنے اور اس کی تہہ کو پالینے کے قابل ہو جائے گا۔

اَمٰنٰتِکُم: (۸/۲۷) "اپنی امانتوں" سے مراد وہ تمام ذمہ داریاں ہیں جو کسی پر اعتبار (Trust) کر کے اس کے سپرد کی جائیں، خواہ وہ عہد و وفا کی ذمہ داریاں ہوں، یا اجتماعی معاہدات کی، یا جماعت کے رازوں کی، یا شخصی و جماعتی اموال کی، یا کسی ایسے عہدہ و منصب کی جو کسی شخص پر بھروسہ کرتے ہوئے جماعت اس کے حوالے کر دے۔

لِاَمَانَاتِھِم: (۸/۲۳) "امانات" کا لفظ جامع ہے ان تمام امانتوں کے لیے جو خداوند عالم نے، یا معاشرے نے، یا افراد نے کسی شخص کے سپرد کی ہوں اور عہد و پیمان میں وہ سارے معاہدات داخل ہیں جو انسان اور خدا کے درمیان یا انسان اور انسان کے درمیان، یا قوم اور قوم کے درمیان استوار کیے گئے ہوں، مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ کبھی امانت میں خیانت نہ کرے گا اور کبھی اپنے قول و قرار سے نہ پھرے گا۔ نبی ﷺ اکثر اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے لا ایمان لمن لا امانۃ لہ ولا دین لمن لا عہد لہ، جو امانت کی صفت نہیں رکھتا وہ ایمان نہیں رکھتا اور جو عہد کا پاس نہیں

رکھتا وہ دین نہیں رکھتا۔'' (بیہقی فی شعب الایمان)۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ''چار خصلتیں ہیں کہ جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ خاص منافق ہے اور جس میں کوئی ایک پائی جائے اس کے اندر نفاق کی ایک خصلت ہے جب تک وہ اسے چھوڑ نہ دے، جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بولے تو جھوٹ بولے۔ جب عہد کرے تو توڑ دے اور جب کسی سے جھگڑے تو (اخلاق و دیانت) کی ساری حدیں پھاند جائے''۔

الاَمَانَة: (۷۲/۳۳) اس جگہ ''امانت'' سے مراد وہی ''خلافت'' ہے جو قرآن مجید کی رو سے انسان کو زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طاعت و معصیت کی جو آزادی بخشی ہے اور اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے اسے اپنی بے شمار مخلوقات پر تصرف کے جو اختیارات عطا کیے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری اعمال کا ذمہ دار قرار پائے اور اپنے صحیح طرز عمل پر اجر کا اور غلط طرز عمل پر سزا کا مستحق بنے۔ یہ اختیارات چونکہ انسان نے خود حاصل نہیں کیے ہیں بلکہ اللہ نے اسے دیے ہیں اور ان کے صحیح و غلط استعمال پر وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے، اس لیے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کو ''خلافت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہاں انہی کے لیے امانت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اَمِیْن: (۵۱/۴۴) امن کی جگہ سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں کسی قسم کا کھٹکا نہ ہو۔ کوئی غم کوئی پریشانی، کوئی خطرہ اور اندیشہ، کوئی مشقت اور تکلیف لاحق نہ ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اہل جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ یہاں تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے، ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی نہ مرو گے، ہمیشہ خوشحال رہو گے کبھی خستہ حال نہ ہو گے۔ ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔'' (مسلم بروایت ابوہریرہ و ابوسعید خدری)۔

اٰمَنُوْا: (۱۳۶/۴) دراصل یہاں لفظ ایمان دو الگ الگ معنوں میں استعمال ہوا ہے، ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، نہ ماننے والوں سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے اسے سچے دل سے مانے، پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ مانے، اپنی فکر کو، اپنے مذاق کو، اپنی پسند کو، اپنے رویے اور چلن کو، اپنی دوستی اور دشمنی کو، اپنی سعی و جہد کے مصرف کو بالکل اس عقیدے کے مطابق بنالے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ آیت میں خطاب ان تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنی کے لحاظ سے ''ماننے والوں'' میں شمار ہوتے ہیں، اور ان سے مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ دوسرے معنی کے لحاظ سے سچے مومن بنیں۔

اٰمَنُوْا: (۱۰۳/۳) ان میں پہلی صفت ایمان ہے یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآن مجید میں محض زبانی اقرار ایمان کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے (مثلاً النساء، آیت ۱۳۷، المائدہ آیت ۵۴، الانفال آیت ۲۰۔۲۷، التوبہ آیت ۳۸ اور الصف آیت ۲ میں) لیکن اس کا اصل استعمال

سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنی ہی میں کیا گیا ہے اور عربی زبان میں بھی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔ لغت میں امن لہ کے معنی ہیں صدقہ و اعتمد علیہ (اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا) اور امن بہ کے معنی ہیں ایقن بہ اس پر یقین کیا۔ قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے، اس کو ان آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ (الحجرات۔ ۱۵)

''مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہ پڑے'' ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ (حم سجدہ۔ ۳۰) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے۔ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (الانفال ۲) ''مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔'' ﴿وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرہ ۱۶۵) ''اور جو لوگ ایمان لائے وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔'' ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (النساء ۶۵) ''پس نہیں اے نبی تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کرلیں۔''

ان سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرار ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا آمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (النساء ۱۳۶) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔'' اب رہا ایمان لانے سے کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے تو قرآن مجید میں پوری طرح اس بات کو بھی کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے مراد اولاً اللہ کو ماننا ہے، محض اس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اسے اس حیثیت سے ماننا ہے کہ وہی ایک خدا ہے۔ خدائی میں کوئی شریک نہیں ہے۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ انسان اس کی عبادت، بندگی اور اطاعت بجالائے۔ وہی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اسی سے دعا مانگنی چاہیے اور اسی پر توکل کرنا چاہیے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے والا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ اس کے حکم کی اطاعت کرے اور جس چیز سے اس نے منع کیا ہے اس سے رک جائے۔ وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔ اس سے انسان کا کوئی فعل تو درکنار، وہ مقصد اور نیت بھی مخفی نہیں ہے جس کے ساتھ اس نے کوئی فعل کیا ہے۔ ثانیاً، رسول کو ماننا اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا ہادی و رہنما ہے اور جس چیز کی تعلیم بھی اس نے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، برحق ہے اور واجب التسلیم ہے۔ اسی ایمان بالرسالت میں ملائکہ، انبیاء اور کتب الٰہیہ پر اور خود قرآن پر بھی ایمان لانا شامل ہے، کیونکہ یہ ان تعلیمات

میں سے ہے جو اللہ کے رسول نے دی ہیں۔ ثالثاً آخرت کو ماننا، اس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں ہے بلکہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا ہے اپنے ان اعمال کو جو اس نے دنیا کی اس زندگی میں کیے ہیں خدا کو حساب دینا ہے اور اس محاسبہ میں جو لوگ نیک قرار پائیں انہیں جزا اور جو بد قرار پائیں ان کو سزا ملنی ہے یہ ایمان اخلاق اور سیرت و کردار کے لئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے، ورنہ جہاں سرے سے یہ ایمان ہی موجود نہ ہو وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوشنما کیوں نہ ہو، اس کا حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

لِلۡاَنَامِ: (۱۰/۵۵) انام عربی زبان میں خلق کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں انسان اور دوسری سب زندہ مخلوقات شامل ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں کل شئی فیہ الروح، اَنام میں ہر وہ چیز شامل ہے جسکے اندر روح ہے، مجاہد اس کے معنی بیان کرتے ہیں خلائق۔ قتادہ، ابن زید اور شعبی کہتے ہیں کہ سب جاندار انام ہیں۔ حسن بصری کہتے ہیں کہ انس و جن دونوں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یہی معنی تمام اہل لغت نے بیان کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اس آیت سے زمین کو ریاست کی ملکیت بنانے کا حکم نکالتے ہیں وہ ایک فضول بات کہتے ہیں۔ یہ باہر کے نظریات لا کر قرآن میں زبردستی ٹھونسنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے جس کا ساتھ نہ آیت کے الفاظ دیتے ہیں نہ سیاق و سباق۔ اَنام صرف انسانی معاشرے کو نہیں کہتے بلکہ زمین کی دوسری مخلوقات بھی اس میں شامل ہیں اور زمین کو اَنام کے لیے وضع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سب کی مشترک ملکیت ہو اور سیاق عبارت بھی نہیں بتا رہا ہے کہ کلام کا مدعا اس جگہ کوئی معاشی ضابطہ بیان کرنا ہے۔ یہاں تو مقصود دراصل یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو اس طرح بنایا اور تیار کر دیا کہ یہ قسم قسم کی زندہ مخلوقات کے لیے رہنے بسنے اور زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گئی۔ یہ آپ سے آپ ایسی نہیں ہو گئی ہے۔ خالق کے بنانے سے ایسی بنی ہے۔ اس نے اپنی حکمت سے اس کو ایسی جگہ رکھا اور ایسے حالات اس میں پیدا کیے جن سے یہاں زندہ انواع کا رہنا ممکن ہوا۔

الاِنۡجِیۡل: (۳/۳) اسی طرح انجیل دراصل نام ہے ان الہامی خطبات اور اقوال کا جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں بحیثیت نبی ارشاد فرمائے وہ کلمات طیبات آپ کی زندگی میں لکھے اور مرتب کیے گئے تھے یا نہیں، اس کے متعلق اب ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلومات نہیں ہے، ممکن ہے بعض لوگوں نے انہیں نوٹ کر لیا ہو اور ممکن ہے کہ سننے والے معتقدین نے ان کو زبانی یاد کر رکھا ہو، بہر حال ایک مدت کے بعد جب آنجناب کی سیرت پاک پر مختلف رسالے لکھے گئے تو ان میں تاریخی بیان کے ساتھ ساتھ وہ خطبات اور

ارشادات بھی جگہ جگہ حسب موقع درج کردیے گئے جو ان رسالوں کے مصنفین تک زبانی روایات اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے سے پہنچے تھے، آج متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی جن کتابوں کو اناجیل کہا جاتا ہے، دراصل انجیل وہ نہیں ہیں، بلکہ انجیل حضرت مسیح کے وہ ارشادات ہیں جو ان کے اندر درج ہیں۔ ہمارے پاس ان کو پہچاننے اور مصنفین سیرت کے اپنے کلام سے ان کو ممیز کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جہاں سیرت کا مصنف کہتا ہے کہ مسیح نے یہ فرمایا یا لوگوں کو یہ تعلیم دی، صرف وہی مقامات اصل انجیل کے اجزا ہیں۔ قرآن انہیں اجزاء کے مجموعے کو ''انجیل'' کہتا ہے اور انہیں کی وہ تصدیق کرتا ہے، آج کوئی شخص ان بکھرے ہوئے اجزا کو مرتب کرکے قرآن سے ان کا مقابلہ کرکے دیکھے تو وہ دونوں میں بہت ہی کم فرق پائے گا اور جو تھوڑا بہت فرق محسوس ہو گا، وہ بھی غیر متعصبانہ غور و تامل کے بعد بآسانی حل کیا جاسکے گا۔

تَستَانِسُوا : (۲۴/۲۷) اصل میں لفظ تستانسوا استعمال ہوا ہے، جس کو عموماً لوگوں نے حتی تستاذنوا کے معنی میں لے لیا ہے، لیکن درحقیقت دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے جس کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اگر حتی تستاذنوا فرمایا جاتا تو آیت کے معنی یہ ہوتے کہ ''لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔ اس طرز تعبیر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے حتی تستانسوا کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ استیناس کا مادہ انس ہے جو اردو زبان میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں عربی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مادے سے استیناس کا لفظ جب بولیں گے تو اسکے معنی ہوں گے، انس معلوم کرنا، یا اپنے سے مانوس کرنا۔ پس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ''لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ انکو مانوس نہ کرلو یا ان کا انس معلوم نہ کرلو'' یعنی یہ معلوم نہ کرلو کہ تمہارا آنا صاحب خانہ کو ناگوار تو نہیں ہے، وہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کے گھر میں داخل ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ ''اجازت لینے'' کے بجائے ''رضا لینے'' کے الفاظ سے کیا ہے کیونکہ یہ مفہوم اصل سے قریب تر ہے۔

الاِنسَان : (۱۰۳/۲) انسان کا لفظ اگرچہ واحد ہے لیکن بعد کے فقرے میں اس سے ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار صفات سے متصف ہوں اس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں لفظ انسان اسم جنس کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اس کا اطلاق افراد، گروہوں، اقوام اور پوری نوع انسانی پر یکساں ہوتا ہے پس یہ حکم کہ مذکورہ چار صفات سے جو بھی خالی ہو وہ خسارے میں ہے، ہر حالت میں ثابت ہو گا خواہ ان سے خالی کوئی شخص ہو، یا کوئی قوم یا دنیا بھر کے انسان۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم اگر یہ حکم لگائیں کہ زہر انسان کے لئے مہلک ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ زہر بہر حال مہلک ہے خواہ ایک فرد اس کو کھائے، یا ایک پوری قوم یا ساری دنیا کے انسان مل کر اسے کھا جائیں، زہر کی مہلک خاصیت اپنی جگہ اٹل ہے اس میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں

پڑتا کہ ایک شخص نے اس کو کھایا ہے یا ایک قوم نے اسے کھانے کا فیصلہ کیا ہے یا دنیا بھر کے انسانوں کا اجماع اس پر ہو گیا ہے کہ زہر کھانا چاہیے۔ ٹھیک اسی طرح یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ چار مذکورہ بالا صفات سے خالی ہونا انسان کے لئے خسارے کا موجب ہے اس قاعدہ کلیہ میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ایک شخص ان سے خالی ہے یا کسی قوم نے یا دنیا بھر کے انسانوں نے کفر، بد عملی اور ایک دوسرے کو باطل کی ترغیب دینے اور بندگی نفس کی تلقین کرنے پر اتفاق کرلیا ہے۔

اَھلُ الکِتٰب: (۱۱۰/۳) یہاں اہل کتاب سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔

اَوَّاب: (۳۲/۵۰) اصل میں لفظ اواب استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جس نے نافرمانی اور خواہشات نفس کی پیروی کا راستہ چھوڑ کر طاعت اور اللہ کی رضاجوئی کا راستہ اختیار کرلیا ہو، جو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہے اور ہر اس چیز کو اختیار کرلے جو اللہ کو پسند ہے جو راہ بندگی سے ذرا قدم ہٹتے ہی گھبرا اٹھے اور توبہ کرکے بندگی کی راہ پر پلٹ آئے جو کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والا اور اپنے تمام معاملات میں اس کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔

الاَیَامیٰ: (۳۲/۲۴) اصل میں لفظ ایامی استعمال ہوا ہے جسے عام طور پر لوگ محض بیوہ کے معنی میں لے لیتے ہیں، حالانکہ دراصل اس کا اطلاق ایسے تمام مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو بے زوج ہوں، ایامی جمع ہے ایم کی، اور ایم ہر اس مرد کو کہتے ہیں جس کی کوئی بیوی نہ ہو اور ہر اس عورت کو کہتے ہیں جس کا کوئی شوہر نہ ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ مجرد کیا ہے۔

آیَاتِی: (۲۱/ ۳۷) بعد کی تقریر صاف بتا رہی ہے کہ یہاں "نشانیوں" سے مراد کیا ہے۔ وہ لوگ جن باتوں کا مذاق اڑاتے تھے ان میں سے ایک عذاب الٰہی اور قیامت اور جہنم کا مضمون بھی تھا۔

بِاٰیٰتِہٖ : (۲۱/۶) اللہ کی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں بھی ہیں جو انسان کے اپنے نفس اور ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ بھی جو پیغمبروں کی سیرت اور ان کے کارناموں میں ظاہر ہوئیں، اور وہ بھی جو کتب آسمانی میں پیش کی گئیں۔ یہ ساری نشانیاں ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں یعنی یہ کہ موجودات عالم میں خدا صرف ایک ہے باقی سب بندے ہیں، اب جو شخص ان تمام نشانیوں کے مقابلہ میں کسی حقیقی شہادت کے بغیر کسی علم، کسی مشاہدے اور کسی تجربے کے بغیر، مجرد قیاس و گمان یا تقلید آبائی کی بنا پر، دوسروں کو الوہیت کی صفات سے متصف اور خداوندی حقوق کا مستحق ٹھیراتا ہے۔

اٰیَۃٌ: (۶/۱۰۹) نشانی سے مراد کوئی ایسا صریح معجزہ ہے جسے دیکھ کر نبی ﷺ کی صداقت اور آپؐ کے مامور من اللہ ہونے کو مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

بِآیٰاتِنا: (۳۹/۲) آیات جمع ہے آیت کی، آیت کے اصل معنی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے۔ کہیں آثار کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے کیونکہ مظاہر قدرت میں سے ہر چیز اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستور ہے۔ کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر آتے تھے کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرمانروائے کائنات کے نمائندے ہیں۔ کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے، اس کے محض مضامین ہی نہیں اس کے الفاظ اور انداز بیان اور طرز عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں، ہر جگہ عبارت کے سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں "آیت" کا لفظ کس معنی میں آیا ہے۔

بِاٰیٰتِ رَبِّہٖ: (۲۲/۳۲) "رب کی آیات" یعنی اس کی نشانیوں کے الفاظ بہت جامع ہیں جن کے اندر تمام اقسام کی نشانیاں آجاتی ہیں۔ قرآن مجید کے جملہ بیانات کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشانیاں حسب ذیل چھ قسموں پر مشتمل ہیں:

(۱) وہ نشانیاں جو زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز میں اور کائنات کے مجموعی نظام میں پائی جاتی ہیں۔

(۲) وہ نشانیاں جو انسان کی اپنی پیدائش اور اس کی ساخت اور اس کے وجود میں پائی جاتی ہیں

(۳) وہ نشانیاں جو انسان کے وجدان اس کے لاشعور اور تحت الشعور میں، اور اس کے اخلاقی تصورات میں پائی جاتی ہیں۔

(۴) وہ نشانیاں جو انسانی تاریخ کے مسلسل تجربات میں پائی جاتی ہیں۔

(۵) وہ نشانیاں جو انسان پر آفات ارضی و سماوی کے نزول میں پائی جاتی ہیں۔

(۶) اور ان سب کے بعد وہ آیات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ بھیجیں تاکہ معقول طریقے سے انسان کو انہی حقائق سے آگاہ کیا جائے جن کی طرف اوپر کی تمام نشانیاں اشارہ کر رہی ہیں۔

آلِ فِرعَون: (۴۹/۲) "آل فرعون" کا ترجمہ ہم نے "فرعونیوں" سے کیا ہے، اس میں خاندان فراعنہ اور مصر کا حکمران طبقہ دونوں شامل ہیں۔

(ب)

الأبتر: (۱۰۸/ ۳) "وہی ابتر ہے" فرمایا گیا ہے یعنی وہ آپؐ کو ابتر کہتا ہے لیکن حقیقت میں ابتر وہ خود ہے۔ ابتر کی کچھ تشریح ہم اس سے پہلے اس سورہ کے دیباچہ میں کر چکے ہیں۔ یہ لفظ بتر سے ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں مگر محاورے میں یہ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں نماز کی اس رکعت کو جس کے ساتھ کوئی دوسری رکعت نہ پڑھی جائے بتیراء کہا گیا ہے یعنی اکیلی رکعت۔ ایک حدیث میں ہے **کل امر ذی بال لا یبدأ فیه بحمد الله فھو ابتر** "ہر وہ کام جو کوئی اہمیت رکھتا ہو اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ ابتر ہے"۔ یعنی اس کی جڑ کٹی ہوئی ہے اسے کوئی استحکام نصیب نہیں ہے، یا اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ نامراد آدمی کو بھی ابتر کہتے ہیں، ذرائع و وسائل سے محروم ہو جانے والا بھی ابتر کہلاتا ہے۔ جس شخص کے لئے کسی خیر اور بھلائی کی توقع باقی نہ رہی ہو اور جس کی کامیابی کی سب امیدیں منقطع ہو گئی ہوں وہ بھی ابتر ہے، جو آدمی اپنے کنبے برادری اور اعوان وانصار سے کٹ کر اکیلا رہ گیا ہو وہ بھی ابتر ہے۔ جس آدمی کی کوئی اولاد نرینہ نہ ہو یا مر گئی ہو اس کے لئے بھی ابتر کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہتا اور مرنے کے بعد وہ بے نام و نشان ہو جاتا ہے۔ قریب قریب ان سب معنوں میں کفار قریش رسول اللہ ﷺ کو ابتر کہتے تھے۔

بَحِیرَۃ: (۵/ ۱۰۳) بحیرہ اس اونٹنی کو کہتے تھے جو پانچ دفعہ بچے جن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچہ ہوا ہو۔ اس کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا، پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا، نہ اس کا دودھ پیا جاتا، نہ اسے ذبح کیا جاتا، نہ اس کا اون اتارا جاتا، اسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے چرے اور جس گھاٹ سے چاہے پانی پئے۔

بُرُوجًا: (۱۵/ ۱۶) عربی زبان میں قلعے، قصر اور مستحکم عمارت کو کہتے ہیں، قدیم علم ہیئت میں "برج کا لفظ اصطلاحاً ان بارہ منزلوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جن پر سورج کے مدار کو تقسیم کیا گیا تھا، اس وجہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا کہ قرآن کا اشارہ انہی بروج کی طرف ہے بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد سیارے لیے ہیں لیکن بعد کے مضمون پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد عالم بالا کے وہ خطے ہیں جن میں سے ہر خطے کو نہایت مستحکم سرحدوں نے دوسرے خطے سے جدا کر رکھا ہے، اگرچہ یہ سرحدیں فضائے بسیط میں غیر مرئی طور پر کھچی ہوئی ہیں، لیکن ان کو پار کر کے کسی چیز کا ایک خطے سے دوسرے خطے میں چلا جانا سخت مشکل ہے، اس مفہوم کے لحاظ سے ہم بروج کو محفوظ خطوں Fortified spheres کے معنی لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔

تَبَرَّجَ: (۳۳/۳۳) تبرج کے معنی عربی زبان میں نمایاں ہونے، ابھرنے اور کھل کر سامنے آنے کے ہیں۔ ہر ظاہر اور مرتفع چیز کے لیے عرب لفظ ''برج'' استعمال کرتے ہیں۔ ''برج'' کو برج اس کے ظہور اور ارتفاع کی بنا پر کہا جاتا ہے۔ بادبانی کشتی کے لیے بارجہ کا لفظ اسی لیے بولا جاتا ہے کہ اس کے بادبان دور سے نمایاں ہوتے ہیں۔ عورت کے لئے تبرج استعمال کیا جائے تو اس کے تین مطلب ہوں گے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے چہرے اور جسم کا حسن لوگوں کو دکھائے، دوسرے یہ کہ وہ اپنے لباس اور زیور کی شان دوسروں کے سامنے نمایاں کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنی چال ڈھال اور چٹک مٹک سے اپنے آپ کو نمایاں کرے۔ یہی تشریح اس لفظ کی اکابر لغت اور اکابر مفسرین نے کی ہے۔ مجاہد قتادہ اور ابن ابی نجیح کہتے ہیں: التبرج المشی بتبختر و تکسر و تفنج۔ ''تبرج کے معنی ہیں ناز و ادا کے ساتھ لچکے کھاتے اور اٹھلاتے ہوئے چلنا۔'' مقاتل کہتے ہیں: ابداء قلائدھا و قرطھا و عنقھا ''عورت کا اپنے ہار اور اپنے بندے اور اپنا گلا نمایاں کرنا۔'' المبرد کا قول ہے: ان تبدی من محاسنھا ما یجب علیھا سترھا ''یہ کہ عورت اپنے وہ محاسن ظاہر کردے جن کو اسے چھپانا چاہیے''۔ ابوعبیدہ کی تفسیر ہے: ان تخرج من محاسنھا ما تستدعی بہ شھوۃ الرجال ''یہ کہ عورت اپنے جسم و لباس کے حسن کو نمایاں کرے جس سے مردوں کو اس کی طرف رغبت ہو''۔

ذَاتِ الْبُرُوْجِ: (۱/۸۵) اصل الفاظ ہیں ﴿ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾ یعنی برجوں والے آسمان کی۔ مفسرین میں سے بعض نے اس سے مراد قدیم علم ہیئت کے مطابق آسمان کے ۱۲ برج لئے ہیں۔ اور ابن عباس، مجاہد، قتادہ، حسن بصری، ضحاک اور سدی کے نزدیک اس سے مراد آسمان کے عظیم الشان تارے اور سیارے ہیں۔

مُتَبَرِّجَات: (۲۴/۶۰) اصل الفاظ ہیں ﴿غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِيْنَةٍ﴾، ''زینت کے ساتھ تبرج کرنے والی نہ ہوں۔'' تبرج کے معنی ہیں اظہار نمائش کے۔ بارج اس کھلی کشتی یا جہاز کو کہتے ہیں جس پر چھت نہ ہو۔ اسی معنی میں عورت کے لیے یہ لفظ اس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ مردوں کے سامنے اپنے حسن اور اپنی آرائش کا اظہار کرے۔

الاَبْرَار: (۷۶/۵) اصل میں لفظ ابرار استعمال ہوا ہے جس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی اطاعت کا حق ادا کیا ہو، اس کے عائد کیے ہوئے فرائض بجالائے ہوں اور اس کے منع کیے ہوئے افعال سے اجتناب کیا ہو۔

بَرَزُوْا: (۱۴/۲۱) بروز کے معنی محض نکل کر سامنے آنے اور پیش ہونے ہی کے نہیں ہیں بلکہ اس میں ظاہر ہونے اور کھل جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اسی لئے ہم نے اس کا ترجمہ بے نقاب ہو کر سامنے آجانا کیا ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے تو بندے ہر وقت اپنے رب کے سامنے بے نقاب ہیں، مگر آخرت کی پیشی جب وہ سب کے سب اللہ کی عدالت میں حاضر ہوں گے تو انہیں خود

بھی معلوم ہو گا کہ ہم اس احکم الحاکمین اور مالک یوم الدین کے سامنے بالکل بے نقاب ہیں ہمارا کوئی کام بلکہ کوئی خیال اور دل کے گوشوں میں چھپا ہوا کوئی ارادہ تک اس سے مخفی نہیں ہے۔

بَرْزَخ: (۲۳/۱۰۰) برزخ فارسی لفظ ''پردہ'' کا معرب ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے اور دنیا کے درمیان ایک روک ہے جو انہیں واپس جانے نہیں دے گی، اور قیامت تک یہ دنیا اور آخرت کے درمیان کی اس حد فاصل میں ٹھیرے رہیں گے۔

بَرِقَ الْبَصَرُ: (۷۵/۷) اصل میں برق البصر کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے لغوی معنی بجلی کی چمک سے آنکھوں کے چندھیا جانے کے ہیں لیکن عربی محاورے میں یہ الفاظ اسی معنی کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ خوف زدگی، حیرت یا کسی اچانک حادثہ سے دوچار ہو جانے کی صورت میں اگر آدمی ہک دک رہ جائے اور اس کی نگاہ اس پریشان کن منظر کی طرف جم کر رہ جائے جو اس کو نظر آرہا ہو تو اس کے لیے بھی یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ﴾، ''اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اس دن کے لیے جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی'' (ابراہیم، ۴۲)۔

فَتَبَارَکَ: (۲۳/۱۴) اصل میں فتبارک اللہ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں جن کی پوری معنویت ترجمے میں ادا کرنا محال ہے۔ لغت اور استعمالات زبان کے لحاظ سے اس میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ وہ نہایت مقدس اور منزہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اس قدر خیر اور بھلائی اور خوبی کا مالک ہے کہ جتنا تم اس کا اندازہ کرو اس سے زیادہ ہی اس کو پاؤ حتیٰ کہ اس کی خیرات کا سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو۔

مُبٰرَکٌ: (۳۸/۲۹) برکت کے لغوی معنی ''افزائشِ خیر وسعادت''۔ قرآن مجید کو برکت والی کتاب کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ انسان کے لیے نہایت مفید کتاب ہے۔ اس کی زندگی کو درست کرنے کے لیے بہترین ہدایات دیتی ہے، اس کی پیروی میں آدمی کا نفع ہی نفع ہے، نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

تَبٰرَکَ: (۲۵/۱) اصل میں لفظ تبارک استعمال ہوا ہے جس کا پورا مفہوم کسی ایک لفظ تو درکنار ایک فقرے میں بھی ادا ہونا مشکل ہے اس کا مادہ ب ر ک ہے جس سے دو مصدر برکۃ اور بروک نکلے ہیں۔ برکۃ میں افزونی، فراوانی، کثرت اور زیادتی کا تصور ہے اور بروک میں ثبات، بقاء اور لزوم کا تصور۔ پھر جب اس مصدر سے تبارک کا صیغہ بنایا جاتا ہے تو باب تفاعل کی خصوصیت، مبالغہ اور اظہار کمال، اس میں اور شامل ہو جاتی ہے اور اس کا مفہوم انتہائی فراوانی، بڑھتی اور چڑھتی افزونی اور کمال درجے کی پائیداری ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف حیثیتوں سے کسی چیز کی فراوانی کے لیے، یا اس کے ثبات ودوام کی کیفیت بیان کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی اس سے مراد بلندی میں بہت بڑھ جانا ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں تبارکت

النخلة یعنی فلاں کھجور کا درخت بہت اونچا ہو گیا۔ اصمعی کہتا ہے کہ ایک بدو ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا تبارکتم علیکم، میں تم سے اونچا ہو گیا ہوں۔ کبھی اسے عظمت اور بزرگی میں بڑھ جانے کے لیے بولتے ہیں۔ کبھی اس کو فیض رسانی اور خیر اور بھلائی میں بڑھے ہوئے ہونے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی اس سے پاکیزگی و تقدس کا کمال مراد ہوتا ہے اور یہی کیفیت اس کے معنی ثبوت و لزوم کی بھی ہے۔ موقع و محل اور سیاق و سباق بتا دیتا ہے کہ کس جگہ اس لفظ کا استعمال کس غرض کے لیے کیا گیا ہے۔ یہاں جو مضمون آگے چل کر بیان ہو رہا ہے اس کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ کے لئے تبارک ایک معنی میں نہیں، بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے:

(۱) بڑا محسن اور نہایت باخیر، اس لیے کہ اس نے اپنے بندے کو فرقان کی عظیم الشان نعمت سے نواز کر دنیا بھر کو خبردار کرنے کا انتظام فرمایا۔

(۲) نہایت بزرگ و باعظمت، اس لئے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اسی کی ہے۔

(۳) نہایت مقدس و منزہ، اس لیے کہ اس کی ذات ہر شائبہ شرک سے پاک ہے۔ نہ اس کا کوئی ہم جنس کہ ذات خداوندی میں اس کا نظیر و مثیل ہو، اور نہ اسکے لیے فنا و تغیر کہ اسے جانشینی کے لیے بیٹے کی حاجت ہو۔

(۴) نہایت بلند و برتر، اس لیے کہ بادشاہی ساری کی ساری اسی کی ہے اور کسی دوسرے کا یہ مرتبہ نہیں کہ اس کے اختیارات میں اس کا شریک ہو سکے۔

(۵) کمال قدرت کے اعتبار سے برتر، اس لیے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کو پیدا کرنے والا اور ہر شے کی تقدیر مقرر کرنے والا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۱۴۔ الفرقان، حاشیہ ۱۹)۔

تَبَارَکَ: (۲۵/۱۰) یہاں پھر وہی تبارک کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعد کا مضمون بتا رہا ہے کہ اس جگہ اس کے معنی ہیں "بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے" "غیر محدود قوت رکھنے والا ہے۔ اس سے بالاتر ہے کہ کسی کے حق میں کوئی بھلائی کرنا چاہے اور نہ کر سکے۔

مُبَارَکَةً: (۲۴/۳۵) مبارک، یعنی کثیر المنافع، بہت سے فائدوں کا حامل۔

بَشَراً: (۳۸/۷۱) بشر کے لغوی معنی ہیں جسم کثیف کے جس کی ظاہری سطح کسی دوسری چیز سے ڈھکی ہوئی نہ ہو۔ انسان کی تخلیق کے بعد تو یہ لفظ انسان ہی کے لیے استعمال ہونے لگا ہے لیکن تخلیق سے پہلے اس کا ذکر لفظ بشر سے کرنے اور اس کو مٹی سے بنانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ "میں مٹی کا ایک پتلا بنانے والا ہوں جو بال و پر سے عاری ہو گا، یعنی جس کی جلد دوسرے حیوانات کی طرح اون، یا صوف یا بالوں اور پروں سے ڈھکی ہوئی نہ ہو گی۔"

بَعْلاً: (۳۷/۱۲۵) بعل کے لغوی معنی آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوہر کے لئے بھی یہ

لفظ بولا جاتا تھا اور متعدد مقامات پر خود قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ آیت ۲۲۸، سورہ نساء آیت ۱۲۷، سورہ ہود آیت ۷۲، اور سورہ نور آیت ۳۱ میں۔ لیکن قدیم زمانے میں سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنی میں استعمال کرتی تھیں اور انہوں نے ایک خاص دیوتا کو بعل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ لبنان کی فنیقی قوم(Phoenicians) کا سب سے بڑا نر دیوتا بعل تھا اور اس کی بیوی عستارات(Ashtorach) ان سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا بعل سے مراد سورج ہے یا مشتری اور عستارات سے مراد چاند ہے یا زہرہ۔ بہر حال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابل سے لے کر مصر تک پورے مشرق اوسط میں بعل پرستی پھیلی ہوئی تھی اور خصوصاً لبنان اور شام و فلسطین کی مشرک اقوام بری طرح اس میں مبتلا تھیں، بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد فلسطین اور شرق اردن میں آ کر آباد ہوئے۔ اور توراۃ کے سخت امتناعی احکام کی خلاف ورزی کر کے انہوں نے ان مشرکوں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کر دئے تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ اول حضرت یوشع بن نون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں اخلاقی و دینی زوال رونما ہونا شروع ہو گیا تھا:

''اور بنی اسرائیل نے خدا کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے ــــــ اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے'' (قضاۃ ۲:۱۱-۱۳)

''سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور حتیوں اور اموریوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کے درمیان بس گئے اور ان کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں اور ان کے بیٹوں کو دینے اور ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے۔'' (قضاۃ ۲:۵-۶)

اس زمانہ میں بعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گھس چکی تھی کہ بائبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں علانیہ بعل کا مذبح بنا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مذبح توڑ دیا۔ دوسرے روز ایک مجمع کثیر اکٹھا ہو گیا اور وہ اس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اڈے کو توڑا تھا (قضاۃ ۶:۲۵-۳۲) اس صورتحال کو آخر کار حضرت سموایل، طالوت، داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی بلکہ اپنی مملکت میں بالعموم شرک و بت پرستی کو دبا دیا لیکن حضرت سلیمان کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر ابھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بعل پرستی کے سیلاب میں بہہ گئی۔

البَغی: (۱۶/۹۰) جس کے معنی اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔

بَقْل: (۲/۶۱) ترہ سبزی، ویقال کل نبات اخضرت لہ الارض۔ یعنی یہ لفظ ہر اس نبات

کے لیے بولا جاتا ہے جس سے زمین سبز ہو جائے (صراح)۔ ترہ سبزہ کہ از تخم بروید نہ از بیخ (منتہی الارب) ترہ کا لفظ فارسی زبان میں ساگ اور ترکاری دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اوپر جو حوالے میں نے دیئے ہیں ان میں ترہ سبزی واؤ عطف کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اس لیے ساگ، ترکاری لکھنا زیادہ صحیح ہے۔ (رسائل ومسائل حصہ پنجم ص ۹۴)

اِبلِیس: (۲ر۳۴) لفظی ترجمہ ''انتہائی مایوس''۔ اصطلاحاً یہ اس جن کا نام ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدم اور بنی آدم کے لیے مطیع و مسخر ہونے سے انکار کر دیا اور اللہ سے قیامت تک کے لئے مہلت مانگی کہ اسے نسل انسانی کو بہکانے اور گمراہیوں کی طرف ترغیب دینے کا موقع دیا جائے۔ اسی کو ''الشیطان'' بھی کہا جاتا ہے، درحقیقت شیطان اور ابلیس بھی محض کسی مجرد قوت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ بھی انسان کی طرح ایک صاحب تشخص ہستی ہے۔ نیز کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ یہ فرشتوں میں سے تھا۔ آگے چل کر قرآن نے خود تصریح کر دی ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا جو فرشتوں سے الگ مخلوقات کی ایک مستقل صنف ہیں۔

مُبلِسُون: (۲۳ر۷۷) اصل میں لفظ مبلسون استعمال ہوا ہے جس کا پورا مفہوم مایوسی سے ادا نہیں ہوتا۔ بلس اور ابلاس کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حیرت کی وجہ سے دنگ ہو کر رہ جانا، خوف اور دہشت کے مارے دم بہ خود ہو جانا، رنج و غم کے مارے دل شکستہ ہو جانا، ہر طرف سے ناامید ہو کر ہمت توڑ بیٹھنا۔ اور اسی کا ایک پہلو مایوسی و نامرادی کی وجہ سے برافروختہ (Desperate) ہو جانا بھی ہے جس کی بنا پر شیطان کا نام ابلیس رکھا گیا ہے۔ اس نام میں یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ یاس اور نامرادی (Frustration) کی بنا پر اس کا زخمی تکبر اس قدر برانگیختہ ہو گیا ہے کہ اب وہ جان سے ہاتھ دھو کر ہر بازی کھیل جانے اور ہر جرم کا ارتکاب کر گزرنے پر تلا ہوا ہے۔

یُبلِسُ: (۳۰ر۱۲) ابلاس اصل میں لفظ ابلاس استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں سخت مایوسی اور صدمے کی بنا پر کسی شخص کا گم سم ہو جانا، امید کے سارے راستے بند پا کر حیران و ششدر رہ جانا، کوئی حجت نہ پا کر دم بخود رہ جانا۔ یہ لفظ جب مجرم کے لئے استعمال کیا جائے تو ذہن کے سامنے اس کی یہ تصویر آتی ہے کہ ایک شخص عین حالت جرم میں بھرے ہاتھوں (Red handed) پکڑا گیا ہے، نہ فرار کی کوئی راہ پاتا ہے، نہ اپنی صفائی میں کوئی چیز پیش کر کے بچ نکلنے کی توقع رکھتا ہے، اس لئے زبان اس کی بند ہے اور وہ انتہائی مایوسی و دل شکستگی کی حالت میں حیران و پریشان کھڑا ہے۔

بَھِیمَۃُ الاَنعَام: (۵ر۱) ''انعام'' (مویشی) کا لفظ عربی زبان میں اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری پر بولا جاتا ہے اور ''بھیمۃ'' کا اطلاق ہر چرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ انعام تمہارے لیے حلال کیے گئے تو اس سے صرف وہی چار جانور حلال ہوتے جنہیں عربی میں ''انعام'' کہتے ہیں لیکن حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ ''مویشی کی قسم کے چرندہ چوپائے

تم پر حلال کیے گئے"۔ اس سے حکم وسیع ہو جاتا ہے اور وہ سب چرندہ جانور اس کے دائرے میں آجاتے ہیں جو مویشی کی نوعیت کے ہوں، یعنی وہ جو کچلیاں رکھتے ہوں، نیز اس سے اشارۃً یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ چوپائے جو مویشیوں کے برعکس کچلیاں رکھتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں، حلال نہیں۔ اسی اشارے کو نبی علیہ ﷺ نے واضح کر کے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ درندے حرام ہیں۔ اسی طرح حضور نے ان پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جن کے پنجے ہوتے ہیں اور جو دوسرے جانوروں کو شکار کر کے کھاتے ہیں یا مردار خور ہوتے ہیں۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ نهی رسول الله ﷺ عن کل ذی ناب من السباع و کل ذی مخلب من الطیر۔ دوسرے متعدد صحابہ سے بھی اس کی تائید میں روایات منقول ہیں۔

البَیْتُ العَتِیق: (۲۹/۲۲) کعبہ کے لئے "بیت عتیق" کا لفظ بہت معنی خیز ہے۔ "عتیق" عربی زبان میں تین معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک قدیم، دوسرے آزاد، جس پر کسی کی ملکیت نہ ہو۔ تیسرے، مکرم اور معزز یہ تینوں ہی معنی میں اس پاک گھر پر صادق آتے ہیں۔

بُیُوت: (۳۶/۲۴) بعض مفسروں نے ان "گھروں" سے مراد مساجد لی ہیں۔ اور ان کو بلند کرنے سے مراد ان کو تعمیر کرنا اور ان کی تعظیم و تکریم کرنا لیا ہے۔ اور بعض دوسرے مفسرین ان سے مراد اہل ایمان کے گھر کو لیتے ہیں اور انہیں بلند کرنے کا مطلب ان کے نزدیک انہیں اخلاقی حیثیت سے بلند کرنا ہے۔

اَھلَ البُیتِ: (۳۳/۳۳) "اھل البیت" کا لفظ عربی زبان میں ٹھیک انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم "گھر والوں" کا لفظ بولتے ہیں اور اس کے مفہوم میں آدمی کی بیوی اور اس کے بچے دونوں شامل ہوتے ہیں۔ بیوی کو مستثنیٰ کر کے "اہل خانہ" کا لفظ کوئی نہیں بولتا۔ خود قرآن مجید میں بھی اس مقام کے سوا دو مزید مقامات پر یہ لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ اس کے مفہوم میں بیوی شامل، بلکہ مقدم ہے۔ سورہ ہود میں جب فرشتے حضرت ابراہیم کو بیٹے کی پیدائش کی بشارت دیتے ہیں تو ان کی اہلیہ اسے سن کر تعجب کا اظہار کرتی ہیں کہ بھلا اس بڑھاپے میں ہمارے ہاں بچہ کیسے ہوگا۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں۔ ﴿اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ عَلَیۡکُمۡ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ﴾ "کیا تم اللہ کے امر پر تعجب کرتی ہو؟ اس گھر کے لوگو تم پر تو اللہ کی رحمت اور برکتیں ہیں" سورہ قصص میں جب حضرت موسیٰ ایک شیر خوار بچے کی حیثیت سے فرعون کے گھر میں پہنچتے ہیں اور فرعون کی بیوی کو کسی ایسی انا کی تلاش ہوتی ہے جس کا دودھ بچہ پی لے تو حضرت موسیٰ کی بہن جا کر کہتی ہیں ﴿هَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰۤی اَهۡلِ بَیۡتٍ یَّکۡفُلُوۡنَهٗ لَکُمۡ﴾ "کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کا پتہ دوں جو تمہارے لیے اس بچے کی پرورش کا ذمہ لیں؟" پس محاورہ اور قرآن کے استعمالات اور خود اس آیت کا سیاق و سباق ہر چیز اس بات پر قطعی دلالت کرتی ہے کہ نبی علیہ ﷺ کے اہل بیت میں آپؐ کی ازواج مطہرات بھی داخل ہیں اور آپ

کی اولاد بھی۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت کا اصل خطاب ازواج سے ہے اور اولاد مفہوم لفظ کے اعتبار سے اس میں شامل قرار پاتی ہے۔ اسی بناپر ابن عباس اور عروہ بن زبیر اور عکرمہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اہل البیت سے مراد ازواج النبی ﷺ ہیں۔

بُوراً: (۱۲/۴۸) اصل الفاظ ہیں کنتم قوما بورا، بور جمع ہے بائر کی اور بائر کے دو معنی ہیں۔ایک فاسد، بگڑا ہوا آدمی جو کسی بھلے کام کے لائق نہ ہو جس کی نیت میں فساد ہو۔ دوسرے ہالک، بدانجام، تباہی کے راستے پر لے جانے والا۔

بِئرٍ مُعَطَّلة: (۴۵/۲۲) عرب میں کنواں اور بستی قریب قریب ایک دوسرے کے ہم معنی ہیں۔ کسی قبیلے کی بستی کا نام لینا ہو تو کہتے ہیں ماء بنی فلان یعنی فلاں قبیلے کا کنواں۔ایک عرب کے سامنے جب یہ کہا جائے گا کہ کنوئیں بیکار پڑے ہیں تو اس کے ذہن میں اس کا یہ مطلب آئے گا کہ بستیاں اجڑی پڑی ہیں۔

بَیضٌ مَّکنُونٌ: (۴۹/۳۷) اصل الفاظ ہیں ﴿کَاَنَّھُنَّ بَیضٌ مَّکنُونٌ﴾۔ ''گویا وہ چھپے ہوئے یا محفوظ رکھے ہوئے انڈے ہیں۔'' ان الفاظ کی مختلف تعبیرات اہل تفسیر نے بیان کی ہیں۔ مگر صحیح تفسیر وہی ہے جو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ سے نقل کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب حضور سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ان کی نرمی ونزاکت اس جھلی جیسی ہو گی جو انڈے کے چھلکے اور اس کے گودے کے درمیان ہوتی ہے۔ (ابن جریر)۔

بِیَع: (۴۰/۲۲) بیعہ کا لفظ عربی زبان میں عیسائیوں کی عبادت گاہ کے لئے بولا جاتا ہے

اَلبَیِّنٰت: (۸۷/۲) ''روشن نشانیوں'' سے مراد وہ کھلی کھلی علامات ہیں جنہیں دیکھ کر ہر صداقت پسند طالب حق انسان یہ جان سکتا تھا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔

البَیِّنٰت: (۶/۶۴) اصل میں لفظ بینات استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ بیِّن عربی زبان میں ایسی چیز کو کہتے ہیں جو بالکل ظاہر اور واضح ہو، انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ فرمانا کہ وہ بینات لے کر آتے رہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایسی صریح علامات اور نشانیاں لے کر آتے تھے جو ان کے مامور من اللہ ہونے کی کھلی کھلی شہادت دیتی تھیں، دوسرے وہ جو بات بھی پیش کرتے تھے نہایت معقول اور روشن دلیلوں کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ تیسرے ان کی تعلیم میں کوئی ابہام نہ تھا، بلکہ وہ صاف صاف بتاتے تھے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، جائز کیا ہے اور ناجائز کیا، کس راہ پر انسان کو چلنا چاہئے اور کس راہ پر نہ چلنا چاہیے۔

البَیِّنٰتُ: (۱۵۳/۴) کھلی کھلی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول مقرر ہونے کے بعد سے لے کر فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے در پے ان لوگوں کے مشاہدے میں آچکی تھیں، ظاہر ہے کہ سلطنت مصر کی عظیم الشان طاقت کے پنجوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چھڑایا تھا وہ کوئی گائے کا بچہ نہ تھا بلکہ اللہ

رب العالمین تھا۔ مگر یہ اس قوم کی باطل پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت اور اس کے فضل کی روشن ترین نشانیوں کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکنے کے بعد بھی جب جھکی تو اپنے محسن خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک بچھڑے کی مصنوعی مورت ہی کے آگے جھکی۔

البَیان: (۵۵/۴) اصل میں لفظ بیان استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی تو اظہار ما فی الضمیر کے ہیں۔ یعنی بولنا اور اپنا مطلب و مدعا بیان کرنا۔ اور دوسرے معنی ہیں فرق و امتیاز کی وضاحت، جس سے مراد اس مقام پر خیر و شر اور بھلائی اور برائی کا امتیاز ہے۔ ان دونوں معنوں کے لحاظ سے یہ چھوٹا سا فقرہ اوپر کے استدلال کو مکمل کر دیتا ہے۔ بولنا وہ امتیازی وصف ہے جو انسان کو حیوانات اور دوسری ارضی مخلوقات سے ممیز کرتا ہے۔ یہ محض قوت گویائی ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے عقل و شعور، فہم و ادراک، تمیز و ارادہ اور دوسری ذہنی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں جن کے بغیر انسان کی قوت ناطقہ کام نہیں کر سکتی۔ اس لیے بولنا دراصل انسان کے ذی شعور اور ذی اختیار مخلوق ہونے کی صریح علامت ہے اور یہ امتیازی وصف جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمایا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے تعلیم کی نوعیت بھی وہ نہیں ہو سکتی جو بے شعور اور بے اختیار مخلوق کی رہنمائی کے لئے موزوں ہے۔ اسی طرح انسان کا دوسرا اہم ترین امتیازی وصف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایک اخلاقی حس (Moral Sense) رکھ دی ہے جس کی وجہ سے وہ فطری طور پر نیکی و بدی، حق اور ناحق، ظلم اور انصاف، بجا اور بے جا کے درمیان فرق کرتا ہے اور یہ وجدان اور احساس انتہائی گمراہی و جہالت کی حالت میں بھی اسکے اندر سے نہیں نکلتا۔ ان دونوں امتیازی خصوصیات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کی شعوری و اختیاری زندگی کے لیے تعلیم کا طریقہ اس پیدائشی طریق تعلیم سے مختلف ہو جس کے تحت مچھلی کو تیرنا اور پرندے کو اڑنا، اور خود انسانی جسم کے اندر پلک کو جھپکنا، آنکھ کو دیکھنا، کان کو سننا اور معدے کو ہضم کرنا سکھایا گیا ہے۔ انسان خود اپنی زندگی کے اس شعبے میں استاد اور کتاب، مدرسے اور تبلیغ، تحریر و تقریر اور بحث و استدلال جیسے ذرائع ہی کو وسیلہ تعلیم مانتا ہے اور پیدائشی علم و شعور کو کافی نہیں سمجھتا۔ پھر یہ بات آخر کیوں عجیب ہو کہ انسان کے خالق پر اس کی رہنمائی کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اسے ادا کرنے کے لئے اس نے رسول اور کتاب کو تعلیم کا ذریعہ بنایا ہے؟ جیسی مخلوق ویسی ہی اس کی تعلیم۔ یہ سراسر معقول بات ہے "بیان" جس مخلوق کو سکھایا گیا ہو اس کے لیے "قرآن" ہی ذریعہ تعلیم ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی ایسا ذریعہ جو ان مخلوقات کے لیے موزوں ہے جنہیں بیان نہیں سکھایا گیا ہے۔

(ت)

التَّابُوت: (۲/۲۴۸) بائیبل کا بیان اس باب میں قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے تاہم اس سے اصل واقعہ کی تفصیلات پر کافی روشنی پڑتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صندوق، جسے بنی اسرائیل اصطلاحاً "عہد کا صندوق" کہتے تھے، ایک لڑائی کے موقع پر فلسطینی مشرکین نے بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں رکھا گیا تھا، وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں۔ آخر کار انہوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی پر رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا، غالباً اسی معاملے کی طرف قرآن ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے کہ اس وقت وہ صندوق فرشتوں کی حفاظت میں تھا، کیونکہ وہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان کے ہانک دی گئی تھی اور اللہ کے حکم سے یہ فرشتوں ہی کا کام تھا کہ وہ اسے چلا کر بنی اسرائیل کی طرف لے آئے۔ رہا یہ ارشاد کہ "اس صندوق میں تمہارے لئے سکون قلب کا سامان ہے"، تو بائیبل کے بیان سے اس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے، جب وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پوری قوم کی ہمت ٹوٹ گئی اور ہر اسرائیلی یہ خیال کرنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے اور اب ہمارے برے دن آگئے ہیں،۔ پس اس صندوق کا واپس آنا اس قوم کے لیے بڑی تقویت قلب کا موجب تھا اور یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ سکتی تھیں۔

"آل موسیٰ اور آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات" جو اس صندوق میں رکھے ہوئے تھے، ان سے مراد پتھر کی وہ تختیاں ہیں جو طور سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو دی تھیں، اس کے علاوہ تورات کا وہ اصل نسخہ بھی اس میں تھا، جسے حضرت موسیٰ نے خود لکھوا کر بنی لاوی کے سپرد کیا تھا، نیز ایک بوتل میں من بھر کر اس میں رکھ دیا گیا تھا تاکہ آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کریں جو صحرا میں اس نے ان کے باپ دادا پر کیا تھا اور غالباً حضرت موسیٰ کا وہ عصا بھی اس کے اندر تھا جو خدا کے عظیم الشان معجزات کا مظہر بنا تھا۔

تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ: (۱۱۱/۱) کے معنی بعض مفسرین نے "ٹوٹ جائیں ابولہب کے ہاتھ" بیان کیے ہیں اور وتب کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ ہلاک ہو جائے یا وہ ہلاک ہو گیا لیکن در حقیقت یہ کوئی کوسنا نہیں ہے جو اس کو دیا گیا ہو۔ بلکہ ایک پیشین گوئی ہے جس میں آئندہ پیش آنے والی بات کو ماضی کے صیغوں میں بیان کیا گیا ہے گویا اس کا ہونا ایسا یقینی ہے جیسے وہ ہو چکی۔ اور فی الواقع آخر کار وہی کچھ ہوا جو اس سورہ میں چند سال پہلے بیان کیا جا چکا تھا۔ ہاتھ

ٹوٹنے سے مراد ظاہر ہے کہ جسمانی ٹوٹنا نہیں ہے بلکہ کسی شخص کا اپنے اس مقصد میں قطعی ناکام ہو جانا ہے جس کے لئے اس نے اپنا پورا زور لگا دیا ہو اور ابولہب نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو زک دینے کے لئے واقعی اپنا پورا زور لگا دیا تھا لیکن اس سورہ کے نزول پر سات آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ جنگ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام کی دشمنی میں ابولہب کے ساتھ تھے۔ مکہ میں جب اس شکست کی خبر پہنچی تو اس کو اتنا رنج ہوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا، پھر اس کی موت بھی نہایت عبرتناک ہوئی اسے عدسہ (Malignant Pustule) کی بیماری ہو گئی جس کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے اسے چھوڑ دیا کیونکہ انہیں چھوت لگ جانے کا ڈر تھا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور اس کی بو پھیلنے لگی۔ آخر کار جب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے تو ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے کچھ حبشیوں کو اجرت دے کر اس کی لاش اٹھوائی اور انہی مزدوروں نے اس کو دفن کیا اور دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو ڈھکیل کر اس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اسے ڈھانک دیا۔ اس کی مزید اور مکمل شکست اس طرح ہوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لئے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اسی دین کو اس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی درہ ہجرت کر کے مکہ سے مدینے پہنچیں اور اسلام لائیں پھر فتح مکہ کے موقع پر اس کے دونوں بیٹے عتبہ اور معتب حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضورؐ کے سامنے پیش ہوئے اور ایمان لا کر انہوں نے آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کی۔

مُترَفِیهِم : (۲۳/۶۴) ''عیاش'' یہاں مترفین کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ''مترفین'' اصل میں ان لوگوں کو کہتے ہیں جو دنیوی مال و دولت کو پا کر مزے کر رہے ہوں اور خدا و خلق کے حقوق سے غافل ہوں۔ اس لفظ کا صحیح مفہوم لفظ عیاش سے ادا ہو جاتا ہے، بشرطیکہ اسے صرف شہوت رانی کے معنی میں نہ لیا جائے بلکہ عیش کوشی کے وسیع تر معنوں میں لیا جائے۔

فَتَعسًا لَّهُم: (۴۷/۸) اصل الفاظ ہیں ﴿فَتَعسًا لَّهُم﴾۔ تعس ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرنے کو کہتے ہیں۔

تَفَثَهُم: (۲۲/۲۹) یعنی یوم النحر (۱۰ ذی الحجہ) کو قربانی سے فارغ ہو کر احرام کھول دیں، حجامت کرائیں، نہائیں، دھوئیں اور وہ پابندیاں ختم کر دیں جو احرام کی حالت میں عائد ہو گئی تھیں۔ لغت میں تفث کے اصل معنی اس غبار اور میل کچیل کے ہیں جو سفر میں آدمی پر چڑھ جاتا ہے۔ مگر حج کے سلسلے میں جب میل کچیل دور کرنے کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا مطلب وہی لیا جائے گا جو اوپر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ حاجی جب تک مناسک حج اور قربانی سے فارغ نہ ہو جائے وہ نہ بال ترشوا سکتا ہے، نہ ناخن کٹوا سکتا ہے اور نہ جسم کی دوسری صفائی کر سکتا ہے۔ (اس سلسلہ

میں یہ بات جان لینی چاہیے کہ قربانی سے فراغت کے بعد دوسری تمام پابندیاں تو ختم ہو جاتی ہیں، مگر بیوی کے پاس جانا اس وقت تک جائز نہیں ہوتا جب تک آدمی طواف افاضہ نہ کرلے)۔

اَلتَّنُّوْر: (۲۳/۲۷) بعض لوگوں نے تنور سے مراد زمین لی ہے، بعض نے زمین کا بلند ترین حصہ مراد لیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ فار التنور کا مطلب طلوع فجر ہے اور بعض کی رائے میں یہ حمی الوطیس کی طرح ایک استعارہ ہے "ہنگامہ گرم ہو جانے" کے معنی میں لینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ قرآن کے الفاظ کو بغیر کسی قرینے کے مجازی معنوں میں لیا جائے جبکہ ظاہری مفہوم لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ یہ الفاظ پڑھ کر ابتداء جو مفہوم ذہن میں آتا ہے وہ یہی ہے کہ کوئی خاص تنور پہلے سے نامزد کردیا گیا تھا کہ طوفان کا آغاز اس کے نیچے سے پانی ابلنے پر ہوگا۔ دوسرے کوئی معنی سوچنے کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جبکہ آدمی یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہو کہ اتنا بڑا طوفان ایک تنور کے نیچے سے پانی ابل پڑنے پر شروع ہوا ہوگا۔ مگر خدا کے معاملات عجیب ہیں۔ وہ جب کسی قوم کی شامت لاتا ہے تو ایسے رخ سے لاتا ہے جدھر اس کا وہم و گمان بھی نہیں جاسکتا۔

تَائِبَات: (۶۶/۵) تائب کا لفظ جب آدمی کی صفت کے طور پر آئے تو اس کے معنی بس ایک ہی دفعہ توبہ کرلینے والے کے نہیں ہوتے بلکہ ایسے شخص کے ہوتے ہیں جو ہمیشہ اللہ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگتا رہے، جس کا ضمیر زندہ اور بیدار ہو، جسے ہر وقت اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کا احساس ہوتا رہے اور وہ ان پر نادم و شرمسار ہو۔ ایسے شخص میں کبھی غرور و تکبر اور نخوت و خود پسندی کے جذبات پیدا نہیں ہوتے بلکہ وہ طبعاً نرم مزاج اور حلیم ہوتا ہے۔

فَتَابَ عَلَیه: (۲/۳۷) توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں۔ بندہ کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آ گیا، طریق بندگی کی طرف پلٹ آیا اور خدا کی طرف توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہو گیا، پھر سے نظر عنایت اس کی طرف مائل ہو گئی۔

تُبْتُ: (۴/۱۸) توبہ کے معنی پلٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں، گناہ کے بعد بندے کا خدا سے توبہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک غلام جو اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا تھا اب اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرماں برداری کی طرف پلٹ آیا ہے اور خدا کی طرف سے بندے پر توبہ یہ معنی رکھتی ہے کہ غلام کی طرف سے مالک کی نظر عنایت جو پھر گئی تھی وہ از سر نو اس کی طرف منعطف ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ میرے ہاں معافی صرف ان بندوں کے لیے ہے جو قصداً نہیں بلکہ نادانی کی بنا پر قصور کرتے ہیں اور جب آنکھوں پر سے جہالت کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ایسے بندے جب بھی اپنی غلطی پر نادم ہو کر اپنے آقا کی طرف پلٹیں گے اس کا دروازہ کھلا پائیں کہ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

مگر توبہ ان کے لیے نہیں ہے جو اپنے خدا سے بے خوف ہو کر اور بے پرواہو کر تمام عمر گناہ پر گناہ کیے چلے جائیں اور پھر عین اس وقت جب کہ موت کا فرشتہ سامنے کھڑا ہو معافی مانگنے لگیں۔ اسی مضمون کو نبی ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ان اللہ یقبل توبة العبد ما لم یغرغر، ''اللہ بندے کی توبہ بس اسی وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ آثار موت شروع نہ ہوں'' کیوں کہ امتحان کی مہلت جب پوری ہو گئی اور کتاب زندگی ختم ہو چکی تو اب پلٹنے کا کون سا موقع ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کفر کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جائے اور دوسری زندگی کی سرحد میں داخل ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے جو وہ دنیا میں سمجھتا رہا تو اس وقت معافی مانگنے کا کوئی موقع نہیں۔

التَّآئِبُونَ : (۹/ ۱۱۲) متن میں لفظ التائبون استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ ''توبہ کرنے والے'' ہے لیکن جس انداز کلام میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ توبہ کرنا اہل ایمان کی مستقل صفات میں سے ہے، اس لیے اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ توبہ نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ کرتے رہتے ہیں، اور توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے یا پلٹنے کے ہیں، لہذا اس لفظ کی حقیقی روح ظاہر کرنے کے لیے ہم نے اس کا تشریحی ترجمہ یوں کیا ہے کہ ''وہ اللہ کی طرف بار بار پلٹتے ہیں''، مومن اگرچہ اپنے پورے شعور وارادہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے نفس ومال کی بیع کا معاملہ طے کرتا ہے، لیکن چونکہ ظاہر حال کے لحاظ سے محسوس یہی ہوتا ہے کہ نفس اس کا اپنا ہے اور مال اس کا اپنا ہے اور یہ بات کہ اس نفس ومال کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے ایک امر محسوس نہیں بلکہ محض ایک امر معقول ہے، اس لیے مومن کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جبکہ وہ عارضی طور پر خدا کے ساتھ اپنے معاملہ بیع کو بھول جاتا ہے اور اس سے غافل ہو کر کوئی خود مختارانہ عمل اختیار کر بیٹھتا ہے۔ مگر ایک حقیقی مومن کی صفت یہ ہے کہ جب بھی اس کی یہ عارضی بھول دور ہوتی ہے اور وہ اپنی غفلت سے چونکتا ہے اور اس کو یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کر گزرا ہے تو اسے ندامت لاحق ہوتی ہے، شرمندگی کے ساتھ وہ اپنے خدا کی طرف پلٹتا ہے، معافی مانگتا ہے اور اپنے عہد کو پھر سے تازہ کر لیتا ہے۔ یہی بار بار کی توبہ اور یہی رہ رہ کر خدا کی طرف پلٹنا اور ہر لغزش کے بعد وفاداری کی راہ پر واپس آنا ہی ایمان کے دوام وثبات کا ضامن ہے، ورنہ انسان جن بشری کمزوریوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے ان کی موجودگی میں تو یہ بات اس کے بس میں نہیں ہے کہ خدا کے ہاتھ ایک دفعہ نفس مال بیچ دینے کے بعد ہمیشہ کامل شعوری حالت میں وہ اس بیع کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے اور کسی وقت بھی غفلت ونسیان اس پر طاری نہ ہونے پائے، اسی لیے اللہ تعالیٰ مومن کی تعریف میں یہ نہیں فرماتا کہ وہ بندگی کی راہ پر آ کر کبھی اس سے پھسلتا

ہی نہیں ہے بلکہ اس کی قابل تعریف صفت یہ قرار دیتا ہے کہ وہ پھسل پھسل کر بار بار اسی راہ کی طرف آتا ہے اور یہی وہ بڑی سے بڑی خوبی ہے جس پر انسان قادر ہے۔

تَوْبَةً نَّصُوْحًا: (۸/۶۶) اصل میں توبہ نصوحا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ نصح کے معنی عربی زبان میں خلوص اور خیر خواہی کے ہیں۔ خالص شہد کو عسل ناصح کہتے ہیں جس کو موم اور دوسری آلائشوں سے پاک کر دیا گیا ہو۔ پھٹے ہوئے کپڑے کو سی دینے اور ادھڑے ہوئے کپڑے کی مرمت کر دینے کے لئے نصاحۃ الثوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پس توبہ کو نصوح کہنے کا مطلب لغت کے اعتبار سے یا تو یہ ہو گا کہ آدمی ایسی خالص توبہ کرے جس میں ریا اور نفاق کا شائبہ تک نہ ہو۔ یا یہ کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ خیر خواہی کرے اور گناہ سے توبہ کر کے اپنے آپ کو بدانجامی سے بچالے۔ یا یہ کہ گناہ سے اس کے دین میں جو شگاف پڑ گیا ہے توبہ کے ذریعہ سے اس کی اصلاح کر دے، یا یہ کہ توبہ کر کے وہ اپنی زندگی کو اتنا سنوار لے کہ دوسروں کے لیے وہ نصیحت کا موجب ہو اور اسکی مثال کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اسی کی طرح اصلاح کر لیں۔ یہ تو ہیں توبہ نصوح کے وہ مفہومات جو اسکے لغوی معنوں سے مترشح ہوتے ہیں۔

التَّوْرٰةَ: (۳/۳) عام طور پر لوگ تورات سے مراد بائبل کے پرانے عہد نامے کی ابتدائی پانچ کتابیں اور انجیل سے مراد نئے عہد نامے کی چار مشہور انجیلیں لے لیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ الجھن پیش آتی ہے کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلام الٰہی ہیں اور کیا واقعی قرآن ان سب باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان میں درج ہیں لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ تورات بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ان کے اندر مندرج ہے۔ اور انجیل نئے عہد نامہ کی اناجیل اربعہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

دراصل تورات سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران میں ان پر نازل ہوئے ان میں سے دس احکام تو وہ تھے جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کندہ کر کے انہیں دیے تھے، باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰ نے لکھوا کر اس کی بارہ نقلیں بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں کو دے دی تھیں اور ایک نقل بنی لاوی کے حوالے کی تھی تا کہ وہ اس کی حفاظت کریں، اسی کتاب کا نام ''تورات'' تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المقدس کی پہلی تباہی کے وقت محفوظ تھی۔ اس کی ایک کاپی جو بنی لاوی کے حوالے کی گئی تھی پتھر کی لوحوں سمیت، عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی اور بنی اسرائیل اس کو ''توریت'' ہی کے نام سے جانتے تھے لیکن اس سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکل سلیمانی کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سجادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) خلقیاہ کو ایک جگہ توریت رکھی ہوئی مل گئی تھی اور اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی منشی کو دیا اور شاہی منشی

نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہے۔ (ملاحظہ ہو سلاطین، باب ۲۲، آیت ۸ تا ۱۳) یہی وجہ ہے کہ جب بخت نصر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو بنی اسرائیل نے تورات کے وہ اصل نسخے جو ان کے ہاں طاق نسیاں پر رکھے ہوئے تھے اور بہت تھوڑی تعداد میں تھے ہمیشہ کے لیے گم کر دیے پھر جب عزرا کاہن (عزیر) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کھچے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المقدس تعمیر ہوا، تو عزرا نے اپنی قوم کے چند دوسرے بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مرتب کی، جواب بائبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب، یعنی خروج، احابر، گنتی اور استثنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں اور اس سیرت ہی میں تاریخ نزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسب موقع درج کر دی گئی ہیں جو عزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہو سکیں، پس دراصل اب تورات ان منتشر اجزا کا نام ہے، جو سیرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر بکھرے ہوئے ہیں، ہم انہیں صرف اس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اس تاریخی بیان کے دوران میں جہاں کہیں سیرت موسوی کا مصنف کہتا ہے کہ خدا نے موسیٰ سے یہ فرمایا، یا موسیٰ نے کہا کہ خداوند تمہارا خدا یہ کہتا ہے۔ وہاں سے تورات کا ایک جز شروع ہوتا ہے اور جہاں پھر سیرت کی تقریر شروع ہو جاتی ہے وہاں وہ جز ختم ہو جاتا ہے بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز بائبل کے مصنف نے تفسیر و تشریح کے طور پر بڑھادی ہے، وہاں ایک عام آدمی کے لیے یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصہ ہے یا شرح و تفسیر، تاہم جو لوگ کتب آسمانی میں بصیرت رکھتے ہیں وہ ایک حد تک صحت کے ساتھ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان اجزا میں کہاں کہاں تفسیری و تشریحی اضافے ملحق کر دئے گئے ہیں۔

قرآن انہیں منتشر اجزا کو ''تورات'' کہتا ہے اور انہیں کی وہ تصدیق کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان اجزا کو جمع کر کے جب قرآن سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو بجز اس کے کہ بعض بعض مقامات پر جزوی احکام میں اختلاف ہے، اصولی تعلیمات میں دونوں کتابوں کے درمیان یک سر مو فرق نہیں پایا جاتا۔ آج بھی ایک ناظر صریح طور پر محسوس کر سکتا ہے کہ یہ دونوں چشمے ایک ہی منبع سے نکلے ہوئے ہیں۔

التِّین: (۹۵/۱) اس کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہوا ہے۔ حسن بصری عکرمہ، عطاء بن ابی رباح، جابر بن زید، مجاہد اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انجیر سے مراد یہی انجیر ہے جسے لوگ کھاتے ہیں اور زیتون بھی یہی زیتون ہے جس سے تیل نکالا جاتا ہے۔ ابن ابی حاتم اور حاکم نے ایک قول حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی اس کی تائید میں نقل کیا ہے اور جن مفسرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے انہوں نے انجیر اور زیتون کے خواص اور فوائد بیان کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہی خوبیوں کی وجہ سے ان دونوں پھلوں کی قسم کھائی ہے اس

میں شک نہیں ہے کہ ایک عام عربی داں تین اور زیتون کے الفاظ سن کر وہی معنی لے گا جو عربی زبان میں معروف ہیں لیکن دو وجوہ ایسے ہیں جو یہ معنی لینے میں مانع ہیں۔ ایک یہ کہ آگے طور سینا اور شہر مکہ کی قسم کھائی گئی ہے اور دو پھلوں کے ساتھ دو مقامات کی قسم کھانے میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ دوسرے ان چار چیزوں کی قسم کھا کر آگے جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس پر طور سینا اور شہر مکہ تو دلالت کرتے ہیں لیکن یہ دو پھل اس پر دلالت نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں بھی کسی چیز کی قسم کھائی ہے اس کی عظمت یا اسکے منافع کی بات پر نہیں کھائی بلکہ ہر قسم اس مضمون پر دلالت کرتی ہے جو قسم کھانے کے بعد بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ان دونوں پھلوں کے خواص کو وجہ قسم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بعض دوسرے مفسرین نے تین اور زیتون سے مراد بعض مقامات لئے ہیں۔ کعب احبار، قتادہ اور ابن زید کہتے ہیں کہ تین سے مراد دمشق اور زیتون سے مراد بیت المقدس۔ ابن عباس کا ایک قول ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے یہ نقل کیا ہے کہ تین سے مراد حضرت نوح کی وہ مسجد ہے جو انہوں نے جودی پہاڑ پر بنائی تھی اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے لیکن ﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ﴾ کے الفاظ سن کر یہ معنی ایک عام عرب کے ذہن میں نہیں آسکتے تھے اور نہ یہ بات قرآن کے مخاطب اہل عرب میں معروف تھی کہ تین اور زیتون ان مقامات کے نام ہیں۔

البتہ یہ طریقہ اہل عرب میں رائج تھا کہ جو پھل کسی علاقے میں کثرت سے پیدا ہوتا ہو اس علاقے کو وہ بسا اوقات اس پھل کے نام سے موسوم کردیتے تھے۔ اس محاورے کے لحاظ سے تین اور زیتون کے الفاظ کا مطلب منابت تین و زیتون، یعنی ان پھلوں کی پیداوار کا علاقہ ہوسکتا ہے اور وہ شام و فلسطین کا علاقہ ہے کیونکہ اس زمانے کے اہل عرب میں یہی علاقہ انجیر اور زیتون کی پیداوار کے لئے مشہور تھا۔ ابن تیمیہ، ابن القیم، زمخشری اور آلوسی رحمھم اللہ نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے، اور ابن جریر نے بھی اگرچہ پہلے قول کو ترجیح دی ہے مگر اس کے ساتھ یہ بات تسلیم کی ہے کہ تین و زیتون سے مراد ان پھلوں کی پیداوار کا علاقہ بھی ہوسکتا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اس تفسیر کو قابل لحاظ سمجھا ہے۔

(ث)

ثُعبَان: (۲۶/۳۲) قرآن مجید میں کسی جگہ اس کے لئے حیۃ (سانپ) اور کسی جگہ جآن (جو بالعموم چھوٹے سانپ کے لئے بولا جاتا ہے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور یہاں اسے ثعبان (اژدھا) کہا جارہا ہے۔ اس کی توجیہ امام رازی اس طرح کرتے ہیں کہ حیۃ عربی زبان میں سانپ کی جنس کے لیے مشترک نام ہے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا

الثَّقَلٰن : (۵۵/۳۱) اصل میں لفظ ثقلان استعمال ہوا ہے جس کا مادہ ثقل ہے۔ ثقل کے معنی بوجھ کے ہیں اور ثقل اس بار کو کہتے ہیں جو سواری پر لدا ہوا ہو۔ ثقلین کا لفظی ترجمہ ہوگا "لدے ہوئے بوجھ"۔ اس جگہ یہ لفظ جن وانس کے لیے استعمال ہوتا چلا آرہا ہے جو اپنے رب کی طاعت وبندگی سے منحرف ہیں اور آگے بھی آیت ۴۵ تک وہی مخاطب ہیں، اس لیے ان کو ایھا الثقلان کہہ کر خطاب فرمایا گیا ہے۔ گویا خالق اپنی مخلوق کے ان دونوں نالائق گروہوں سے فرمارہا ہے کہ اے وہ لوگو جو میری زمین پر بار بنے ہوئے ہو، عنقریب میں تمہاری خبر لینے کے لئے فارغ ہوا جاتا ہوں۔

ثَمُود: (۷/۷۳) یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور ومعروف ہے، نزول قرآن سے پہلے اس کے قصے اہل عرب میں زبان زدِ عام تھے، زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت اس کا ذکر ملتا ہے، اسیریا کے کتبات اور یونان، اسکندریہ اور روم کے قدیم مورخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کے خلاف لڑے جن سے ان کی دشمنی تھی۔

اس قوم کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحجر کے نام سے موسوم ہے، موجودہ زمانہ میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جسے مدائن صالح کہتے ہیں، یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانہ میں حجر کہلاتا تھا، اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ رقبے میں وہ سنگی عمارتیں موجود ہیں جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا اور اس شہر خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی، نزول قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ نبی ﷺ غزوہ تبوک کے موقع پر جب ادھر سے گزرے تو آپؐ نے ایک کنویں کی نشان دہی کرکے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں سے پانی لینا، باقی کنوؤں کا پانی نہ پینا۔ ایک

پہاڑی درے کود کھا کر آپؐ نے بتایا کہ اسی درے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لئے آتی تھی، چنانچہ وہ مقام آج بھی فج الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کھنڈروں میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے ان کو آپؐ نے جمع کیا اور ان کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا، لہذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ، یہ سیر گاہ نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔

سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ : (۱۵/۸۷) یعنی سورہ فاتحہ کی آیات، اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے مراد وہ سات بڑی بڑی سورتیں بھی لی ہیں جن میں دو سو آیتیں ہیں، یعنی البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف، اور یونس یا انفال و توبہ، لیکن سلف کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ اس سے سورہ فاتحہ ہی مراد ہے بلکہ امام بخاری نے دو مرفوع روایتیں بھی اس امر کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ خود نبی علیہ السلام نے سبع مثانی سے مراد سورہ فاتحہ بتائی ہے۔

ثَوَابَ الدُّنیا وثَوابَ الأٰخِرَة: (۳/۱۴۵) ثواب کے معنی ہیں نتیجہ عمل، ثواب دنیا سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجہ میں اسی دنیا کی زندگی میں حاصل ہوں اور ثواب آخرت سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو اسی سعی و عمل کے نتیجہ میں آخرت کی پائیدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔ اسلام کے نقطہ نظر سے انسانی اخلاق کے معاملہ میں فیصلہ کن سوال یہی ہے کہ کارزار حیات میں آدمی جو دوڑ دھوپ کر رہا ہے اس میں آیا وہ دنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا اخروی نتائج پر۔

(ج)

الجِبتِ: (۴/۵۱) جبت کے اصل معنی بے حقیقت، بے اصل اور بے فائدہ چیز کے ہیں، اسلام کی زبان میں جادو، کہانت (جوتش) فال گیری، ٹونے ٹوٹکے، شگون اور مہورت اور تمام دوسری وہمی و خیالی باتوں کو "جبت" سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ حدیث میں آیا ہے **النیاقة والطرق والطیر من الجبت**، یعنی جانوروں کی آوازوں سے فال لینا، زمین پر جانوروں کے نشانات قدم سے شگون نکالنا اور فال گیری کے دوسرے طریقے سب "جبت" کے قبیل سے ہیں۔ پس "جبت" کا مفہوم وہی ہے جسے ہم اردو زبان میں اوہام کہتے ہیں اور جس کے لیے انگریزی میں (Superstitions) کالفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

الجَبَّار: (۵۹/ ۲۳) اصل میں لفظ الجبار استعمال ہوا ہے جس کا مادہ جبر ہے۔ جبر کے معنی ہیں کسی شئے کو طاقت سے درست کرنا، کسی چیز کی بزور اصلاح کرنا۔ اگرچہ عربی زبان میں کبھی جبر محض اصلاح کیلئے بھی بولا جاتا ہے اور کبھی صرف زبردستی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کا حقیقی مفہوم اصلاح کے لئے طاقت کا استعمال ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کو جبار اس معنی میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنی کائنات کا نظم بزور درست رکھنے والا اور اپنے ارادے کو، جو سراسر حکمت پر مبنی ہوتا ہے، جبراً نافذ کرنے والا ہے، علاوہ بریں لفظ جبار میں عظمت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ عربی زبان میں کھجور کے اس درخت کو جبار کہتے ہیں جو اتنا بلند و بالا ہو کہ اس کے پھل توڑنا کسی کے لئے آسان نہ ہو۔ اسی طرح کوئی کام جو بڑا عظیم الشان ہو عمل جبار کہلاتا ہے۔

یُجَادِلُنَا: (۱۱/ ۷۴) "جھگڑے" کا لفظ اس موقع پر اس انتہائی محبت اور ناز کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو حضرت ابراہیم اپنے خدا کے ساتھ رکھتے تھے، اس لفظ سے یہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان بڑی دیر تک ردو کد جاری رہتی ہے، بندہ اصرار کر رہا ہے کہ کسی طرح قوم لوط پر سے عذاب ٹال دیا جائے، خدا جواب میں کہہ رہا ہے کہ یہ قوم اب خیر سے بالکل خالی ہو چکی ہے اور اس کے جرائم اس حد میں داخل ہو چکے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت کی جاسکے، مگر بندہ ہے کہ پھر یہی کہے جاتا ہے کہ "پروردگار، اگر کچھ تھوڑی سی بھلائی بھی اس میں باقی ہو تو اسے اور ذرا مہلت دیدے، شاید کہ وہ بھلائی پھل لے آئے۔" بائبل میں اس جھگڑے کی کچھ تشریح بھی بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کا مجمل بیان اپنے اندر اس سے زیادہ معنوی وسعت رکھتا ہے۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب پیدائش، باب ۱۸، آیت ۲۳-۳۲)۔

جُرُف: (۹/ ۱۰۹) متن میں لفظ "جرف" استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق عربی زبان میں کسی

ندی یا دریا کے اس کنارے پر ہوتا ہے جس کے نیچے کی مٹی کو پانی نے کاٹ کاٹ کر بہادیا اور اوپر کا حصہ بے سہارا کھڑا ہو، یہ لوگ اپنے عمل کی بنیاد خدا سے بے خوفی اور اس کی رضا سے بے نیازی پر رکھتے ہیں اور ان کی تعمیر حیات کو یہاں اس عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایسے ایک کھوکھلے بے ثبات کنارۂ دریا پر اٹھائی گئی ہو۔ یہ ایک بے نظیر تشبیہ ہے جس سے زیادہ بہتر طریقہ سے اس صورت حال کی نقشہ کشی نہیں کی جاسکتی۔

الجٰرِیٰتِ یُسْرًا: (۵۱/۳) اَلْجَارِیَاتِ یُسْراً اور اَلْمُقَسِّمَاتِ اَمْراً کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے یا یہ مفہوم لینا جائز رکھا ہے کہ ان دونوں سے مراد بھی ہوائیں ہی ہیں یعنی یہی ہوائیں پھر بادلوں کو لے کر چلتی ہیں اور پھر روئے زمین کے مختلف حصوں میں پھیل کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جہاں جتنا حکم ہوتا ہے پانی تقسیم کرتی ہیں۔ دوسرے گروہ نے الجاریات یسرا سے مراد سبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی کشتیاں لی ہیں اور المقسمات امرا سے مراد وہ فرشتے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات کے نصیب کی چیزیں ان میں تقسیم کرتے ہیں۔

الجِزْیَۃ: (۹/۲۹) جزیہ بدل ہے اس امان اور اس حفاظت کا جو ذمیوں کو اسلامی حکومت میں عطا کی جائے گی۔ نیز وہ علامت ہے اس امر کی کہ یہ لوگ تابع امر بننے پر راضی ہیں۔ "ہاتھ سے جزیہ دینے" کا مفہوم سیدھی طرح مطیعانہ شان کے ساتھ جزیہ ادا کرنا ہے۔ اور چھوٹے بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں بڑے وہ نہ ہوں بلکہ وہ اہل ایمان بڑے ہوں جو خلافتِ الٰہی کا فرض انجام دے رہے ہوں

ابتداءً یہ حکم یہود و نصاریٰ کے متعلق دیا گیا تھا، لیکن آگے چل کر خود نبی ﷺ نے مجوس سے جزیہ لے کر انہیں ذمّی بنایا اور اس کے بعد صحابہ کرام نے بالاتفاق بیرون عرب کی تمام قوموں پر اس حکم کو عام کردیا۔

یہ جزیہ وہ چیز ہے جس کے لئے بڑی بڑی معذرتیں اُنیسویں صدی عیسوی کے دورِ مذلّت میں مسلمانوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں اور اُس دور کی یادگار کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں جو صفائی دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن خدا کا دین اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ اسے خدا کے باغیوں کے سامنے معذرت پیش کرنے کی کوئی حاجت ہو۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو اختیار نہیں کرتے اور اپنی یا دوسروں کی نکالی ہوئی غلط راہوں پر چلتے ہیں وہ حد سے حد بس اتنی ہی آزادی کے مستحق ہیں کہ خود جو غلطی کرنا چاہتے ہیں کریں، لیکن انہیں اس کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی اقتدار و فرمانروائی کی باگیں ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام اپنی گمراہیوں کے مطابق قائم کریں اور چلائیں۔ یہ چیز جہاں کہیں ان کو حاصل ہو گی، فساد رونما ہو گا اور اہل ایمان کا فرض ہو گا کہ ان کو اس سے بے دخل کرنے اور انہیں نظام صالح کا مطیع بنانے کی کوشش کریں۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ جزیہ

آخر کس چیز کی قیمت ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس آزادی کی قیمت ہے جو انہیں اسلامی اقتدار کے تحت اپنی گمراہیوں پر قائم رہنے کے لئے دی جاتی ہے، اور اس قیمت کو اس صالح نظام حکومت کے نظم و نسق پر صرف ہونا چاہیے جو انہیں اس آزادی کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جزیہ ادا کرتے وقت ہر سال ذمیوں میں یہ احساس تازہ ہوتا رہے گا کہ خدا کی راہ میں زکوٰۃ دینے کے شرف سے محرومی اور اس کے بجائے گمراہیوں پر قائم رہنے کی قیمت ادا کرنا کتنی بڑی بدقسمتی ہے جس میں وہ مبتلا ہیں۔

جُنُبًا: (۴۳/۴) جنابت کے اصل معنی دوری اور بیگانگی کے ہیں۔ اسی سے لفظ اجنبی نکلا ہے، اصطلاح شرع میں جنابت سے مراد وہ نجاست ہے جو قضاء شہوت یا خواب میں مادہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔

جَنَّةُ الْمَاوٰی: (۱۵/۵۳) ''جنت الماویٰ'' کے لغوی معنی ہیں ''وہ جنت جو قیام گاہ بنے'' حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ یہ وہی جنت ہے جو آخر میں اہل ایمان و تقویٰ کو ملنے والی ہے اور اسی آیت سے انہوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ وہ جنت آسمان میں ہے۔ قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہ وہ جنت ہے جس میں شہداء کی ارواح رکھی جاتی ہیں، اس سے مراد وہ جنت نہیں ہے جو آخرت میں ملنے والی ہے۔ ابن عباس بھی یہی کہتے ہیں اور اس پر وہ یہ اضافہ بھی کرتے ہیں کہ آخرت میں یہ جو جنت اہل ایمان کو دی جائے گی وہ آسمان میں نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ یہی زمین ہے۔

جَنّٰتٍ مَّعْرُوشَاتٍ: (۱۴۱/۶) اصل میں ''جنّٰت معروشات و غیر معروشات'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے مراد دو طرح کے باغ ہیں، ایک وہ جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں دوسرے وہ جن کے درخت خود اپنے تنوں پر کھڑے رہتے ہیں، ہماری زبان میں باغ کا لفظ صرف دوسری قسم کے باغ کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے ہم نے جنّٰت غیر معروشات کا ترجمہ ''باغ'' کیا ہے اور جنّٰت معروشات کے لیے ''تاکستان'' (یعنی انگوری باغ) کا لفظ اختیار کیا ہے۔

جَنَّتٰنِ: (۴۶/۵۵) جنت کے اصل معنی باغ کے ہیں۔ قرآن مجید میں کہیں تو اس پورے عالم کو جس میں نیک لوگ رکھے جائیں گے جنت کہا گیا ہے، گویا کہ وہ پورا کا پورا ایک باغ ہے اور کہیں فرمایا گیا ہے کہ ان کے لئے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس بڑے باغ میں بے شمار باغات ہوں گے اور یہاں تعین کے ساتھ ارشاد ہوا ہے کہ ہر نیک شخص کو اس بڑی جنت میں دو دو جنتیں دی جائیں گی جو اسی کے لئے مخصوص ہوں گی، جن میں اس کے اپنے قصر ہوں گے، جن میں وہ اپنے متعلقین اور خدام کے ساتھ شاہانہ ٹھاٹھ کے ساتھ رہے گا، جن میں اس کے لئے وہ کچھ سرو سامان فراہم ہوگا جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

الجِنِّ: (۱۲۸/۶) یہاں جنوں سے مراد شیاطین جن ہیں۔

الجِنة: (۱۵۸/۳۷) اصل میں ملائکہ کے بجائے الجنہ کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن بعض

اکابر مفتیان کا خیال ہے کہ یہاں جن کا لفظ اپنے لغوی مفہوم (پوشیدہ مخلوق) کے لحاظ سے ملائکہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ ملائکہ بھی اصلاً ایک پوشیدہ مخلوق ہی ہیں۔ اور بعد کا مضمون اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں الجنۃ کے لفظ کو ملائکہ کے معنی میں لیا جائے۔

جنٌّ: (۳۴/۴۱) اس فقرے میں جن سے مراد شیاطین جن ہیں۔

جَاهِدُوا: (۲۲/۷۸) جہاد سے مراد محض قتال (جنگ) نہیں ہے بلکہ یہ لفظ جد و جہد اور کشمکش اور انتہائی سعی و کوشش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ پھر جہاد اور مجاہد میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ مزاحمت کرنے والی کچھ طاقتیں ہیں جن کے مقابل میں یہ جد و جہد مطلوب ہے اور اس کے ساتھ فی اللہ کی قید یہ متعین کر دیتی ہے کہ مزاحمت کرنے والی طاقتیں وہ ہیں جو اللہ کی بندگی اور اس کی رضاجوئی میں اور اس کی راہ پر چلنے میں مانع ہیں اور جد و جہد کا مقصود یہ ہے کہ ان کی مزاحمت کو شکست دے کر آدمی خود بھی اللہ کی ٹھیک بندگی کرے اور دنیا میں بھی اس کا کلمہ بلند اور کفر و الحاد کے کلمے پست کر دینے کے لیے جان لڑا دے۔ اس مجاہدے کا اولین ہدف آدمی کا اپنا نفس امارہ ہے جو ہر وقت خدا سے بغاوت کرنے کے لئے زور لگاتا رہتا ہے اور آدمی کو ایمان و طاعت کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب تک اس کو مسخر نہ کر لیا جائے۔ باہر کسی مجاہدے کا امکان نہیں ہے۔ اسی لیے ایک جنگ سے واپس آنے والے غازیوں سے نبی ﷺ نے فرمایا "قدمتم خیر مقدم من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر"۔ تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آگئے ہو" عرض کیا گیا وہ بڑا جہاد کیا ہے؟ فرمایا "مجاهدة العبد هواه" آدمی کی خود اپنی خواہش نفس کے خلاف جد و جہد" اس کے بعد جہاد کا وسیع ترمیدان پوری دنیا میں ہے جس میں کام کرنے والی تمام بغاوت کیش اور بغاوت آموز اور بغاوت انگیز طاقتوں کے خلاف دل اور دماغ، جسم اور مال ساری قوتوں کے ساتھ سعی و جہد کرنا وہ حق جہاد ہے جسے ادا کرنے کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

جِهَادًا كَبِيرًا: (۲۵/۵۲) جہاد کبیر کے تین معنی ہیں۔ ایک انتہائی کوشش جس میں آدمی سعی و جاں فشانی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ دوسرے، بڑے پیمانے پر جد و جہد جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لا کر ڈال دے۔ تیسرے، جامع جد و جہد جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے، جس جس محاذ پر غنیم کی طاقتیں کام کر رہی ہوں اس پر اپنی طاقت بھی لگا دے اور جس جس پہلو سے بھی حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہو کرے۔ اس میں زبان و قلم کا جہاد بھی شامل ہے اور توپ و تفنگ کا بھی۔

جَاهِدُوا: (۵/۳۵) اصل میں لفظ جاهدوا استعمال فرمایا گیا ہے جس کا مفہوم محض "جد وجہد" سے پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ مجاہدہ کا لفظ مقابلہ کا مقتضی ہے اور اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو قوتیں اللہ کی راہ میں مزاحم ہیں جو تم کو خدا کی مرضی کے مطابق چلنے سے روکتی اور اس کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں، جو تم کو پوری طرح خدا کا بندہ بن کر نہیں رہنے دیتیں اور

تمہیں اپنا یا کسی غیر اللہ کا بندہ بننے پر مجبور کرتی ہیں، ان کے خلاف اپنی تمام امکانی طاقتوں سے کشمکش اور جدوجہد کرو، اسی جدوجہد پر تمہاری فلاح و کامیابی کا اور خدا سے تمہارے تقرب کا انحصار ہے۔

اس طرح یہ آیت بندہ مومن کو ہر محاذ پر چومکھی لڑائی لڑنے کی ہدایت کرتی ہے۔ایک طرف ابلیس لعین اور اس کا شیطانی لشکر ہے۔دوسری طرف آدمی کا اپنا نفس اور اس کی سرکش خواہشات ہیں۔ تیسری طرف خدا سے پھرے ہوئے بہت سے انسان ہیں جن کے ساتھ آدمی ہر قسم کے معاشرتی، تمدنی اور معاشی تعلقات میں بندھا ہوا ہے، چوتھی طرف وہ غلط مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام ہیں جو خدا سے بغاوت پر قائم ہوئے ہیں اور بندگی حق کے بجائے بندگی باطل پر انسان کو مجبور کرتے ہیں۔ان سب کے حربے مختلف ہیں مگر سب کی ایک ہی کوشش ہے کہ آدمی کو خدا کے بجائے اپنا مطیع بنائیں۔ بخلاف اس کے آدمی کی ترقی اور تقرب خداوندی کے مقام تک اس کے عروج کا انحصار بالکلیہ اس پر ہے کہ وہ سراسر خدا کا مطیع اور باطن سے لے کر ظاہر تک خالصۃً اس کا بندہ بن جائے، لہٰذا اپنے مقصود تک اس کا پہنچنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان تمام مانع و مزاحم قوتوں کے خلاف بیک وقت جنگ آزما ہو، ہر وقت ہر حال میں ان سے کشمکش کرتا رہے اور ان ساری رکاوٹوں کو پامال کرتا ہوا خدا کی راہ میں بڑھتا چلا جائے۔

جَاهَدُوا: (۲/۲۱۸) جہاد کے معنی ہیں کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دینا، یہ محض جنگ کا ہم معنی نہیں ہے، جنگ کے لیے تو "قتال" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے، مجاہد وہ شخص ہے جو ہر وقت اپنے مقصد کی دھن میں لگا ہو۔دماغ سے اسی کے لئے تدبیریں سوچے، زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لئے دوڑ دھوپ اور محنت کرے، اپنے تمام امکانی وسائل اس کو فروغ دینے میں صرف کر دے، اور ہر اس مزاحمت کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے، حتی کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے، اس کا نام ہے "جہاد"۔ جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لئے اور اس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلمہ سارے کلموں پر غالب ہو جائے اس کے سوا اور کوئی غرض مجاہد کے پیش نظر نہ ہو۔

تَجْهَلُونَ: (۲۷/۵۵) جہالت کا لفظ یہاں حماقت اور سفاہت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اردو زبان میں بھی ہم گالی گلوچ اور بیہودہ حرکات کرنے والے کو کہتے ہیں کہ وہ جہالت پر اتر آیا ہے۔اسی معنی میں یہ لفظ عربی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

الجَاهِلِيَّة: (۵/۵۰) جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے، اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اور اسکے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے، عرب کے زمانہ قبل

اسلام کو جاہلیت کا دور اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں علم کے بغیر محض وہم یا قیاس و گمان یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لیے زندگی کے طریقے مقرر کر لیے تھے، یہ طرز عمل جہاں جس دور میں بھی انسان اختیار کریں اسے بہر حال جاہلیت ہی کا طرز عمل کہا جائے گا، مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ محض ایک جزوی علم ہے اور کسی معنی میں بھی انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے، لہذا خدا کے دیے ہوئے علم سے بے نیاز ہو کر جو نظام زندگی اس جزوی علم کے ساتھ ظنون واوہام اور قیاسات و خواہشات کی آمیزش کر کے بنا لیے گئے ہیں وہ بھی اسی طرح ''جاہلیت'' کی تعریف میں آتے ہیں جس طرح قدیم زمانے کے جاہلی طریقے اس تعریف میں آتے تھے۔

الجَاهِلِيَّةِ الْاُولٰی: (۳۳/۳۳) جاہلیت کا لفظ قرآن مجید میں اس مقام کے علاوہ تین جگہ اور استعمال ہوا ہے۔ ایک آل عمران کی آیت ۱۵۴ میں، جہاں اللہ کی راہ میں لڑنے سے جی چرانے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ ''اللہ کے بارے میں حق کے خلاف جاہلیت کے سے گمان رکھتے ہیں''۔ دوسرے سورہ مائدہ، آیت ۵۰ میں، جہاں خدا کے قانون کے بجائے کسی اور قانون کے مطابق اپنے مقدمات کا فیصلہ کرانے والوں کے متعلق فرمایا گیا ''کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔'' تیسرے سورہ فتح آیت ۲۶ میں، جہاں کفار مکہ کے اس فعل کو ''حمیت جاہلیہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ انہوں نے محض تعصب کی بنا پر مسلمانوں کو عمرہ نہ کرنے دیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوالدرداء نے کسی شخص سے جھگڑا کرتے ہوئے اس کو ماں کی گالی دے دی۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا ''تم میں ابھی تک جاہلیت موجود ہے''، ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''تین کام جاہلیت کے ہیں۔ دوسروں کے نسب پر طعن کرنا، ستاروں کی گردش سے فال لینا اور مردوں پر نوحہ کرنا''۔ ان تمام استعمالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جاہلیت سے مراد اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ طرز عمل ہے جو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی اخلاق و آداب اور اسلامی ذہنیت کے خلاف ہو اور جاہلیت اولیٰ کا مطلب وہ برائیاں ہیں جن میں اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اور دنیا بھر کے دوسرے لوگ مبتلا تھے۔

الجُودِیّ: (۱۱/۴۴) جودی پہاڑ کردستان کے علاقہ میں جزیرہ ابن عمر کے شمالی مشرقی جانب واقع ہے، بائبل میں اس کشتی کے ٹھیرنے کی جگہ اراراط بتائی گئی ہے جو آرمینیا کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور ایک سلسلہ کوہستان کا نام بھی، سلسلہ کوہستان کے معنی میں جس کو اراراط کہتے ہیں وہ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلتا ہے اور جبل جودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جو آج بھی جودی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم تاریخوں میں کشتی کے ٹھیرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے، چنانچہ مسیح سے ڈھائی سو برس پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیراسس (Berasus) نے پرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنے ملک کی جو تاریخ لکھی ہے

اس میں وہ کشتی نوح کے ٹھیرنے کا مقام جودی ہی بتاتا ہے۔ ارسطو کا شاگرد ابیڈینوس (Abydenus) بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے، نیز وہ اپنے زمانہ کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جنہیں وہ گھول گھول کر بیماروں کو پلاتے ہیں۔

یَجْئَرُون: (۲۳/۶۴) اصل میں لفظ ''جؤار'' استعمال کیا گیا ہے جو بیل کی اس آواز کو کہتے ہیں جو سخت تکلیف کے وقت وہ نکالتا ہے۔ یہ لفظ یہاں محض فریاد و فغاں کے معنی میں نہیں بلکہ اس شخص کی فریاد و فغاں کے معنی میں بولا گیا ہے جو کسی رحم کا مستحق نہ ہو۔ اس میں تحقیر اور طنز کا انداز چھپا ہوا ہے۔ اس کے اندر یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ ''اچھا، اب جو اپنے کرتوتوں کا مزا چکھنے کی نوبت آئی تو بلبلانے لگے۔

جِیْدِهَا: (۱۱۱/۵) اس کی گردن کے لئے جید کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایسی گردن کے لئے بولا جاتا ہے جس میں زیور پہنا گیا ہو۔ سعید بن المسیب، حسن بصری اور قتادہ کہتے ہیں کہ وہ ایک بہت قیمتی ہار گردن میں پہنتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ لات اور عزیٰ کی قسم میں اپنا یہ ہار بیچ کر محمد (ﷺ) کی عداوت میں خرچ کردوں گی۔ اسی بنا پر جید کا لفظ یہاں بطور طنز استعمال کیا گیا ہے کہ اس مزین گلے میں جس کے ہار پر وہ فخر کرتی ہے، دوزخ میں رسی پڑی ہو گی۔ یہ اسی طرح کا طنزیہ انداز کلام ہے جیسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمایا گیا ہے **بشرھم بعذاب الیم**، ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔

(ح)

یُحْبَرُون: (۱۵/۳۰) اصل میں لفظ یحبرون استعمال ہوا ہے جس کے مفہوم میں مسرت، لذت، شان و شوکت اور تکریم کے تصورات شامل ہیں۔ یعنی وہاں بڑی عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے، خوش خرم رہیں گے اور ہر طرح کی لذتوں سے شاد کام ہوں گے۔

حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ: (۷/۱۴۷) ضائع ہو گئے یعنی بار آور نہ ہوئے، غیر مفید اور لا حاصل نکلے۔ اس لیے کہ خدا کے ہاں انسانی سعی و عمل کے بار آور ہونے کا انحصار بالکل دو امور پر ہے ایک یہ کہ وہ سعی و عمل خدا کے قانون شرعی کی پابندی میں ہو، دوسرے یہ کہ اس سعی و عمل میں دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابی پیش نظر ہو یہ دو شرطیں جہاں پوری نہ ہوں گی وہاں لازماً حبط عمل واقع ہو گا، جس نے خدا سے ہدایت لیے بغیر بلکہ اس سے منہ موڑ کر باغیانہ انداز پر دنیا میں کام کیا، ظاہر ہے کہ وہ خدا سے کسی اجر کی توقع رکھنے کا کسی طرح حقدار نہیں ہو سکتا اور جس نے سب کچھ دنیا ہی کے لیے کیا اور آخرت کے لیے کچھ نہ کیا، کھلی بات ہے کہ آخرت میں اسے کوئی ثمرہ پانے کی امید نہ رکھنی چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہاں وہ کسی قسم کا ثمرہ پائے۔ اگر میری مملوکہ زمینیں کوئی شخص میرے منشاء کے خلاف تصرف کرتا رہا ہے تو وہ مجھ سے سزا پانے کے سوا آخر اور کیا پانے کا حق دار ہو سکتا ہے اور اگر اس زمین پر اپنے غاصبانہ قبضہ کے زمانہ میں اس نے سارا کام خود ہی اس ارادہ کے ساتھ کیا ہو کہ جب تک اصل مالک اس کی جرأت بے جا سے اغماض کر رہا ہے، اسی وقت تک وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا اور مالک کے قبضہ میں زمین واپس چلے جانے کے بعد وہ خود بھی کسی فائدے کا متوقع یا طالب نہیں ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ میں اس غاصب سے اپنی زمین واپس لینے کے بعد زمین کی پیداوار میں سے کوئی حصہ خواہ مخواہ اسے دوں۔

ذَاتِ الْحُبُکِ: (۵۱/۷) اصل میں لفظ ذات الحبک استعمال ہوا ہے۔ حبک راستوں کو بھی کہتے ہیں۔ ان لہروں کو بھی کہتے ہیں جو ہوا کے چلنے سے ریگستان کی ریت اور ٹھیرے ہوئے پانی میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور گھونگھر والے بالوں میں جو لٹیں سی بن جاتی ہیں ان کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ یہاں آسمان کو حبک والا یا تو اس لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ آسمان پر اکثر طرح طرح کی شکلوں والے بادل چھائے رہتے ہیں جن میں ہوا کے اثر سے بار بار تغیر ہوتا ہے اور کبھی کوئی شکل نہ خود قائم رہتی ہے، نہ کسی دوسری شکل کے مشابہ ہوتی ہے۔ یا اس بنا پر فرمایا گیا ہے کہ رات کے وقت آسمان پر جب تارے بکھرے ہوتے ہیں تو آدمی دیکھتا ہے کہ ان کی بہت سی مختلف شکلیں ہیں اور کوئی شکل دوسری شکل سے نہیں ملتی۔

بِحَبۡلِ اللّٰہ : (۳/ ۱۰۳)اللہ کی رسی سے مراد اس کا دین ہے اور اس کو رسی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ اس رسی کو ''مضبوط پکڑنے'' کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیت ''دین'' کی ہو، اسی سے ان کو دلچسپی ہو اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں اور اسی کی خدمت کے لئے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجہات اور دلچسپیاں جزئیات و فروع کی طرف منعطف ہوئیں پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ و اختلاف رونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو ان کے اصل مقصد حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے۔

الحَجَر : (۲/ ۶۰)وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے، سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ۱۲ چشموں میں یہ مصلحت تھی کہ بنی اسرائیل کے قبیلے بھی ۱۲ ہی تھے۔ خدا نے ہر ایک قبیلے کے لئے الگ چشمہ نکال دیا تا کہ ان کے درمیان پانی پر جھگڑا نہ ہو۔

حِجَارَۃً مِن سِجِّیلِ : (۱۵/ ۷۴) یہ پکی ہوئی مٹی کے پتھر ممکن ہے کہ شہاب ثاقب کی نوعیت کے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آتش فشانی انفجار (Volcanic eruption) کی بدولت زمین سے نکل کر اڑے ہوں اور پھر ان پر بارش کی طرح برس گئے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سخت آندھی نے یہ پتھراؤ کیا ہو۔

الحَجِّ الأکبَرِ : (۹/ ۳) حج اکبر کا لفظ حج اصغر کے مقابلہ میں ہے، اہل عرب عمرے کو چھوٹا حج کہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں وہ حج جو ذوالحجہ کی مقررہ تاریخوں میں کیا جاتا ہے، حج اکبر کہلاتا ہے۔

فَمَن حَجَّ البَیتَ اَوِ اعتَمَرَ : (۲/ ۱۵۸) ذوالحجہ کی مقرر تاریخوں میں کعبے کی جو زیارت کی جاتی ہے اس کا نام حج ہے اور ان تاریخوں کے ماسوا دوسرے کسی زمانے میں جو زیارت کی جائے وہ عمرہ ہے۔

المِحرَاب : (۳/ ۳۷) لفظ محراب سے لوگوں کا ذہن بالعموم اس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے لیکن یہاں محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے، صوامع اور کنیسوں میں اصل عبادت گاہ کی عمارت سے متصل سطح زمین سے کافی بلندی پر جو کمرے بنائے جاتے ہیں جن میں عبادت گاہ کے مجاور، خدام اور معتکف لوگ رہا کرتے ہیں انہیں محراب کہا جاتا ہے اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں حضرت مریم معتکف رہتی تھیں۔

حَرَجٌ : (۷/ ۲) لغت میں حرج اس گھنی جھاڑی کو کہتے ہیں جس میں سے گزرنا مشکل ہو۔

دل میں حرج ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ مخالفتوں اور مزاحمتوں کے درمیان اپنا راستہ صاف نہ پا کر آدمی کا دل آگے بڑھنے سے رکے۔

حَرْد: (۲۵/۶۸) اصل الفاظ ہیں علیٰ حرد۔ حرد عربی زبان میں روکنے اور نہ دینے کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قصد اور طے شدہ فیصلے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور سرعت کے معنی میں بھی مستعمل ہے اسی لئے ہم نے ترجمے میں تینوں معنوں کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

حُرُوف مُقَطَّعَات: حروفِ مقطعات کے متعلق تفصیلی مطالعہ و تحقیق کی اگر آپ کو فرصت نہ ہو تو صرف ''لسان العرب'' کی پہلی جلد میں باب تفسیر الحروف المقطعہ ہی دیکھ لیجیے۔ اس میں اول تو یہ معلوم ہو گا کہ مفسرین نے ان کی مختلف تعبیریں کی ہیں۔ پھر مشہور ماہرِ لغت الزِجاج کا یہ قول آپ کو ملے گا کہ اہلِ عرب ایک حرف بول کر کوئی ایسا کلمہ اس سے مراد لیتے تھے جس میں وہ حرف پایا جاتا ہو۔ اس کی مثال میں انھوں نے یہ مصرع پیش کیا ہے کہ:

قلت لها قفی فقالت قِ

یعنی ''قِ'' سے مراد ہے اَقِفُ۔ اسی طرح انھوں نے یہ شعر بھی مثال کے طور پر نقل کیا ہے:

نادیتهم ان الجمعوا الا تا   قالوا جمیعاً کلهم الا فا

یعنی اَلَا ''تَا'' سے مراد ہے اَلَا تَرکَبُوْنَ ؟ اور اَلَا ''فَا'' سے مراد ہے اَلَا فَارْکَبُوْا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طرزِ بیان قدیم اہلِ عرب میں رائج تھا، اس لیے وہ ایسے حروف کا مدعا سمجھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں کسی عرب نے ان حروف کے استعمال پر اعتراض نہیں کیا۔ لیکن بعد میں چونکہ یہ رائج نہیں رہا، اس لیے قرآنِ مجید کے تمام حروفِ مقطعات کا مطلب متعین کرنا، یعنی یہ معلوم کرنا کہ ہر حرف کس کلمہ پر دلالت کرتا ہے، مشکل ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی دلالت متعین کرنے میں اختلاف ہوئے ہیں اور کسی ایک تعبیر پر اتفاق نہیں ہو سکا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اتنے کثیر مقامات پر قرآن مجید میں ایسے حروف کا استعمال، جن کے معنی اب ٹھیک متعین نہیں ہو سکتے، اس کتاب کے عربی مبین ہونے میں قادح تو نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے معنی معلوم نہ ہونے سے اس ہدایت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا جو انسان کو قرآن میں دی گئی ہے۔ اگر اس میں کوئی ادنیٰ سا خلل بھی واقع ہونا ممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود ان کی تشریح فرما دیتا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فریضہ انجام دیتے۔

(رسائل و مسائل حصہ پنجم ص ۶۹ ۔ ۷۰)

یُحَرِّفُونَہ: (۷۵/۲) تحریف کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اصل معنی و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنا دینا جو قائل کے منشا کے خلاف ہو نیز الفاظ میں تغیر و تبدل کرنے کو بھی تحریف کہتے ہیں، علماء بنی اسرائیل نے یہ دونوں طرح کی تحریفیں کلام الٰہی میں کی ہیں۔

يُحَرِّفُونَ: (۴/۴۶) اس کے تین مطلب ہیں: ایک یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں ردوبدل کراتے ہیں، دوسرے یہ کہ اپنی تاویلات سے آیات کتاب کے معنی کچھ سے کچھ بنادیتے ہیں، تیسرے یہ کہ یہ لوگ محمد ﷺ اور آپ کے پیروؤں کی صحبت میں آکر ان کی باتیں سنتے ہیں اور واپس جاکر لوگوں کے سامنے غلط طریقے سے روایت کرتے ہیں، بات کچھ کہی جاتی ہے اور وہ اسے اپنی شرارت سے کچھ کا کچھ بنا کر لوگوں میں مشہور کرتے ہیں تاکہ انہیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو اسلامی جماعت کی طرف آنے سے روکا جائے۔

حُرُمٌ: (۵/۱) ''احرام'' اس فقیرانہ لباس کو کہتے ہیں جو زیارت کعبہ کے لیے پہنا جاتا ہے۔ کعبہ کے گرد کئی کئی منزل کے فاصلہ پر ایک حد مقرر کردی گئی ہے جس سے آگے بڑھنے کی کسی زائر کو اجازت نہیں جب تک کہ وہ اپنا معمولی لباس اتار کر احرام کا لباس نہ پہن لے۔ اس لباس میں صرف ایک تہمد ہوتا ہے اور ایک چادر جو اوپر سے اوڑھی جاتی ہے۔ اسے احرام اس لیے کہتے ہیں کہ اسے باندھنے کے بعد آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو معمولی حالات میں حلال ہیں، مثلاً حجامت، خوشبو کا استعمال، ہر قسم کی زینت و آرائش اور قضاء شہوت وغیرہ، انہی پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کیا جائے نہ شکار کیا جائے اور نہ کسی کو شکار کا پتہ دیا جائے۔

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: (۲/۱۴۴) مسجد حرام کے معنی ہیں حرمت اور عزت والی مسجد، اس سے مراد وہ عبادت گاہ ہے جس کے وسط میں خانہ کعبہ واقع ہے۔

حَسَدَ: (۱۱۳/۵) حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ نے جو نعمت یا فضیلت یا خوبی عطا کی ہو اس پر کوئی دوسرا شخص جلے اور یہ چاہے کہ وہ اس سے سلب ہو کر حاسد کو مل جائے یا کم از کم یہ کہ اس سے ضرور چھن جائے البتہ حسد کی تعریف میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص یہ چاہے کہ جو فضل دوسرے کو ملا ہے وہ مجھے بھی مل جائے۔ یہاں حاسد کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اس حالت میں مانگی گئی ہے جب کہ وہ حسد کرے یعنی اپنے دل کی آگ بجھانے کے لئے قول یا عمل سے کوئی اقدام کرے۔ کیونکہ جب تک وہ کوئی اقدام نہیں کرتا اس وقت تک اس کا جلنا بجائے خود چاہے برا ہی مگر محسود کے لئے ایسا شر نہیں بنتا کہ اس سے پناہ مانگی جائے۔ پھر جب ایسا شر کسی حاسد سے ظاہر ہو تو اس سے بچنے کے لئے اولین تدبیر یہ ہے کہ اللہ کی پناہ مانگی جائے۔ اس کے ساتھ حاسد کے شر سے امان پانے کیلئے چند چیزیں اور بھی مددگار ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اللہ پر بھروسہ کرے اور یقین رکھے کہ جب تک اللہ نہ چاہے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دوسرے یہ کہ حاسد کی باتوں پر صبر کرے، بے صبر ہو کر ایسی باتیں یا کارروائیاں نہ کرنے لگے جن سے وہ بھی اخلاقی طور پر حاسد ہی کی سطح پر آجائے۔ تیسرے یہ کہ حاسد خواہ خدا سے بے خوف اور خلق سے بے شرم ہو کر کیسی ہی بے ہودہ حرکتیں کرتا رہے، محسود بہر حال

تقوىٰ پر قائم رہے۔ چوتھے یہ کہ اپنے دل کو اس کی فکر سے بالکل فارغ کر لے اور اس کو اس طرح نظر انداز کر دے کہ گویا وہ ہے ہی نہیں کیونکہ اس کی فکر میں پڑنا حاسد سے مغلوب ہونے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ پانچویں یہ کہ حاسد کے ساتھ بدی سے پیش آنا تو در کنار جب کبھی ایسا موقع آئے کہ محسود اسکے ساتھ بھلائی اور احسان کا برتاؤ کر سکتا ہو تو ضرور ایسا ہی کرے، قطع نظر اس سے کہ حاسد کے دل کی جلن محسود کے اس نیک رویہ سے مٹتی ہے یا نہیں۔ چھٹے یہ کہ محسود توحید کے عقیدے کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس پر ثابت قدم رہے کیونکہ جس دل میں توحید بسی ہوئی ہو اس میں خدا کے خوف کے ساتھ کسی اور کا خوف جگہ ہی نہیں پا سکتا۔

يَسْتَحْسِرُون: (۱۹/۲۱) اصل میں لفظ لا يستحسرون استعال کیا گیا ہے۔ استحصار میں تکان کا مبالغہ پایا جاتا ہے اور اس سے مراد وہ تکان ہے جو کسی ناگوار کام کے کرنے سے لاحق ہوتی ہے

اِحْسَانًا : (۶/۱۵۱) نیک سلوک میں ادب، تعظیم، اطاعت، رضا جوئی، خدمت، سب داخل ہیں، والدین کے اس حق کو قرآن میں ہر جگہ توحید کے حکم کے بعد بیان فرمایا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کے بعد بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم حق انسان پر اس کے والدین کا ہے۔

الْمُحْسِنِين: (۲/۱۹۵) احسان کا لفظ حسن سے نکلا ہے جس کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں، عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سپرد جو خدمت ہو اسے بس کر دے اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے، اپنی پوری قابلیت اور اپنے تمام وسائل اس میں صرف کر دے اور دل و جان سے اس کی تکمیل کی کوشش کرے، پہلا درجہ محض طاعت کا درجہ ہے جس کے لئے صرف تقویٰ اور خوف کافی ہو جاتا ہے اور دوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے جس کے لیے محبت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔

لِاَوَّلِ الْحَشْرِ (۵۹/۲) اصل الفاظ ہیں لاول الحشر، حشر کے معنی ہیں منتشر افراد کو اکٹھا کرنا، یا بکھرے ہوئے اشخاص کو جمع کر کے نکالنا اور لاول الحشر کے معنی ہیں پہلے حشر کے ساتھ یا پہلے حشر کے موقع پر، اب رہا سوال اس جگہ اول حشر سے مراد کیا ہے تو اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد بنی نضیر کا مدینہ سے اخراج ہے اور اس کو ان کا پہلا حشر اس معنی میں کہا گیا ہے کہ ان کا دوسرا حشر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوا جب یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکالا گیا اور آخری حشر قیامت کے روز ہو گا۔ دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد مسلمانوں کی فوج کا اجتماع ہے جو بنی نضیر سے جنگ کرنے کے لئے ہوا تھا۔ اور لاول الحشر کے معنی یہ ہیں کہ ابھی مسلمان ان سے لڑنے کے لئے جمع ہی ہوئے تھے اور کشت و خون کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ

جلاوطنی کے لیے تیار ہو گئے۔ بالفاظ دگر یہاں یہ الفاظ باوّلِ وھلہ کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے "دراول جمع کردن لشکر"۔ اور شاہ عبد القادر صاحب کا ترجمہ ہے "پہلے ہی بھیڑ ہوتے" ہمارے نزدیک یہ دوسرا مفہوم ہی ان الفاظ کا متبادر مفہوم ہے۔

لَا یَحُضُّ: (۳/۱۰۷) لا یحض کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اپنے نفس کو بھی اس کام پر آمادہ نہیں کرتا اپنے گھر والوں کو بھی یہ نہیں کہتا کہ مسکین کا کھانا دیا کریں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس بات پر نہیں اکساتا کہ معاشرے میں جو غریب و محتاج لوگ بھوکے مر رہے ہیں ان کے حقوق پہچانیں اور ان کی بھوک مٹانے کیلئے کچھ کریں۔

الحُطَمَة: (۴/۱۰۴) اصل میں لفظ حطمہ استعمال کیا گیا ہے جو حطم سے ہے۔ حطم کے معنی توڑنے، کچل دینے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کے ہیں۔ جہنم کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ جو چیز بھی اس میں پھینکی جائے گی اسے وہ اپنی گہرائی اور اپنی آگ کی وجہ سے توڑ کر رکھ دے گی۔

حِطَّة: (۲/۵۸) حطہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا، دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتل عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں در گزر اور عام معافی کا اعلان کرتے جانا۔

حَفِیظ: (۵۰/۳۲) اصل میں لفظ حفیظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں حفاظت کرنے والا اس سے مراد ایسا شخص ہے جو اللہ کے حدود اور اس کے فرائض اور اس کی حرمتوں اور اس کی سپرد کی ہوئی امانتوں کی حفاظت کرے، جو ان حقوق کی نگہداشت کرے جو اللہ کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ جو اس عہد و پیمان کی نگہداشت کرے جو ایمان لا کر اس نے اپنے رب سے کیا ہے، جو اپنے اوقات اور اپنی قوتوں اور محنتوں اور کوششوں کی پاسبانی کرے کہ ان میں سے کوئی چیز غلط کاموں میں ضائع نہ ہو جو توبہ کر کے اس کی حفاظت کرے اور اسے پھر نہ ٹوٹنے دے جو ہر وقت اپنا جائزہ لے کر دیکھتا رہے کہ کہیں میں اپنے قول یا فعل میں اپنے رب کی نافرمانی تو نہیں کر رہا ہوں۔

اَحْقَابًا: (۷۸/۲۳) اصل میں لفظ احقاب استعمال کیا گیا ہے جسکے معنی ہیں پے در پے آنے والے طویل زمانے، ایسے مسلسل ادوار کہ ایک دور ختم ہوتے ہی دوسرا دور شروع ہو جائے۔ اس لفظ سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنت کی زندگی میں تو ہمیشگی ہو گی مگر جہنم میں ہمیشگی نہیں ہو گی کیونکہ یہ مدتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں۔ بہر حال جب مدتوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اس سے یہی متصور ہوتا ہے کہ وہ لامتناہی نہ ہوں گی بلکہ کبھی نہ کبھی جا کر ختم ہو جائیں گی، لیکن یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے، ایک یہ کہ عربی لغت کے لحاظ سے حقب کے لفظ ہی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک حقب کے پیچھے دوسرا حقب ہو،

اس لیے احقاب لازماً ایسے ادوار ہی کے لیے بولا جائے گا جو پے درپے ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں اور کوئی دور بھی ایسا نہ ہو جسکے پیچھے دوسرا دور نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ کسی موقع کے متعلق قرآن مجید کی کسی آیت سے کوئی ایسا مفہوم لینا اصولاً غلط ہے جو اسی موضوع کے بارے میں قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہوتا ہو۔ قرآن میں ۳۴ مقامات پر اہل جہنم کے لئے خلود (ہمیشگی) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، تین جگہ صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ ''وہ چاہیں گے کہ جہنم سے نکل جائیں مگر وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں ہیں اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے'' (المائدہ آیت ۳۷)۔ ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ ''اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے''۔ اور یہی بات اہل جنت کے متعلق بھی فرمائی گئی ہے کہ ''جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے''۔ (ہود، آیت ۱۰۷۔۱۰۸)

الاَحقَاف: (۲۱/۴۶) حقف کی جمع ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ریت کے لمبے لمبے ٹیلے جو بلندی میں پہاڑوں کی حد کو نہ پہنچے ہوں لیکن اصطلاحاً یہ صحرائے عرب (الربع الخالی) کے جنوبی مغربی حصے کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔

الحَاقَّة: (۱/۶۹) اصل میں لفظ الحاقہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں وہ واقعہ جس کو لازماً پیش آکر رہنا ہے، جس کا آنا برحق ہے، جس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ قیامت کے لئے یہ لفظ استعمال کرنا اور پھر کلام کا آغاز ہی اس سے کرنا خود بخود یہ ظاہر کرتا ہے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو اس کے آنے کو جھٹلا رہے تھے۔

الحَقّ: (۳/۱۰۳) حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک صحیح اور سچی اور مطابق عدل و انصاف اور مطابق حقیقت بات خواہ وہ عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے، دوسرے وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق، پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا یہ معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اس میں باطل سر اٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اسکا تماشہ دیکھتے رہیں بلکہ اس معاشرے میں یہ روح جاری و ساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اٹھائے کلمہ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راستبازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حقداروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس طرز عمل کی نصیحت کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ خسران سے نہیں بچ سکتا اور اس خسران میں وہ لوگ بھی آخر مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں

مگر اپنے معاشرہ میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں، یہی بات ہے جو سورہ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا اور لوگوں نے ایک دوسرے کو برے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا (آیات ۷۸،۷۹) پھر اسی بات کو سورہ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کھلم کھلا سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں پکڑنی شروع کردیں تو ان پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے (آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶) اور اسی بات کو سورہ انفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو (آیت ۲۵)۔ اسی لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے (آل عمران۔ ۱۰۴) اور اس امت کو بہترین امت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے (آل عمران۔۱۱۰)

بالۡحَقّ: (۱۵/۸) ''حق کے ساتھ اترتے ہیں'' کا مطلب ''حق لے کر اترنا'' ہے یعنی وہ اس لیے آتے ہیں کہ باطل کو مٹا کر حق کو اس کی جگہ قائم کردیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ لے کر آتے ہیں اور اسے نافذ کر کے چھوڑتے ہیں۔

حکماً: (۱۲/۲۲) قرآن کی زبان میں ان الفاظ سے مراد بالعموم ''نبوت عطا کرنا'' ہوتا ہے۔ ''حکم'' کے معنی قوت فیصلہ کے بھی ہیں اور اقتدار کے بھی۔ پس اللہ کی طرف سے کسی بندے کو حکم عطا کیے جانے کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انسانی زندگی کے معاملات میں فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی عطا کی ہے اور اختیارات بھی تفویض فرمائے۔

الحِکۡمَة: (۳۳/۳۴) حکمت کا لفظ وسیع ہے جس میں وہ تمام دانائی کی باتیں آجاتی ہیں جو نبی ﷺ لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اس لفظ کا اطلاق کتاب اللہ کی تعلیمات پر بھی ہو سکتا ہے مگر صرف انہی کے ساتھ اس کو خاص کر دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کی آیت سنانے کے علاوہ جس حکمت کی تعلیم نبی ﷺ اپنی سیرت پاک سے اور اپنے ارشادات سے دیتے تھے وہ بھی لامحالہ اس میں شامل ہے۔ بعض لوگ محض اس بنیاد پر کہ آیت میں ما یتلی (جو تلاوت کی جاتی ہیں) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آیت اللہ اور حکمت سے مراد صرف قرآن ہے کیونکہ تلاوت کا لفظ اصطلاحاً قرآن کی تلاوت کے لیے مخصوص ہے لیکن یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ تلاوت کے لفظ کو اصطلاح کے طور پر قرآن یا کتاب اللہ کی تلاوت کے لیے مخصوص کر دینا بعد کے لوگوں کا فعل ہے۔ قرآن میں اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۱۰۲ میں ہی لفظ جادو کے ان منتروں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو شیاطین حضرت سلیمان کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے تھے۔ ﴿وَاتَّبَعُوۡا مَا تَتۡلُوا الشَّیٰطِیۡنُ عَلٰی

مُلْکِ سُلَیْمَانَ﴾۔ انہوں نے پیروی کی اس چیز کی جس کی تلاوت کرتے تھے (یعنی جسے سناتے تھے) شیاطین سلیمان کی بادشاہی کی طرف منسوب کر کے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اس لفظ کو اس کے لغوی معنی میں استعمال کرتا ہے، کتاب اللہ کی آیات سنانے کے لیے اصطلاحاً مخصوص نہیں کرتا۔

الحُکْم: (۱۶/۴۵) حکم سے مراد تین چیزیں ہیں۔ ایک کتاب کا علم و فہم اور دین کی سمجھ۔ دوسرے کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت۔ تیسرے معاملات میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت۔

حُکْماً: (۲۱/۲۶) یعنی علم و دانش اور پروانۂ نبوت۔ حکم کے معنی حکمت و دانش کے بھی ہیں اور اس سند اقتدار (Authority) کے بھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کو عطا کی جاتی ہے، جس کی بنا پر وہ اختیار کے ساتھ بولتا ہے۔

حُکْماً: (۸۳/۲۶) سے مراد "نبوت" یہاں درست نہیں ہے، کیونکہ جس وقت کی یہ دعا ہے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت عطا ہو چکی تھی اور اگر بالفرض یہ دعا اس سے پہلے کی بھی ہو تو نبوت کسی کی طلب پر اسے عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ ایک وہبی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ خود ہی جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس لیے یہاں حکم سے مراد علم، حکمت، فہم صحیح اور قوت فیصلہ ہی لینا درست ہے۔

حُکْماً: (۱۴/۲۸) حکم سے مراد حکمت ہے، دانائی، فہم و فراست اور قوت فیصلہ۔

الحُکْم: (۱۲/۱۹) "حکم" یعنی قوت فیصلہ، قوت اجتہاد، تفقہ فی الدین، معاملات میں صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت اور اللہ کی طرف سے معاملات میں فیصلہ دینے کا اختیار۔

الحِکْمَة: (۲۶۹/۲) حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور صحیح قوت فیصلہ ہے۔

حکماً و علماً: (۷۹/۲۱) "حکم اور علم بخشا" بالعموم قرآن مجید میں نبوت عطا کرنے کا ہم معنی ہوتا ہے۔ "حکم" سے مراد حکمت بھی ہے، صحیح قوت فیصلہ بھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سند حکمرانی (Authority) حاصل ہونا بھی۔ رہا "علم" تو اس سے مراد وہ علم حق ہے جو وحی کے ذریعہ عطا کیا گیا ہو۔ حضرت لوط کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ الاعراف، آیات ۸۰ تا ۸۴۔ ھود، آیات ۶۹ تا ۸۳، الحجر آیات ۵۷ تا ۷۶۔

مُحکَمٰت: (۷/۳) محکم پکی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔ "آیات محکمات" سے مراد وہ آیات ہیں، جن کی زبان بالکل صاف ہے جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے، جن کے الفاظ معنی و مدعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہیں جنہیں تاویلات کا تختہ مشق بنانے کا موقع مشکل ہی سے کسی کو مل سکتا ہے، یہ آیات "کتاب کی اصل بنیاد ہیں"، یعنی قرآن جس غرض کے لیے نازل ہوا ہے اس غرض کو یہی آیتیں پورا کرتی ہیں۔ انہی میں اسلام کی

طرف دنیا کو دعوت دی گئی ہے، انہی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں، انہی میں گمراہیوں کی تردید اور راہ راست کی توضیح کی گئی ہے، انہی میں دین کے بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں، انہی میں عقائد، عبادات، اخلاق، فرائض اور امر و نہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں، پس جو شخص طالب حق ہو اور یہ جاننے کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہو کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے، اس کی پیاس بجھانے کے لیے آیات محکمات ہی اصل مرجع ہیں اور فطرۃً انہی پر اس کی توجہ مرکوز ہو گی اور وہ زیادہ تر انہی سے فائدہ اٹھانے میں مشغول رہے گا۔

اَوَّاهٌ حَلِيمٌ: (۹/ ۱۱۴) متن میں اَوَّاهٌ اور حَلِيمٌ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اواہ کے معنی ہیں بہت آہیں بھرنے والا، زاری کرنے والا، ڈرنے والا، حسرت کرنے والا، اور حلیم اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مزاج پر قابو رکھتا ہو، نہ غصے اور دشمنی اور مخالفت میں آپے سے باہر ہو، نہ محبت اور تعلق خاطر میں حد اعتدال سے تجاوز کر جائے، یہ دونوں لفظ اس مقام پر دوہرے معنی دے رہے ہیں، حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کی کیونکہ وہ نہایت رقیق القلب آدمی تھے، اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے کہ میرا یہ باپ جہنم کا ایندھن بن جائے گا اور حلیم تھے، اس ظلم وستم کے باوجود جو ان کے باپ نے اسلام سے ان کو روکنے کے لیے ان پر ڈھایا تھا۔ ان کی زبان اس کے حق میں دعا ہی کے لیے کھلی، پھر انہوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کا باپ خدا کا دشمن ہے اس سے تبری کی کیونکہ وہ خدا سے ڈرنے والے انسان تھے اور کسی کی محبت میں حد سے تجاوز کرنے والے نہ تھے۔

حَلِيمٌ: (۲۲/ ۵۹) حلیم ہے یعنی ایسے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں اور کمزوریوں کی وجہ سے ان کی بڑی بڑی خدمات اور قربانیوں پر پانی پھیر دینے والا نہیں ہے۔ وہ ان سے در گزر فرمائے گا اور ان کے قصور معاف کر دے گا۔

اَلْحَمِيدُ: (۱/۱۴) ''حمید'' کا لفظ اگرچہ محمود ہی کا ہم معنی ہے مگر دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے محمود کسی شخص کو اسی وقت کہیں گے جبکہ اس کی تعریف کی گئی ہو یا کی جاتی ہو۔ مگر حمید آپ سے حمد کا مستحق ہے خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے، اس لفظ کا پورا مفہوم ستودہ صفات، سزاوار حمد اور مستحق تعریف جیسے الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا، اسی لئے ہم نے اس کا ترجمہ ''اپنی ذات میں محمود'' کیا ہے۔

اَلْحَمْدُ: (۱/۳۴) حمد کا لفظ عربی زبان میں تعریف اور شکر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں دونوں معنی مراد ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کا مالک ہے تو لامحالہ اس کائنات میں جمال و کمال اور حکمت و قدرت اور صناعی و کاریگری کی جو شان نظر آتی ہے اس کی تعریف کا مستحق وہی ہے۔ اور اس کائنات میں رہنے والا جس چیز سے بھی کوئی فائدہ یا لطف و لذت حاصل کر رہا ہے اس پر خدا ہی کا شکر اسے ادا کرنا چاہیے۔ کوئی دوسرا جب

ان اشیاء کی ملکیت میں شریک نہیں ہے تو اسے نہ حمد کا استحقاق پہنچتا ہے نہ شکر کا۔

حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ : (۷۴/۵۰) یہ ایک عربی محاورہ ہے۔ جنگلی گدھوں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ خطرہ بھانپتے ہی وہ اس قدر بدحواس ہو کر بھاگتے ہیں کہ کوئی دوسرا جانور اس طرح نہیں بھاگتا۔ اس لیے اہل عرب غیر معمولی طور پر بدحواس ہو کر بھاگنے والے کو ان جنگلی گدھوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو شیر کی بو یا شکاریوں کی آہٹ پاتے ہی بھاگ پڑے ہوں۔

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ: (۱۱۱/۴) اصل الفاظ ہیں حَمَّالَةَ الْحَطَب جن کا لفظی ترجمہ ہے کہ ''لکڑیاں ڈھونے والی''۔ مفسرین نے اس کے متعدد معنی بیان کیے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس، ابن زید، ضحاک اور ربیع بن انس کہتے ہیں کہ وہ راتوں کو خاردار درختوں کی ٹہنیاں لا کر رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر ڈال دیتی تھی اس لئے اس کو لکڑیاں ڈھونے والی کہا گیا ہے، قتادہ، عکرمہ، حسن بصری، مجاہد اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ وہ لوگوں میں فساد ڈلوانے کے لئے چغلیاں کھاتی پھرتی تھی، اس لیے اسے عربی محاورے کے مطابق لکڑیاں ڈھونے والی کہا گیا، کیوں کہ عرب ایسے شخص کو جو ادھر کی بات ادھر لگا کر فساد کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتا ہو، لکڑیاں ڈھونے والا کہتے ہیں۔ اس محاورے کے لحاظ سے حمالة الحطب کے معنی ٹھیک وہی ہیں جو اردو میں بی جمالو کے معنی ہیں۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ جو شخص گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لاد رہا ہو اس کے متعلق عربی زبان میں بطور محاورہ کہا جاتا ہے فلان یحطب علی ظھرہ۔ فلاں شخص اپنی پیٹھ پر لکڑیاں لاد رہا ہے۔ پس حمالة الحطب کے معنی ہیں گناہوں کا بوجھ ڈھونے والی۔ ایک اور مطلب مفسرین نے اس کا یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ آخرت میں اس کا حال ہو گا، یعنی وہ لکڑیاں لا لا کر اس آگ میں ڈالے گی جس میں ابولہب جل رہا ہو گا۔

فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا: (۵۱/۲) الحاملات وقرا (بھاری بوجھ اٹھانے والیوں) سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو سمندروں سے لاکھوں اور کروڑوں گیلن پانی کے بخارات بادلوں کی شکل میں اٹھا لیتی ہیں۔ یہی تفسیر حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور مجاہد، سعید بن جبیر، حسن بصری، قتادہ اور سدی وغیرہ حضرات سے منقول ہے۔

حَمِيمٌ: (۴۰/۱۸) اصل میں لفظ حمیم استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد کسی شخص کا ایسا دوست ہے جو اس کو پٹتے ہوئے دیکھ کر جوش میں آئے اور اسے بچانے کے لئے دوڑے۔

حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ: (۴۸/۲۶) جاہلانہ حمیت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص محض اپنی ناک کی خاطر یا اپنی بات کی پچ میں جان بوجھ کر ایک ناروا کام کرے۔

حَمَإٍ: (۱۵/۲۶) حمأ عربی زبان میں ایسی سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر بو پیدا ہو چکی ہو، یا بالفاظ دگر خمیر اٹھ آیا ہو۔

حَنِيفًا: (۳/۶۷) اصل میں لفظ حنیف استعمال ہوا ہے جس سے مراد ایسا شخص جو ہر طرف سے رخ پھیر کر ایک خاص راستہ پر چلے۔ اسی مفہوم کو ہم نے ''مسلم یکسو'' سے ادا کیا ہے۔

حَنِيفًا: (۱۰/۱۰۵) حنیف اس کو کہتے ہیں جو سب طرف سے مڑ کر ایک طرف کا ہو رہا ہو، پس مطالبہ یہ ہے کہ اس دین کو، اس بندگی خدا کے طریقے کو، اس طرز زندگی کو کہ پرستش، بندگی، اطاعت، فرمانبرداری سب کچھ صرف اللہ رب العالمین ہی کی جائے، ایسی یکسوئی کے ساتھ اختیار کر کہ کسی دوسرے طریقے کی طرف ذرہ برابر میلان و رجحان بھی نہ ہو، اس راہ پر آ کر ان غلط راہوں سے کچھ بھی لگاؤ باقی نہ رہے جنہیں تو چھوڑ کر آیا ہے اور ان ٹیڑھے راستوں پر ایک غلط انداز نگاہ بھی نہ پڑے جن پر دنیا چلی جارہی ہے۔

لَاَحْتَنِكَنَّ: (۱۷/۶۲) احتناک کے اصل معنی کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے ہیں۔ چونکہ انسان کا اصل مقام خلافت الٰہی ہے جس کا تقاضا اطاعت میں ثابت قدم رہنا ہے، اس لیے اس مقام سے اس کا ہٹ جانا بالکل ایسا ہے جیسے کسی درخت کا بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا۔

حَنَاناً: (۱۹/ ۱۳) اصل میں لفظ حنان استعمال ہوا ہے جو قریب قریب مامتا کا ہم معنی ہے۔ یعنی ایک ماں کو جو غایت درجہ کی شفقت اپنی اولاد پر ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ بچے کی تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہے، وہ شفقت حضرت یحییٰ کے دل میں بندگان خدا کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

حُوْرٌ عِيْن: (۴۴/۵۴) اصل الفاظ ہیں حور عین۔ حور جمع ہے حوراء کی اور حوراء عربی زبان میں گوری عورت کو کہتے ہیں۔ عین: عین جمع ہے عیناء کی اور یہ لفظ بڑی بڑی آنکھوں والی عورت کے لئے بولا جاتا ہے (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو جلد چہارم، الصافات، حاشیہ ۲۶ و ۲۹)۔

الْحَوَارِيُّوْن: (۳/۵۲) ''حواری'' کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو ہمارے یہاں ''انصار'' کا مفہوم ہے، بائیبل میں بالعموم حواریوں کے بجائے ''شاگردوں'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور بعض مقامات پر انہیں رسول بھی کہا گیا ہے۔ مگر رسول اس معنی میں کہ مسیح علیہ السلام ان کو تبلیغ کے لیے بھیجتے تھے نہ اس معنی میں کہ خدا نے ان کو رسول مقرر کیا تھا۔

حَام: (۵/ ۱۰۳) حام، اگر کسی اونٹ کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا تو اس بوڑھے اونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا نیز اگر کسی اونٹ کے نطفہ سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل جاتی۔

حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ: (۷۶/۱) دھر سے مراد وہ لامتناہی زمانہ ہے جس کی نہ ابتدا انسان کو معلوم ہے نہ انتہا، اور حین سے مراد وہ خاص وقت ہے جو اس لامتناہی زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو۔ کلام کا مدعا یہ ہے اس لامتناہی زمانے کے اندر ایک طویل مدت تو ایسی گزری ہے جب سرے سے نوع انسانی ہی موجود نہ تھی۔

تَحِيَّتُهُم: (۱۴/ ۲۳) تحیہ کے لغوی معنی ہیں دعائے درازی عمر۔ مگر اصطلاحاً عربی زبان

میں یہ لفظ اس کلمہ خیر مقدم یا کلمہ استقبال کے لیے بولا جاتا ہے جو لوگ آمنے سامنے ہونے پر سب سے پہلے ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا ہم معنی لفظ یا تو سلام ہے یا پھر علیک سلیک۔ لیکن پہلا لفظ استعمال کرنے سے ترجمہ ٹھیک نہیں ہوتا اور دوسرا لفظ مبتذل ہے اس لیے ہم نے اس کا ترجمہ ''استقبال کیا ہے۔

تحیتھم کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ان کے درمیان آپس میں ایک دوسرے کے استقبال کا طریقہ یہ ہوگا اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ان کا اس طرح استقبال ہوگا، نیز سلام میں دعائے سلامتی کا مفہوم بھی ہے اور سلامتی کی مبارکباد کا بھی۔ ہم نے موقع کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے وہ مفہوم اختیار کیا ہے جو ترجمہ میں درج ہے۔

علیٰ حَیوٰۃ: (۹۶/۲) علیٰ حیوٰۃ کا لفظ ارشاد ہوا ہے جس کے معنی ہیں کسی نہ کسی طرح کی زندگی، یعنی انہیں محض زندگی کی حرص ہے، خواہ وہ کسی طرح کی زندگی ہو، عزت اور شرافت کی ہو یا ذلت اور کمینہ پن کی۔

یَحْییٰ: (۳۹/۳) بائیبل میں ان کا نام ''یوحنا بپتسمہ دینے والا'' (John the Baptist) لکھا ہے۔ ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ متی باب ۳ و ۱۱ و ۱۴۔ مرقس باب ۱ و ۶۔ لوقا باب ۱ و ۳۔

(خ)

خَبِیۡرٌ: (۲۲/۶۳) "خبیر" ہے یعنی وہ اپنی دنیا کے حالات، مصالح اور ضروریات سے باخبر ہے، اور جانتا ہے کہ اپنی خدائی کا کام کس طرح کرے۔

یَتَخَبَّطُہٗ: (۲/۲۷۵) اہل عرب دیوانے آدمی کو "مجنون" (یعنی آسیب زدہ) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اور جب کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے تو یوں کہتے کہ اسے جن لگ گیا ہے۔ اسی محاورہ کو استعمال کرتے ہوئے قرآن سود خوار کو اس شخص سے تشبیہ دیتا ہے جو مخبوط الحواس ہو گیا ہو۔

مُخۡتَال: (۳۱/۱۸) صل الفاظ ہیں مختال اور فخور۔ مختال کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنی دانست میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہو۔

خَتَمَ عَلٰی قُلُوۡبِکُمۡ: (۶/۴۶) یہاں دلوں پر مہر کرنے سے مراد سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں سلب کرنا ہے۔

خَاتَمَ النَّبِیّٖن: (۳۳/۴۱) پس جہاں تک سیاق و سباق کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النبیین کے معنی سلسلۂ نبوت کو ختم کر دینے والے ہی کے لیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے لیکن یہ صرف سیاق ہی کا تقاضا نہیں ہے، لغت بھی اسی معنی کی مقتضی ہے، عربی لغت اور محاورے کی رو سے "ختم" کے معنی مہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے، اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں

ختم العمل کے معنی ہیں فرغ العمل، "کام سے فارغ ہو گیا"

ختم الاناء کے معنی ہیں "برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر مہر لگا دی تا کہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو۔"

ختم الکتاب کے معنی ہیں "خط بند کر کے اس پر مہر لگا دی تا کہ خط محفوظ ہو جائے۔"

ختم القلب: "دل پر مہر لگا دی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے، نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے۔"

ختام کل مشروب، "وہ مزا جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے"۔

خاتمة کل شیء، عاقبته و آخریه: "ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت۔"

ختم الشیء، بلغ آخره۔ "کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے کہ اس کے آخر تک پہنچ جانا۔" اسی معنی میں ختم قرآن بولتے ہیں اور اسی معنی میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔

"خاتم القوم آخرھم" خاتم القوم سے مراد ہے قبیلے کا آخری آدمی" (ملاحظہ ہو لسان العرب، قاموس العرب اور اقرب الموارد)

اسی بنا پر تمام اہل لغت اور اہل تفسیر نے بالاتفاق، خاتم النبیین کے معنی آخر النبیین کے لئے ہیں۔ عربی لغت و محاورے کی رو سے خاتم کے معنی ڈاک خانے کی مہر کے نہیں ہیں جسے لگا لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مہر ہے جو لفافے پر اس لئے لگائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے نہ باہر کی کوئی چیز اندر جائے۔

یُخرِجِ الحَیَّ: (۶/۹۵) زندہ کو مردہ سے نکالنے کا مطلب بے جان مادہ سے زندہ مخلوقات کو پیدا کرنا اور مردہ کو زندہ سے خارج کرنے کا مطلب جاندار جسم میں سے بے جان مادوں کو خارج کرنا۔

یَخِرُّوا: (۲۵/۷۳) اصل میں الفاظ ہیں ﴿لَمْ یَخِرُّوا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا﴾، جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "وہ ان پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں گرتے" لیکن یہاں گرنے کا لفظ اپنے لغوی معنی کے لیے نہیں بلکہ محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں کہ "جہاد کا حکم سن کر بیٹھے رہ گئے" اس میں بیٹھنے کا لفظ اپنے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ جہاد کے لئے حرکت نہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

خُسر: (۲/۱۰۳) اب یہ دیکھئے کہ خسارے کا لفظ قرآن مجید کس معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لغت کے اعتبار سے خسارہ نفع کی ضد ہے اور تجارت میں اس لفظ کا استعمال اس حالت میں بھی ہوتا ہے جب کسی ایک سودے میں گھاٹا آئے اور اس حالت میں بھی جب سارا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہو اور اس حالت میں بھی جب اپنا سارا سرمایہ کھو کر آدمی دیوالیہ ہو جائے۔ قرآن مجید اسی لفظ کو اپنی خاص اصطلاح بنا کر فلاح کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے اور جس طرح اس کا تصور فلاح محض دنیوی خوشحالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی کامیابی پر حاوی ہے، اسی طرح اس کا تصور خسران بھی محض دنیوی ناکامی یا خستہ حالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی ناکامی و نامرادی پر حاوی ہے۔ فلاح اور خسران دونوں کے قرآنی تصور کی تشریح اس سے پہلے ہم متعدد مقامات پر کر چکے ہیں اس لئے ان کے اعادے کی حاجت نہیں ہے۔

خَاشِعُوْن: (۲/۲۳) خشوع کے اصل معنی ہیں کسی کے آگے جھک جانا، دب جانا، اظہار عجز و انکسار کرنا۔ اس کیفیت کا تعلق دل سے بھی ہے اور جسم کی ظاہری حالت سے بھی۔ دل کا خشوع یہ ہے کہ آدمی کسی کی ہیبت اور عظمت و جلال سے مرعوب ہو۔ اور جسم کا خشوع یہ ہے کہ جب وہ اس کے سامنے جائے تو سر جھک جائے۔ اعضا ڈھیلے پڑ جائیں اور نگاہ پست ہو جائے، آواز دب جائے اور ہیبت زدگی کے وہ سارے آثار اس پر طاری ہو جائیں جو اس حالت میں فطرتاً طاری

ہو جایا کرتے ہیں جبکہ آدمی کسی زبردست باجبروت ہستی کے حضور پیش ہو۔ نماز میں خشوع سے مراد دل اور جسم کی یہی کیفیت ہے اور یہی نماز کی اصل روح ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ ڈاڑھی کے بالوں سے کھیلتا جاتا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا **لو خشع قلبہ خشعت جوارحہ** "اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے جسم پر بھی خشوع طاری ہوتا۔

خُشَّعًا اَبْصَارُهُم: (۵۴/۷) اصل الفاظ ہیں **خشعا ابصارھم**، یعنی ان کی نگاہیں خشوع کی حالت میں ہوں گی، اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ان پر خوف زدگی طاری ہوگی، دوسرے یہ کہ ذلت اور ندامت ان سے جھلک رہی ہوگی کیونکہ قبروں سے نکلتے ہی محسوس ہو جائے گا کہ یہ وہی دوسری زندگی ہے جس کا ہم انکار کرتے تھے، جس کے لیے کوئی تیاری کر کے ہم نہیں آئے، جس میں اب مجرم کی حیثیت سے ہمیں اپنے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ گھبرائے ہوئے اس ہولناک منظر کو دیکھ رہے ہوں گے جو ان کے سامنے ہوگا، اس سے نظر ہٹانے کا انہیں ہوش نہ ہوگا۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ: (۳/۵۶) اصل الفاظ ہیں **خافضۃ رافعۃ**، "گرانے والی اور اٹھانے والی"۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دے گی۔ نیچے کی چیزیں اوپر اور اوپر کی چیزیں نیچے ہو جائیں گی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانے والی اور اٹھے ہوئے لوگوں کو گرانے والی ہوگی، یعنی اس کے آنے پر انسانوں کے درمیان عزت و ذلت کا فیصلہ ایک دوسری ہی بنیاد پر ہوگا، جو دنیا میں عزت والے بنے پھرتے تھے وہ ذلیل ہو جائیں گے اور جو ذلیل سمجھے جاتے تھے وہ عزت پائیں گے۔

اَخْلَصُوا دِيْنَهُم: (۱۴۶/۴) اپنے دین کو خالص کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں، اپنی ساری دلچسپیوں اور محبتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر دے، کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو۔

مُخْلَصًا: (۵۱/۱۹) اصل میں لفظ **مخلص** استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں "خالص کیا ہوا" مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ ایک ایسے شخص تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے خالص اپنا کر لیا تھا۔

خُلَع: (۲۲۹/۲) شریعت کی اصطلاح میں اسے "خلع کہتے ہیں یعنی ایک عورت کا اپنے شوہر کو کچھ دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کرنا۔

خَلِيْفَة :(۳۰/۲) خلیفہ: وہ جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے، اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے

کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے، یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے، تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

الخَمرُ: (۵/ ۹۰) خمر کا لفظ عرب میں انگوری شراب کے لیے استعمال ہوتا تھا اور مجازاً گیہوں، جو، کشمش، کھجور اور شہد کی شرابوں کے لیے بھی یہ لفظ بولتے تھے مگر نبی ﷺ نے حرمت کے اس حکم کو تمام ان چیزوں پر عام قرار دیا جو نشہ پیدا کرنے والی ہیں، چنانچہ حدیث میں حضور کے یہ واضح ارشادات ہمیں ملتے ہیں کہ کل مسکر خمر و کل مسکر حرام "ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے"۔ کل شراب مسکر فھو حرام۔ "ہر وہ مشروب جو نشہ پیدا کرے حرام ہے۔" وانا انھی عن کل مسکر۔ "اور میں ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں" حضرت عمرؓ نے جمعہ کے خطبہ میں شراب کی یہ تعریف بیان کی تھی کہ الخمر ما خامر العقل۔ "خمر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔"

نیز نبی ﷺ نے یہ اصول بھی بیان فرمایا کہ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ "جس چیز کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔" اور ما اسکر الفرق منہ فملء الکف منہ حرام۔ "جس چیز کا ایک پورا قرابہ نشہ پیدا کرتا ہو اس کا ایک چلو پینا بھی حرام ہے۔"

الخَیرُ: (۵۰/ ۲۵) خیر کا لفظ عربی زبان میں مال کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور بھلائی کے لئے بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مال میں سے کسی کا حق ادا نہ کرتا تھا، نہ خدا کا نہ بندوں کا، دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ بھلائی کے راستے سے خود ہی رک جانے پر اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روکتا تھا۔ دنیا میں خیر کے لیے سد راہ بنا ہوا تھا۔ اپنی ساری قوتیں اس کام میں صرف کر رہا تھا کہ نیکی کسی طرح پھیلنے نہ پائے۔

الخَیرُ: (۳۸/ ۳۲) اصل میں لفظ خیر کا استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں مال کثیر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور گھوڑوں کے لئے بھی مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو چونکہ راہ خدا میں جہاد کے لئے رکھا تھا، اس لیے انہوں نے "خیر" کے لفظ سے ان کو تعبیر فرمایا۔

الخَیرُ: (۶۸/ ۱۲) اصل میں مناع للخیر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ خیر عربی زبان میں مال کو بھی کہتے ہیں اور بھلائی کو بھی۔ اگر اس کو مال کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ سخت بخیل اور کنجوس آدمی ہے، کسی کو پھوٹی کوڑی دینے کا بھی روادار نہیں اور اگر خیر کو نیکی اور بھلائی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہر نیک کام میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور یہ بھی کہ وہ اسلام سے لوگوں کو روکنے میں بہت سرگرم ہے۔

(د)

دَسّٰھَا: (۹۱/۱۰) اس کے مقابلہ میں دساھا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مصدر تدسیہ ہے۔ تدسیہ کے معنی دبانے، چھپانے، اغوا کرنے اور گمراہ کر دینے کے ہیں، سیاق و سباق سے اس کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخص نامراد ہو گا جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رجحانات کو ابھارنے اور نشو و نما دینے کے بجائے ان کو دبا دے، اس کو بہکا کر برائی کے رجحانات کی طرف لے جائے اور فجور کو اس پر اتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اسکے نیچے اس طرح چھپ کر رہ جائے جیسے ایک لاش قبر پر مٹی ڈال دینے کے بعد چھپ جاتی ہے۔

دُعَاء: (۶۲/۲۴) اصل میں لفظ دعاء استعمال ہوا ہے جس کے معنی بلانے کے بھی ہیں اور دعا کرنے اور پکارنے کے بھی۔ نیز دعاء الرسول کے معنی رسول کا بلانا یا دعا کرنا بھی ہو سکتا ہے اور رسول کو پکارنا بھی۔

یَدُعُّ الْیَتِیْمَ: (۲/۱۰۷) اصل میں یدع الیتیم کا فقرہ استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں ایک یہ کہ وہ یتیم کا حق مار کھاتا ہے اور اس کے باپ کی چھوڑی ہوئی میراث سے بے دخل کرکے اسے دھکے مار کر نکال دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یتیم اگر اس سے مدد مانگنے آتا ہے تو رحم کھانے کے بجائے اسے دھتکار دیتا ہے اور پھر بھی اگر وہ اپنی پریشاں حالی کی بنا پر رحم کی امید لیے ہوئے کھڑا رہے تو اس دھکے دے کر دفع کر دیتا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ یتیم پر ظلم ڈھاتا ہے مثلاً اس کے گھر میں اگر اس کا اپنا ہی کوئی رشتہ دار یتیم ہو تو اس کے نصیب میں سارے گھر کی خدمتگاری کرنے اور بات بات پر جھڑکیاں اور ٹھو کریں کھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں اس فقرے میں یہ معنی بھی پوشیدہ ہیں کہ اس شخص سے کبھی کبھار یہ ظالمانہ حرکت سرزد نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کی عادت اور اس کا مستقل رویہ یہی ہے۔ اسے یہ احساس ہی نہیں ہے کہ یہ کوئی برا کام ہے جو وہ کر رہا ہے بلکہ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ یہ روش اختیار کیے رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یتیم ایک بے بس اور بے یار و مددگار مخلوق ہے اس لیے کوئی حرج نہیں اگر اس کا حق مار کر کھایا جائے، یا اسے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنا کر رکھا جائے یا وہ مدد مانگنے کے لئے آئے تو اسے دھتکار دیا جائے۔

یُدَافِعُ: (۳۸/۲۲) مدافعت دفع سے ہے جس کے اصل معنی کسی چیز کو ہٹانے اور دور کرنے کے ہیں۔ مگر جب دفع کے بجائے مدافعت کرنا بولیں گے تو اس میں دو مفہوم اور شامل ہو جائیں گے ایک یہ کہ کوئی دشمن طاقت ہے جو حملہ آور ہو رہی ہے اور مدافعت کرنے والا اس

کا مقابلہ کر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ مقابلہ بس ایک دفعہ ہی ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ جب بھی وہ حملہ کرتا ہے یہ اس کو دفع کرتا ہے۔ ان دو مفہومات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اہل ایمان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے مدافعت کرنے کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کفر اور ایمان کی کشمکش میں اہل ایمان یکہ و تنہا نہیں ہوتے بلکہ اللہ خود ان کے ساتھ ایک فریق ہوتا ہے۔ وہ ان کی تائید اور حمایت فرماتا ہے، ان کے خلاف دشمنوں کی چالوں کا توڑ کرتا ہے اور موذیوں کے ضرر کو ان سے دفع کرتا رہتا ہے۔ پس یہ حقیقت میں اہل حق کے لیے ایک بہت بڑی بشارت ہے جس سے بڑھ کر ان کا دل مضبوط کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔

دُلُوکِ الشَّمْس: (۱۷/۷۸) زوال آفتاب ہم نے دلوک الشمس کا ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ بعض صحابہ و تابعین نے دلوک سے مراد غروب بھی لیا ہے لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ اس سے مراد آفتاب کا نصف النہار سے ڈھل جانا ہے۔ حضرت عمر، ابن عمر، انس بن مالک، ابو برزہ الاسلمی، حسن بصری، شعبی، عطاء، مجاہد اور ایک روایت کی رو سے ابن عباس بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق سے بھی یہی قول مروی ہے، بلکہ بعض احادیث میں خود نبی ﷺ سے بھی دلوک شمس کی یہ تشریح منقول ہے۔ اگرچہ ان کی سند کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔

دَلِیْلًا: (۲۵/۴۵) یہاں لفظ دلیل ٹھیک اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جس میں انگریزی لفظ (Pilot) استعمال ہوتا ہے۔ ملاحوں کی اصطلاح میں دلیل اس شخص کو کہتے ہیں جو کشتیوں کو راستہ بتاتا ہوا چلے۔

یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ: (۳۳/۵۹) اصل الفاظ ہیں ﴿یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ﴾۔ جلباب عربی زبان میں بڑی چادر کو کہتے ہیں اور ادناء کے اصل معنی قریب کرنے اور لپیٹ لینے کے ہیں۔ مگر جب اس کے ساتھ علیٰ کا صلہ آئے تو اس میں ارخاء، یعنی اوپر سے لٹکا لینے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے بعض مترجمین و مفسرین مغربی مذاق سے مغلوب ہو کر اس لفظ کا ترجمہ صرف "لپیٹ لینا" کرتے ہیں تا کہ کسی طرح چہرہ چھپانے کے حکم سے بچ نکلا جائے لیکن اللہ تعالیٰ کا مقصد اگر وہی ہوتا جو یہ حضرات بیان کرنا چاہتے ہیں تو وہ یدنین الیھن فرماتا، جو شخص بھی عربی زبان جانتا ہو وہ کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ یدنین علیھن کے معنی محض لپیٹ لینے کے ہو سکتے ہیں۔ مزید بر آں من جلابیبھن کے الفاظ یہ معنی لینے میں اور زیادہ مانع ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں من تبعیض کے لئے ہے، یعنی چادر کا ایک حصہ۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ لپیٹی جائے گی تو پوری چادر لپیٹی جائے گی نہ کہ اس کا محض ایک حصہ۔ اس لئے آیت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ عورتیں اپنی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر ان کا ایک حصہ، یا ان کا پلو اپنے اوپر سے لٹکا لیا کریں، جسے عرف عام میں گھونگھٹ ڈالنا کہتے ہیں۔

مُدْھَآمَّتٰن: (۵۵/۶۴) ان باغوں کی تعریف میں مدھامتان استعمال فرمایا گیا ہے۔

مدھامہ ایسی گھنی سرسبزی کو کہتے ہیں جو انتہائی شادابی کے باعث سیاہی مائل ہو گئی ہو۔

مُدْهِنُون: (۸۱/۵۶) اصل الفاظ ہیں انتم مدھنون ۔ادھان کے معنی ہیں کسی چیز سے مداہنت برتنا۔ اس کو اہمیت نہ دینا۔ اس کو سنجیدہ توجہ کے قابل نہ سمجھنا۔ انگریزی میں (To take lightly) کے الفاظ اس مفہوم سے قریب تر ہیں۔

مِنْ دُوْنِهِمَا: (۶۲/۵۵) اصل الفاظ ہیں ﴿وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ﴾ دون کا لفظ عربی زبان میں تین مختلف معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایک، کسی چیز کے مقابلے میں نیچے ہونا، دوسرے کسی افضل واشرف چیز کے مقابلے میں کم تر ہونا۔ تیسرے کسی چیز کے ماسوا اس کے علاوہ ہونا۔

دِيْن :عالم عرب میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے

(ا) غلبہ واقتدار، حکمرانی وفرمانروائی، دوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اس پر اپنی قوتِ قاہرہ (sovereignty) استعمال کرنا، اس کو اپنا غلام اور تابعِ امر بنانا۔ مثلاً کہتے ہیں دان الناس، ای قھرھم علی الطاعة (یعنی لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا) دنتھم فدانو، ای قھرتھم فاطاعوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کیا اور وہ مطیع ہو گئے) دنت القوم اذللتھم واستعبدتھم (میں نے اس قوم کو مسخر کر لیا اور غلام بنالیا) دان الرجل اذا عز (فلاں شخص عزت اور طاقت والا ہو گیا) دنت الرجل حملته علیٰ مایکرہ (میں نے اس کو ایسے کام پر مجبور کیا جس کے لیے وہ راضی نہ تھا) دین فلان اذا حمل علیٰ مکروہ (فلاں شخص اس کام کے لیے بزور مجبور کیا گیا) دنته ای سستھم وملکته (یعنی میں نے اس پر حکم چلایا اور فرماں روائی کی) دینة القوم ولیته سیاستھم (یعنی میں نے قوم کی سیاست وحکمرانی فلاں شخص کو دی) اسی معنی میں حطیہ اپنی ماں کو خطاب کر کے کہتا ہے:

لقد دینت امر بنیك حتی تر کتھم ادق من الطحین

(تو اپنے بچوں کے معاملات کی نگراں بنائی گئی تھی۔ آخر کار تو نے انھیں آٹے سے بھی زیادہ باریک کر کے چھوڑا)

حدیث میں آتا ہے الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت یعنی ”عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مغلوب کر لیا اور وہ کام کیا جو اس کی آخرت کے لیے نافع ہو“ اسی معنی کے لحاظ سے دیان اس کو کہتے ہیں جو کسی ملک یا قوم یا قبیلہ پر غالب و قاہر ہو، اور اس پر فرمانروائی کرے۔ چنانچہ اعشی الحرمازی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہتا ہے:

یا سید الناس ودیان العرب اور اسی لحاظ سے مدین کے معنی غلام اور مدینة کے معنی لونڈی اور ابن مدینہ کے معنی لونڈی زادہ کے آتے ہیں جیسے اخطل کہتا ہے: ربت وربانی حجرھا ابن ملدینه اور قرآن میں ہے ﴿فَلَوْلَا اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ. تَرْجِعُوْنَهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ الواقعہ۔۸۶۔۸۷ یعنی ”اگر تم کسی کے مملوک، تابع، ماتحت نہیں ہو، تو مرنے والے کو موت سے بچا کیوں نہیں لیتے۔ جان کو واپس کیوں نہیں پلٹا لاتے؟“

(۲) طاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لیے مسخر ہونا۔ کسی کے تحتِ امر ہونا، کسی کے غلبہ وقہر سے دب کر اس کے مقابلے میں ذلت قبول کر لینا۔ چنانچہ کہتے ہیں: دنتھم فدانوا، ای قھرتھم فاطاعوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کر لیا اور وہ لوگ مطیع ہو گئے) دنت الرحل، ای خدمته (یعنی میں نے فلاں شخص کی خدمت کی) حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ارید من قریش کلمة تدین لھم بھا العرب، ای تطیعھم و تخضع لھم یعنی (میں قریش کو ایک ایسے کلمہ کا پیرو بنانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اسے مان لے، تو تمام عرب اس کا تابع فرمان بن جائے اور اس کے آگے جھک جائے) اسی معنی کے لحاظ سے اطاعت شعار قوم کو قوم دین کہتے ہیں اور اسی معنی میں دین کا لفظ حدیثِ خوارج میں استعمال کیا گیا ہے یمرقون من الدین مروق السھم من الرّمیة۔ (اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خوارج دین بمعنی ملت سے نکل جائیں گے کیونکہ حضرت علیؓ سے جب ان کے متعلق پوچھا گیا "اکفارھم؟.." کیا یہ لوگ کافر ہیں، تو آپ نے فرمایا "من الکفر فروا" کفر ہی سے تو وہ بھاگے ہیں۔ پھر پوچھا گیا "امنافقون ھم؟" کیا یہ منافق ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: منافق تو خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں، اور ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ شب و روز اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں اسی بنا پر متعین ہوتا ہے کہ اس حدیث میں دین سے مراد طاعتِ امام ہے۔ چنانچہ ابن اثیر نے نہایہ میں اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ اراد بالدین الطاعة ای انھم یخرجون من طاعة الامام المفرض الطاعة وینسلخون) (ج ۲ صفحہ ۴۱۔ ۴۲)

(۳) شریعت، قانون، طریقہ، کیش وملت، رسم وعادت۔ مثلاً کہتے ہیں مازال ذالك دینی ودیدنی یعنی یہ ہمیشہ میرا طریقہ رہا ہے...... یقال دان اذا اعتاد خیرا وشرا یعنی آدمی خواہ برے طریقہ کا پابند ہو یا بھلے طریقے کا، دونوں صورتوں میں اس طریقے کو جس کا وہ پابند ہے، دین کہیں گے۔ حدیث میں ہے کانت قریش ومن دان بدِینِھِمْ۔ قریش اور وہ لوگ جو ان کے مسلک کے پیرو تھے، اور حدیث میں ہے انه علیه السلام کان علی دین قومه نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے اپنی قوم کے دین پر تھے۔ یعنی نکاح، طلاق، میراث اور دوسرے تمدنی و معاشرتی امور میں ان ہی قاعدوں اور ضابطوں کے پابند تھے، جو آپؐ کی قوم میں رائج تھے۔

(۴) جزاءِ عمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ۔ چنانچہ عربی میں مثل ہے کما تدین تدان، یعنی جیسا تو کرے گا ویسا بھرے گا۔ قرآن میں کفار کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہے:۔ ﴿اَئِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ﴾ کیا مرنے کے بعد ہم سے حساب لیا جانے والا ہے، اور ہمیں بدلہ ملنے والا ہے؟" عبد اللہ ابن عمرؓ کی حدیث میں آتا ہے لا تسبوا السلطان فان کان لابد فقولوا اللھم کما یدینون "اپنے حکمرانوں کو برا نہ کہو، اور اگر کہنا ناگزیر ہو تو یوں کہو کہ خدایا جیسا کہ یہ ہمارے ساتھ کر رہے ہیں، ویسا ہی تو ان کے ساتھ کر" اس معنی میں لفظ دیان بمعنی قاضی و حاکمِ عدالت آتا ہے، چنانچہ کسی بزرگ سے جب حضرت علیؓ کے متعلق دریافت کیا گیا، تو انھوں نے کہا: کان دیان ھذہ الامة بعد

نبیھا، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ امت کے سب سے بڑے قاضی تھے۔

قرآن میں لفظ دین کا استعمال

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ دین کی بنیاد میں چار تصورات ہیں، یا بالفاظ دیگر یہ لفظ عربی ذہن کے چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے۔

(۱) غلبہ و تسلط کسی ذی اقتدار کی طرف سے۔

(۲) اطاعت، تعبد اور بندگی صاحب اقتدار کے آگے جھک جانے والے کی طرف سے۔

(۳) قاعدہ وضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے۔

(۴) محاسبہ اور فیصلہ اور جزاوسزا۔

ان ہی تصورات میں سے کبھی ایک کے لیے اور کبھی دوسرے کے لیے اہلِ عرب مختلف طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔ مگر چونکہ ان چاروں امور کے متعلق عرب کے تصورات پوری طرح صاف نہ تھے، اور کچھ بہت زیادہ بلند بھی نہ تھے، اس لیے اس لفظ کے استعمال میں ابہام پایا جاتا تھا، اور یہ کسی باقاعدہ نظامِ فکر کا اصطلاحی لفظ نہ بن سکا قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے لیے مناسب پا کر بالکل واضح و متعین مفہومات کے لیے استعمال کیا۔ اور اس کو اپنی مخصوص اصطلاح بنالیا۔ قرآنی زبان میں لفظِ دین ایک پورے نظام کی نمایندگی کرتا ہے جس کی ترکیب چار اجزاء سے ہوتی ہے۔

(۱) حاکمیت واقتدارِ اعلیٰ۔

(۲) حاکمیت کے مقابلے میں تسلیم واطاعت۔

(۳) وہ نظامِ فکروعمل جو اس حاکمیت کے زیرِ اثر ہے۔

(۴) مکافات جو اقتدارِ اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری واطاعت یا سرکشی وبغاوت کے صلے میں دی جائے۔

قرآن کبھی لفظ دین کا اطلاق معنی اوّل ودوم پر کرتا ہے، کبھی معنی سوم، پر کبھی معنی چہارم پر اور کہیں الدین بول کر یہ پورا نظام اپنے چاروں اجزاء سمیت مراد لیتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے حسب ذیل آیاتِ قرآنی ملاحظہ ہو:۔

دین بمعنی اول ودوم

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○ هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○﴾ (المؤمن. ۶۴-۶۵)

”وہ اللہ جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس پر آسمان کا قبہ چھایا‘ جس نے

تمہاری صورتیں بنائیں اور خوب ہی صورتیں بنائیں، جس نے پاکیزہ چیزوں سے تم کو رزق بہم پہنچایا وہی اللہ تمہارا رب ہے اور بڑی برکتوں والا ہے وہ رب العالمین ہے۔ وہی زندہ ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ لہٰذا تم اسی کو پکارو۔ دین کو اسی کے لیے خاص کر کے۔ تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

﴿قُلْ اِنِّیْ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ......قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ......وَالَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰی﴾ (الزمر۔ ۱۱۔۱۷)

"کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خاص کر کے اسی کی بندگی کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود سرِ اطاعت جھکاؤں...... کہو، میں تو اپنے ذہن کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں گا۔ تم کو اختیار ہے اس کے سوا جس کی چاہو، بندگی اختیار کرتے پھرو...... اور جو لوگ طاغوت کی بندگی کرنے سے پرہیز کریں اور اللہ ہی کی طرف رجوع کریں ان کے لیے خوشخبری ہے"۔

﴿اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ﴾ (الزمر۔ ۲۔۳)

"ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کر دی ہے۔ لہٰذا تم دین کو اللہ کے لیے خاص کر کے صرف اسی کی بندگی کرو۔ خبردار! دین خالصتاً اللہ ہی کے لیے ہے"۔

﴿وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ﴾ (النحل۔ ۵۲)

"زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور دین خالصاً اسی کے لیے ہے۔ پھر کیا اللہ کے سوا تم کسی اور سے تقویٰ کرو گے؟ (یعنی کیا اللہ کے سوا کوئی اور ہے جس کے حکم کی خلاف ورزی سے تم بچو گے اور جس کی ناراضی سے تم ڈرو گے؟)

﴿اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ﴾ (آل عمران۔ ۸۳)

"کیا یہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کا دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چارو ناچار اللہ ہی کی مطیع فرمان ہیں اور اسی کی طرف ان کو پلٹ کر جانا ہے"۔

﴿وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ﴾ (البینة۔ ۵)

"اور ان کو اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا تھا کہ یکسو ہو کر دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے صرف اسی کی بندگی کریں"۔

ان تمام آیات میں دین کا لفظ اقتدارِ اعلیٰ اور اس اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت و بندگی قبول کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے لیے دین کو خالص کرنے کا مطلب یہ ہے

کہ آدمی حاکمیت، فرمانروائی، حکمرانی اللہ کے سوا کسی کی تسلیم نہ کرے اور اپنی اطاعت و بندگی کو اللہ کے لئے اس طرح خالص کردے کہ کسی دوسرے کی مستقل بالذات بندگی و اطاعت اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک نہ کرے۔ (یعنی اللہ کے سوا جس کی اطاعت بھی ہو، اللہ کی اطاعت کے تحت اور اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہو۔ بیٹے کا باپ کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، غلام یا نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا اور اسی نوع کی دوسری تمام اطاعتیں اگر اللہ کے حکم سے ہوں، اور ان حدود کے اندر ہوں جو اللہ نے مقرر کردی ہیں، تو یہ عین اطاعتِ الٰہی ہے۔ اگر وہ اس سے آزاد ہوں، یا بالفاظ دیگر بجائے خود مستقل اطاعتیں ہوں، تو یہی عین بغاوت ہیں، حکومت اگر اللہ کے قانون پر مبنی ہے اور اس کا حکم جاری کرتی ہے، تو اس کی اطاعت فرض ہے۔ اور اگر ایسی نہیں ہے، تو اس کی اطاعت جرم۔)

دین بمعنی سوم

﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۝ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (یونس. ۱۰۴۔۱۰۵)

”کہو کہ اے لوگو! اگر تم کو میرے دین کے بارے میں کچھ شک ہے۔ (یعنی اگر تم کو صاف معلوم نہیں ہے کہ میرا دین کیا ہے) تو سنو! میں ان کی بندگی و عبادت نہیں کرتا جن کی بندگی و اطاعت تم اللہ کو چھوڑ کر کر رہے ہو، بلکہ میں اس اللہ کی بندگی کرتا ہوں جو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جو اسی اللہ کے ماننے والے ہیں اور یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ تو یکسو ہو کر اسی دین پر اپنے آپ کو قائم کر دے اور شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہو“۔

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ﴾ (یوسف. ۴۰)

”حکمرانی اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیک صحیح دین ہے“۔

﴿وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ...... ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِیْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِیْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ...... بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ...... فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۝﴾ (الروم. ۲۶۔۳۰)

”زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے سب اسی کے مطیع فرمان ہیں ...... وہ تمہیں

سمجھانے کے لیے خود تمہارے معاملے سے ایک مثال پیش کرتا ہے بتاؤ یہ غلام جو تمہارے مملوک ہیں، کیاان میں سے کوئی ان چیزوں میں جو ہم نے تمہیں دی ہیں، تمہارا شریک ہے؟ کیاتم انہیں اس مال کی ملکیت میں اپنے برابر کا حصہ دار بناتے ہو؟ کیاتم ان سے ہم چشموں کی طرح ڈرتے ہو...... سچی بات یہ ہے کہ ظالم لوگ علم کے بغیر محض اپنے تخیلات کے پیچھے چلے جارہے ہیں۔ پس تم یکسو ہو کر اپنے آپ کو اس دین پر قائم کردو۔ اللہ نے جس فطرت پر انسانوں کو پیدا کیا ہے اس کو اختیار کرلو۔ (یعنی اللہ نے جس ساخت پر انسانوں کو پیدا کیا ہے وہ تو یہی ہے کہ انسان کی تخلیق میں، اس کی رزق رسانی میں، اس کی ربوبیت میں خود اللہ کے سوا دوسرا شریک نہیں ہے، نہ اللہ کے سوا کوئی اس کا خدا ہے۔ نہ مالک اور متاع حقیقی۔ پس خالص فطری طریقہ یہ ہے کہ آدمی بس اللہ کا بندہ ہو، اور کسی کا بندہ نہ ہو۔) اللہ کی بنائی ہوئی ساخت کو نہ بدلا جائے۔ یہی ٹھیک صحیح دین ہے مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں''۔

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِیُ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ﴾ (النور. ۲)

''زانی اور زانیہ، دونوں کو سو سو کوڑے مارو، اور اللہ کے معاملے میں تم کو ان پر رحم نہ آئے''۔

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ﴾ (التوبہ. ۳۶)

''اللہ کے نوشتے میں تو اس وقت سے مہینوں کی تعداد ۱۲ ہی چلی آتی ہے جب سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، ان بارہ مہینوں میں سے ۴ مہینے حرام ہیں۔ یہی ٹھیک ٹھیک صحیح صحیح دین ہے''۔

﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِیُوْسُفَ مَا كَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ﴾ (یوسف. ۷۶)

''اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر نکالی، اس کے لیے جائز نہ تھا کہ اس بادشاہ کے دین میں اپنے بھائی کو پکڑتا''۔

﴿وَكَذٰلِكَ زَیَّنَ لِكَثِیْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِیُرْدُوْهُمْ وَلِیَلْبِسُوْا عَلَیْهِمْ دِیْنَهُمْ﴾ (انعام. ۱۳۷)

''اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں (شریک سے مراد ہے خداوندی فرمانروائی میں اور قانون بنانے میں خدا کا شریک۔) نے اپنی اولاد کے قتل کو ایک خوش آئند فعل بنادیا، تاکہ انھیں ہلاکت میں ڈالیں، اور ان کے لیے ان کے دین کو مشتبہ بنائیں''۔ (دین کو مشتبہ بنانے سے مطلب یہ ہے کہ جھوٹے شریعت ساز اس گناہ کو ایسا خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں، جس سے عرب کے لوگ اس شبہ میں پڑگئے ہیں کہ شاید یہ

فعل بھی اسی دین کا ایک جزو ہے جو ان کو ابتداءً حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے ملا تھا۔)

﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ﴾ (الشوریٰ. ۲۱)

''کیا انھوں نے کچھ شریک ٹھیرا رکھے ہیں، جو ان کے لیے دین کی قسم سے ایسے قوانین بناتے ہیں، جن کا اللہ نے اذن نہیں دیا ہے''۔

﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (الکافرون. ۶)

''تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین''۔

ان سب آیات میں دین سے مراد قانون، ضابطہ، شریعت، طریقہ اور وہ نظامِ فکر و عمل ہے، جس کی پابندی میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ اقتدار جس کی سند پر کسی ضابطہ و نظام کی پابندی کی جاتی ہے۔ خدا کا اقتدار ہے، تو آدمی دینِ خدا میں ہے، اگر وہ کسی بادشاہ کا اقتدار ہے تو آدمی دینِ بادشاہ میں ہے، اگر وہ پنڈتوں اور پروہتوں کا اقتدار ہے، تو آدمی ان ہی کے دین میں ہے۔ اگر خاندان، برادری، یا جمہورِ قوم کا اقتدار ہے، تو آدمی ان کے دین میں ہے۔ غرض جس کی سند کو آخری اور جس کے فیصلے کو منتہائے کلام مان کر آدمی کسی طریقے پر چلتا ہے، اسی دین کا وہ پیرو ہے۔

دین بمعنی چہارم

﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ (الذاریات. ۵-۶)

''وہ خبر جس سے تمہیں آگاہ کیا جارہا ہے (یعنی زندگی بعد موت) یقیناً سچی ہے اور دین یقیناً ہونے والا ہے''۔

﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ (الماعون. ۱-۳)

''تم نے دیکھا اس شخص کو جو دین کو جھٹلاتا ہے؟ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکساتا''۔

﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾ (انفطار. ۱۷-۱۹)

''تمہیں کیا خبر ہے کہ یوم الدین کیا ہے، ہاں تم کیا جانو کیا چیز ہے یوم الدین 'وہ دن وہ ہے، جب کہ کسی متنفس کے اختیار میں کچھ نہ ہو گا کہ دوسرے کے کام آسکے، اس روز سب اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہو گا''۔

ان آیات میں دین بمعنی محاسبہ و فیصلہ و جزائے اعمال استعمال ہوا ہے''۔

''دین'' ایک جامع اصطلاح

یہاں تک تو قرآن اس لفظ کو قریب قریب انہی مفہومات میں استعمال کرتا ہے، جن میں یہ

اہلِ عرب کی بول چال میں مستعمل تھا لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لفظ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے، اور اس سے مراد ایک ایسا نظامِ زندگی لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کرے، اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرماں برداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو، اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایسی جامع اصطلاح نہیں ہے، جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانے کا لفظ ''اسٹیٹ'' کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن ابھی اس کو ''دین'' کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لیے مزید وسعت درکار ہے۔

حسبِ ذیل آیات میں ''دین'' اسی اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے:۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ٥ (التوبہ۔۲۹)

''اہلِ کتاب میں سے جو لوگ نہ اللہ کو مانتے ہیں (یعنی اس کو واحد مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے) نہ یوم آخرت (یعنی یوم الحساب اور یوم الجزاء) کو مانتے ہیں۔ نہ ان چیزوں کو حرام مانتے ہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے، اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے، ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں''۔

اس آیت میں ''دینِ حق'' اصطلاحی لفظ ہے، جس کے مفہوم کی تشریح واضع اصطلاح، جل شانہ، نے پہلے تین فقروں میں خود ہی کر دی ہے۔ ہم نے ترجمہ میں نمبر لگا کر واضح کر دیا ہے کہ لفظِ دین کے چاروں مفہوم ان فقروں میں بیان کئے گئے ہیں اور پھر ان کے مجموعے کو ''دینِ حق'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِىْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِى الْاَرْضِ الْفَسَادَ٥﴾ (المؤمن۔۲۶)

''فرعون نے کہا کہ چھوڑو مجھے 'میں اس موسیٰ کو قتل ہی کیے دیتا ہوں اور اب پکارے وہ اپنے رب کو۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین نہ بدل دے، یا ملک میں فساد نہ کھڑا کر دے''۔

قرآن میں قصہ فرعون و موسیٰ کی جتنی تفصیلات آئی ہیں، ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین مجرد ''مذہب'' کے معنی میں نہیں آیا ہے، بلکہ ریاست اور نظامِ تمدن کے معنی میں آیا ہے فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر موسیٰ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا۔ جو نظامِ زندگی اس وقت فراعنہ کی حاکمیت اور رائج الوقت قوانین و رسوم

کی بنیادوں پر چل رہا ہے، وہ جڑ سے اکھڑ جائے گا اور اس کی جگہ یا تو دوسرا نظام بالکل دوسری ہی بنیادوں پر قائم ہو گا، یا نہیں تو سرے سے کوئی نظام قائم نہ ہو سکے گا۔ بلکہ تمام ملک میں بدنظمی پھیل جائے گی۔

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران. ۱۹)

''اللہ کے نزدیک دین تو دراصل ''اسلام'' ہے''۔

﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران. ۸۵)

''اور جو ''اسلام'' کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا''۔

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾ (التوبه. ۳۳)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولوں کو صحیح رہنمائی اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے' تا کہ وہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے' اگرچہ شرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو''۔

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال. ۳۹)

''اور تم ان سے لڑے جاؤ، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے''۔

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا﴾ (النصر)

''جب اللہ کی نصرت آ گئی اور فتح نصیب ہو چکی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تو اپنے رب کی حمد و ثنا اور اس کی تسبیح کرو۔ اور اس سے درگزر کی درخواست کرو وہ بڑا معاف کرنے والا ہے''۔

ان سب آیات میں دین سے پورا نظامِ زندگی اپنے تمام اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مراد ہے۔

پہلی دو آیتوں میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صحیح نظامِ زندگی صرف وہ ہے، جو خود اللہ ہی کی اطاعت و بندگی (اسلام) پر مبنی ہو۔ اس کے سوا کوئی نظام، جس کی بنیاد کسی دوسرے مفروضہ اقتدار کی اطاعت پر ہو، مالکِ کائنات کے ہاں ہرگز مقبول نہیں ہے اور فطرۃً نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ انسان جس کا مخلوق، مملوک اور پروردہ ہے، اور جس کے ملک میں رعیت کی حیثیت سے رہتا ہے، وہ تو کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ انسان خود اس کے سوا کسی دوسرے اقتدار کی بندگی و اطاعت میں زندگی گزارنے اور کسی دوسرے کی ہدایات پر چلنے کا حق رکھتا ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اسی صحیح و برحق نظامِ زندگی، یعنی

اسلام کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کے مشن کی غایت یہ ہے کہ اس نظام کو دوسرے نظاموں پر غالب کر کے رہے۔

چوتھی آیت میں دین اسلام کے پیرووں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو، اور اس وقت تک دم نہ لو جب تک فتنہ یعنی ان نظامات کا وجود دنیا سے مٹ نہ جائے، جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے اور پورا نظامِ اطاعت وبندگی اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے۔

پانچویں آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقع پر خطاب کیا گیا ہے، جب کہ ۲۳ سال کی مسلسل جدوجہد سے عرب میں انقلاب کی تکمیل ہو چکی تھی، اسلام اپنی پوری تفصیلی صورت میں ایک اعتقادی وفکری، اخلاقی وتعلیمی، تمدنی ومعاشرتی اور معاشی وسیاسی نظام کی حیثیت سے عملاً قائم ہو گیا تھا، اور عرب کے مختلف گوشوں سے وفد پر وفد آ کر اس نظام کے دائرے میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس طرح جب وہ کام تکمیل کو پہنچ گیا، جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مامور کیا گیا تھا، تو آپؐ سے ارشاد ہوتا ہے کہ اس کارنامہ کو اپنا کارنامہ سمجھ کر کہیں فخر نہ کرنے لگنا۔ نقص سے پاک، بے عیب ذات، اور کامل ذات صرف تمہارے رب ہی کی ہے، لہٰذا اس کارِ عظیم کی انجام دہی پر اس کی تسبیح اور حمد وثنا کرو، اور اس ذات سے درخواست کرو کہ مالک اس ۲۳ سال کے زمانۂ خدمت میں اپنے فرائض ادا کرنے میں جو خامیاں اور کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہو گئی ہوں انھیں معاف فرمادے۔ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

الدِّیۡن : (۲/۳۹) دین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کا حامل ہے:

ایک مفہوم ہے غلبہ واقتدار، مالکانہ اور حاکمانہ تصرف، سیاست وفرمانروائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے دان الناس، ای قھرھم علی الطاعة، دنتھم ای قھرتھم. دنته، سسته وملکته. وفی الحدیث الکیس من دان نفسه، ای اذلھا واستعبدھا. الدیان، القاضی، الحکم، القھار، ولا انت دیانی، ای لست بقاھر لی فتسوس امری، ماکان لیاخذ اخاه فی دین الملك، ای فی قضاء الملك۔

دوسرا مفہوم ہے اطاعت، فرمانبرداری اور غلامی۔ لسان العرب میں ہے الدین، الطاعة، دنته و دنت له ای اطعته، والدین لله انما ھو طاعته و التعبد له. فی الحدیث ارید من قریش کلمة تدین لھم بھا العرب ای تطیعھم وتخضع لھم. ثم دانت بعد الرباب ای ذلت له واطاعته، یمرقون من الدین، ای انھم یخرجون من طاعة الامام المفترض الطاعة، المدین، العبد. ﴿فَلَوۡلَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ غَیۡرَ مَدِیۡنِیۡنَ﴾، ای غیر مملوکین۔

تیسرا مفہوم ہے وہ عادت اور طریقہ جس کی انسان پیروی کرے۔ لسان العرب میں ہے الدین، العادة والشأن. یقال ما زال ذلك فی دینی ودیدنی، ای عادتی.

ان تینوں مفہومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کے معنی اس آیت میں اس ''طرز عمل اور اس

رویے کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کرکے انسان اختیار کرے۔" اور دین کو اللہ کے لیے خالص کرکے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ کہ "آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام واوامر کی اطاعت کرے"۔

الدِّیۡن :(۴۲/ ۱۳)من الدین "از قسم دین"۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ از آئین کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تشریع فرمائی ہے اس کی نوعیت آئین کی ہے۔ لفظ دین کی جو تشریح ہم اس سے پہلے سورہ زمر، حاشیہ نمبر ۳ میں کرچکے ہیں وہ اگر نگاہ میں رہے تو یہ سمجھنے میں کوئی الجھن پیش نہیں آسکتی کہ دین کے معنی ہی کسی کی سیادت وحاکمیت تسلیم کرکے اس کے احکام کی اطاعت کرنے کے ہیں۔ اور جب یہ لفظ طریقے کے معنی میں بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ طریقہ ہوتا ہے جسے آدمی واجب الاتباع اور جس کے مقرر کرنے والے کو مطاع مانے۔ اس بنا پر اللہ کے مقرر کیے ہوئے اس طریقے کو دین کی نوعیت رکھنے والی تشریع کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی حیثیت محض سفارش (Recommendation) اور وعظ و نصیحت کی نہیں ہے، بلکہ یہ بندوں کے لیے ان کے مالک کا واجب الاطاعت قانون ہے جس کی پیروی نہ کرنے کے معنی بغاوت کے ہیں اور جو شخص اس کی پیروی نہیں کرتا وہ دراصل اللہ کی سیادت وحاکمیت اور بندگی کا انکار کرتا ہے۔

(ذ)

ذِبۡحٍ عَظِيۡمٍ : (۱۰۷/۳۷) ''بڑی قربانی'' سے مراد جیسا کہ بائبل اور اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے، ایک مینڈھا ہے جو اس وقت اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے حضرت ابراہیم کے سامنے پیش کیا تا کہ بیٹے کے بدلے اس کو ذبح کر دیں۔ اسے بڑی قربانی کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ وہ ابراہیمؑ جیسے وفادار بندے کے لیے فرزند ابراہیم جیسے صابر و جاں نثار لڑکے کا فدیہ تھا اور اسے اللہ تعالیٰ نے ایک بے نظیر قربانی کی نیت پوری کرنے کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ''بڑی قربانی'' قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سنت جاری کر دی کہ اسی تاریخ کو تمام اہل ایمان دنیا بھر میں جانور قربان کریں اور وفاداری و جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتے رہیں۔

الذّٰرِيٰتِ: (۱/۵۱) اس امر پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ الذاریات سے مراد پراگندہ کرنے والی اور گرد و غبار اڑانے والی ہوائیں ہیں۔

ذُرِّيَّةٌ: (۸۳/۱۰) متن میں لفظ ''ذریۃ'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی اولاد کے ہیں، ہم نے اس کا ترجمہ ''نوجوان'' کیا ہے مگر دراصل اس خاص لفظ کے استعمال سے جو بات قرآن مجید بیان کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس پر خطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علمبردار حق کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ ان کو خطرات سے پر نظر آرہا تھا بلکہ وہ الٹے نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰ کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہو گے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔

الذِّكۡرِ: (۶/۱۵) ''ذکر'' کا لفظ قرآن میں اصطلاحاً کلام الٰہی کے لیے استعمال ہوا ہے جو سراسر نصیحت بن کے آتا ہے، پہلے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل ہوئی تھیں وہ سب بھی ''ذکر'' تھیں اور یہ قرآن بھی ''ذکر'' ہے، ذکر کے اصل معنی ہیں ''یاد دلانا''، ''ہوشیار کرنا'' اور ''نصیحت کرنا''

تَتَذَكَّرُوۡنَ: (۸۰/۶) اصل میں لفظ تذکر استعمال ہوا ہے جس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص جو غفلت اور بھلاوے میں پڑا ہوا ہو وہ چونک کر اس چیز کو یاد کر لے جس سے وہ غافل تھا۔

ذِكۡرِهِمۡ: (۷۱/۲۳) یہاں لفظ ذکر کے تین معنی ممکن ہیں اور تینوں ہی صحیح بیٹھتے ہیں:

۱۔ذکر بمعنی بیان فطرت۔اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم کسی دوسرے عالم کی باتیں نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی اپنی ہی حقیقت اور فطرت اور اس کے مقتضیات ان کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے اس بھولے ہوئے سبق کو یاد کریں۔ مگر وہ اسے قبول کرنے سے کترارہے ہیں۔ان کا یہ فرار کسی غیر متعلق چیز سے نہیں بلکہ اپنے ہی ذکر سے ہے۔

۲۔ذکر بمعنی نصیحت۔اس کی رو سے آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ جو کچھ پیش کیا جارہا ہے یہ انہی کے بھلے کے لیے ایک نصیحت ہے اور ان کا یہ فرار کسی اور چیز سے نہیں اپنی ہی بھلائی کی بات سے ہے۔

۳۔ذکر بمعنی شرف واعزاز۔اس معنی کو اختیار کیا جائے تو آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ ہم وہ چیز ان کے پاس لائے ہیں جسے یہ قبول کریں تو انہی کو عزت اور سرفرازی نصیب ہو گی۔اس سے ان کی یہ روگردانی کسی اور چیز سے نہیں۔اپنی ہی ترقی اور اپنے ہی اٹھان کے ایک زریں موقع سے روگردانی ہے۔

ذِی الذِّکْر: (۱/۳۸) اصل الفاظ ہیں ذی الذکر ۔اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ایک ذی شرف ،یعنی قرآن بزرگ ،دوسرے ذی التذکیر ،یعنی نصیحت سے لبریز قرآن ،یا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والا اور غفلت سے چونکا دینے والا قرآن۔

ذِکْرِ الرَّحْمٰن: (۳۶/۴۳) وسیع المعنی لفظ ہے،رحمان کے ذکر سے مراد اس کی یاد بھی ہے،اس کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت بھی اور یہ قرآن بھی۔

عَنْ ذِکْرِنَا: (۲۹/۵۳) ذکر کا لفظ یہاں کئی معنی دے رہا ہے۔اس سے مراد قرآن بھی ہوسکتا ہے۔ محض نصیحت بھی مراد ہو سکتی ہے اور اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کا ذکر سننا ہی جسے گوارا نہیں ہے۔

ذَکَّیْتُم :(۳/۵) ذکوٰۃ: ''ذبح'' اور ''ذکاۃ'' اسلام کے اصطلاحی لفظ ہیں۔ ان سے مراد حلق کا اتنا حصہ کاٹ دینا ہے جس سے جسم کا خون اچھی طرح خارج ہو جائے ، جھٹکا کرنے یا گلا گھونٹنے یا کسی اور تدبیر سے جانور کو ہلاک کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ خون کا بیشتر حصہ جسم کے اندر ہی رک کر رہ جاتا ہے اور وہ جگہ جگہ جم کر گوشت کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔برعکس اس کے ذبح کرنے کی صورت میں دماغ کیساتھ جسم کا تعلق دیر تک باقی رہتا ہے جس کی وجہ سے رگ رگ کا خون کھنچ کر باہر آجاتا ہے اور اس طرح پورے جسم کا گوشت خون سے صاف ہو جاتا ہے۔ خون کے متعلق ابھی اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ حرام ہے،لہذا گوشت کے پاک اور حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خون اس سے جدا ہو جائے۔

اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ: (۵۴/۵) ''مومنوں پر نرم'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اہل ایمان کے مقابلے میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہ کرے،اس کی ذہانت،اس کی ہوشیاری،

اس کی قابلیت، اس کا رسوخ واثر، اس کا مال، اس کا جسمانی زور، کوئی چیز بھی مسلمانوں کو دبانے اور ستانے اور نقصان پہنچانے کے لیے نہ ہو، مسلمان اپنے درمیان اس کو ہمیشہ ایک نرم خو، رحم دل، ہمدرد اور حلیم انسان ہی پائیں۔

ذَا النُّوْن :(۲۱/ ۸۷) مراد ہیں حضرت یونسؑ۔ کہیں ان کا نام لیا گیا ہے اور کہیں ''ذوالنون'' اور ''صاحب الحوت'' یعنی ''مچھلی والے'' کے القاب سے یاد کیا گیا ہے، مچھلی والا انہیں اس لیے نہیں کہا گیا ہے کہ وہ مچھلی پکڑتے یا بیچتے تھے بلکہ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا تھا، جیسا کہ سورہ صافات آیت ۱۴۲ میں بیان ہوا ہے مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، یونس حواشی ۹۸ تا ۱۰۰۔ الصافات، حواشی ۷۷ تا ۸۵۔

ذُوالْقَرْنَیْن: (۱۸/ ۸۳) یہ مسئلہ قدیم زمانے سے اب تک مختلف فیہ رہا ہے کہ یہ ''ذوالقرنین'' جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے کون تھا۔ قدیم زمانے میں بالعموم مفسرین کا میلان سکندر کی طرف تھا لیکن قرآن میں اس کی جو صفات و خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مشکل ہی سے سکندر پر چسپاں ہوتی ہیں۔ جدید زمانے میں تاریخی معلومات کی بنا پر مفسرین کا زیادہ میلان ایران کے فرماں رواخورس (خسر یا سائرس) کی طرف ہے اور یہ نسبتاً زیادہ قرین قیاس ہے، مگر بہر حال ابھی تک یقین کے ساتھ کسی شخصیت کو اس کا مصداق نہیں ٹھیرایا جاسکتا۔

قرآن مجید جس طرح اس کا ذکر کرتا ہے اس سے ہم کو چار باتیں وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں:

(۱) اس کا لقب ذوالقرنین (لغوی معنی ''دو سینگوں والا'') کم از کم یہودیوں میں، جن کے اشارے سے کفار مکہ نے اس کے بارے میں نبی ﷺ سے سوال کیا تھا ضرور معروف ہونا چاہیے۔ اس لیے لامحالہ ہمیں یہ معلوم کرنے کے لئے اسرائیلی لٹریچر کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ وہ 'دو سینگوں والے' کی حیثیت سے کس شخصیت یا سلطنت کو جانتے تھے۔

(۲) وہ ضرور کوئی بڑا فرمانروا اور فاتح ہونا چاہیے جس کی فتوحات مشرق سے مغرب تک پہنچی ہوں اور تیسری جانب شمال یا جنوب میں بھی وسیع ہوئی ہوں۔ ایسی شخصیتیں نزول قرآن سے پہلے چند ہی گزری ہیں اور لامحالہ انہی میں سے کسی میں اس کی دوسری خصوصیات ہمیں تلاش کرنی ہوگی۔

(۳) اس کا مصداق ضرور کوئی ایسا فرمانروا ہونا چاہئے جس نے اپنی مملکت کو یاجوج وماجوج کے حملوں سے بچانے کے لیے کسی پہاڑی درے پر ایک مستحکم دیوار بنائی ہو۔ اس علامت کی تحقیق کے لیے ہمیں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ یاجوج وماجوج سے مراد کون سی قومیں ہیں اور پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ان کے علاقے سے متصل کون سی ایسی دیوار کبھی دنیا میں بنائی گئی ہے اور کس نے بنائی ہے۔

(۴) اس میں مذکورہ بالا خصوصیات کے ساتھ ایک یہ خصوصیت بھی پائی جانی چاہیے کہ وہ خدا پرست اور عادل فرمانروا ہو کیونکہ قرآن یہاں سب سے بڑھ کر اس کی اسی خصوصیت کو نمایاں کرتا ہے۔

ان میں سے یہ پہلی علامت آسانی کے ساتھ خورس پر چسپاں کی جاسکتی ہے کیونکہ بائبل کے صحیفہ دانی ایل میں دانیال نبی کا جو خواب بیان کیا گیا ہے اس میں وہ یونانیوں کے عروج سے قبل میڈیا اور فارس کی متحدہ سلطنت کو ایک مینڈھے کی شکل میں دیکھتے ہیں جس کے دو سینگ تھے۔ یہودیوں میں اس ''دو سینگوں والے'' کا بڑا چرچا تھا کیونکہ اسی ٹکرنے آخر کار بابل کی سلطنت کو پاش پاش کیا اور بنی اسرائیل کو اسیری سے نجات دلائی (تفہیم القرآن بنی اسرائیل، حاشیہ ۸)

دوسری علامت بڑی حد تک اس پر چسپاں ہوتی ہے مگر پوری نہیں۔ اس کی فتوحات بلاشبہ مغرب میں ایشیائے کوچک اور شام کے سواحل تک اور مشرق میں باختر (بلخ) تک وسیع ہوئیں، مگر شمال یا جنوب میں اس کی کسی بڑی مہم کا سراغ ابھی تک تاریخ سے نہیں ملا ہے۔ حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ ایک تیسری مہم کا بھی ذکر کرتا ہے تاہم اس مہم کا پیش آنا بعید از قیاس نہیں ہے۔ کیونکہ تاریخی رو سے خورس کی سلطنت شمال میں کاکیشیا (قفقاز) تک وسیع تھی۔

تیسری علامت کے بارے میں یہ تو قریب قریب محقق ہے کہ یاجوج وماجوج سے مراد روس اور شمالی چین کے وہ قبائل ہیں جو تاتاری منگولی، ھن اور سیتھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں اور قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر حملے کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے حملوں سے بچنے کے لیے قفقاز کے جنوبی علاقے میں دربند اور داریال کے استحکامات تعمیر کئے تھے۔ لیکن یہ ابھی تک ثابت نہیں ہوسکا ہے کہ خورس ہی نے یہ استحکامات تعمیر کیے تھے۔

آخری علامت قدیم زمانے کے معروف فاتحوں میں اگر کسی پر چسپاں کی جاسکتی ہے تو وہ خورس ہی ہے کیونکہ اس کے دشمنوں تک نے اس کے عدل کی تعریف کی ہے اور بائبل کی کتاب عزرا اس بات پر شاہد ہے کہ وہ ضرور ایک خدا پرست اور خدا ترس بادشاہ تھا جس نے بنی اسرائیل کو ان کی خدا پرستی ہی کی بنا پر بابل کی اسیری سے رہا کیا اور اللہ وحدہ لاشریک کی عبادات کے لیے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا حکم دیا۔

اس بنا پر یہ تو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ نزول قرآن سے پہلے جتنے مشہور فاتحین عالم گزرے ہیں ان میں سے خورس ہی کے اندر ذوالقرنین کی علامات زیادہ پائی جاتی ہیں لیکن تعین کے ساتھ اسی کو ذوالقرنین قرار دے دینے کے لئے ابھی مزید شہادتوں کی ضرورت ہے تاہم دوسرا کوئی فاتح قرآن کی بتائی ہوئی علامات کا اتنا بھی مصداق نہیں ہے جتنا خورس ہے۔

تاریخی بیان کے لیے صرف اتنا ذکر کافی ہے کہ خورس ایک ایرانی فرمانروا تھا جس کا عروج

۵۴۹ ق م کے قریب زمانے میں شروع ہوا۔اس نے چند سال کے عرصے میں میڈیا (الجبال)اور لیدیا (ایشیائے کوچک) کی سلطنتوں کو مسخر کرنے کے بعد ۵۳۹ ق م میں بابل کو بھی فتح کرلیا جس کے بعد کوئی طاقت اس کے راستہ میں مزاحم نہیں رہی۔اس کی فتوحات کا سلسلہ سندھ اور صغد (موجودہ ترکستان) سے لے کر ایک طرف مصر اور لیبیا تک اور دوسری طرف تھریس اور مقدونیہ تک وسیع ہو گیا اور شمال میں اس کی سلطنت قفقاز (کاکیشیا) اور خوارزم تک پھیل گئی۔ عملاً اس وقت کی پوری مہذب دنیا اس کی تابع فرمان تھی۔

(ر)

رَاْفَةً: (۲۷/۵۷) اصل الفاظ ہیں رافت اور رحمت۔ یہ دونوں لفظ قریب قریب ہم معنی ہیں مگر جب یہ ایک ساتھ بولے جاتے ہیں تو رافت سے مراد وہ رقیق القلبی ہوتی ہے جو کسی کو تکلیف و مصیبت میں دیکھ کر ایک شخص کے دل میں پیدا ہو اور رحمت سے مراد وہ جذبہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ اس کی مدد کی کوشش کرے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ نہایت رقیق القلب اور خلق خدا کے لیے رحیم و شفیق تھے اس لیے ان کی سیرت کا یہ اثر ان کے پیرووں میں سرایت کر گیا کہ وہ اللہ کے بندوں پر ترس کھاتے تھے اور ہمدردی کے ساتھ ان کی خدمت کرتے تھے۔

رَبّ: اس لفظ کا مادہ ر ب ب ہے، جس کا ابتدائی و اساسی مفہوم پرورش ہے۔ پھر اسی سے تصرف، خبرگیری، اصلاح حال اور اتمام و تکمیل کا مفہوم پیدا ہوا۔ پھر اسی بنیاد پر فوقیت، سیادت مالکیت اور آقائی کے مفہومات اس میں پیدا ہو گئے۔ لغت میں اس کے استعمالات کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

(۱) پرورش کرنا، نشوونما، بڑھانا۔ مثلاً ربیب اور ربیبہ پروردہ لڑکے اور لڑکی کو کہتے ہیں۔ نیز اس بچے کو جو سوتیلے باپ کے گھر پرورش پائے، پالنے والی دائی کو بھی ربیبہ کہتے ہیں۔ رابّہ سوتیلی ماں کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ماں تو نہیں ہوتی مگر بچے کی پرورش کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے رابّ سوتیلے باپ کو کہتے ہیں۔ مربب یا مربی اس دوا کو کہتے ہیں جو محفوظ کر رکھی جائے۔ ربّ یربّ ربا کے معنی اضافہ کرنے، بڑھانے اور تکمیل کو پہنچانے کے ہیں جیسے ربّ النعمة یعنی احسان میں اضافہ کیا یا احسان کی حد کر دی۔

(۲) سمیٹنا، جمع کرنا، فراہم کرنا، مثلاً کہیں گے فلان یربّ الناس یعنی فلاں شخص لوگوں کو جمع کرتا ہے یا سب لوگ اس شخص پر مجتمع ہوتے ہیں۔ جمع ہونے کی جگہ کو مرب کہیں گے۔ سمٹنے اور فراہم ہو جانے کو تربب کہیں گے۔

(۳) خبرگیری کرنا، اصلاح حال کرنا، دیکھ بھال اور کفالت کرنا۔ مثلاً ربّ ضیعة کے معنی ہوں گے فلاں شخص نے اپنی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کی۔ ابوسفیان سے صفوان نے کہا تھا:۔

لان یربنی رجل من قریش احب الی من ان یربنی رجل من ہوازن، یعنی قریش میں سے کوئی شخص مجھے اپنی ربوبیت (سرپرستی) میں لے لے، یہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہوازن کا کوئی آدمی ایسا کرے۔ علقمہ بن عبیدہ کا شعر ہے:۔

فکنت امرأ افضت الیك ربابتی ۔۔۔ وقبلك ربتنی فضعت ربوبی

یعنی تجھ سے پہلے جو رئیس میرے مربی تھے انھوں نے میری خبرگیری و اصلاح نہ کی۔ آخرکار

اب میری کفالت وربابت تیرے ہاتھ آئی۔ فرزدق کہتا ہے:۔

کانوا کسائلۃ حمقاء اذا حقنت سلاء ھا فی ادیم غیر مربوب

اس شعر میں ادیم غیر مربوب سے مراد وہ چمڑا ہے جو کمایا نہ گیا ہو' جسے دباغت دے کر درست نہ کیا گیا ہو۔ فلان یرب صنعہ عند فلان کے معنی ہوں گے۔ فلاں شخص فلاں کے پاس اپنے پیشے کا کام کرتا ہے یا اس سے کاریگری کی تربیت حاصل کرتا ہے۔

(۴) فوقیت، بالادستی، سرداری، حکم چلانا، تصرف کرنا۔ مثلاً قد رب فلان قومہ یعنی فلاں شخص نے اپنی قوم کو اپنا تابع کر لیا، ربت القوم یعنی میں نے قوم پر حکم چلایا اور بالادست ہو گیا۔ لبید بن ربیعہ کہتا ہے:۔

واھلکن یوما رب کندۃ وابنہ ورب معدبین خبت وعرعر

یہاں رب کندہ سے مراد کندہ کا سردار ہے' جس کا حکم اس قبیلہ میں چلتا تھا۔ اس معنی میں نابغہ ذبیانی کا شعر ہے۔

تخب الی النعمان حتیٰ تنالہ فدی لك من رب تلیدی وطارنی

(۵) مالک ہونا۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ارب غنم ام رب ابل؟ تو بکریوں کا مالک ہے یا اونٹوں کا؟ اسی معنی میں گھر کے مالک کو رب الدار۔ اونٹنی کے مالک کو رب الناقۃ جائداد کے مالک کو رب الضیعہ کہتے ہیں۔

آقا کے معنی میں بھی رب کا لفظ آتا ہے اور عبد' یعنی غلام کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔

غلطی سے رب کے لفظ کو محض پروردگار کے مفہوم تک محدود کر کے رکھ دیا گیا ہے اور ربوبیت کی تعریف میں یہ فقرہ چل پڑا ہے کہ ھوا نشاء الشیء حالا فحالا الیٰ حد التمام (یعنی ایک چیز کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر پایۂ کو کمال پہنچانا) حالانکہ یہ اس لفظ کے وسیع معانی میں سے صرف ایک معنی ہے، اس کی پوری وسعتوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ حسب ذیل مفہومات پر حاوی ہے۔

(۱) پرورش کرنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا، تربیت اور نشو ونما دینے والا۔

(۲) کفیل، خبرگیراں۔ دیکھ بھال اور اصلاح حال کا ذمہ دار۔

(۳) وہ جو مرکزی حیثیت رکھتا ہو جس پر متفق اشخاص مجتمع ہوتے ہوں۔

(۴) سید مطاع، سردار، ذی اقتدار، جس کا حکم چلے، جس کی فوقیت وبالادستی تسلیم کی جائے جس کو تصرف کے اختیارات ہوں۔

(۵) مالک وآقا۔

قرآن میں لفظ رب کے استعمالات

قرآن مجید میں یہ لفظ ان سب معانی میں آیا ہے کہیں ان میں سے کوئی ایک دو معنی مراد ہیں،

کہیں اس سے زائد اور کہیں پانچوں معنی اس کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔ اس بات کو ہم آیات قرآنی سے مختلف مثالیں دے کر واضح کریں گے۔

پہلے معنی میں:۔

﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ﴾ (یوسف. ۲۳)

"اس نے کہا کہ پناہ بخدا وہ تو میرا رب ہے جس نے مجھے اچھی طرح رکھا"۔

دوسرے معنی میں، جس کے ساتھ پہلے معنی کا تصور بھی کم وبیش شامل ہے:

﴿فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝﴾ (الشعراء ۷۷. ۸۰)

"تمہارے یہ معبود تو میرے دشمن ہیں۔ بجز رب کائنات کے، اس نے مجھے پیدا کیا ہے جو میری رہنمائی کرتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے"۔

﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْئَرُوْنَ ۝ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ۝﴾ (النحل. ۵۳. ۵۴)

"تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہے، اللہ ہی سے حاصل ہوتی ہے، پھر جب تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اسی کی طرف تم گھبرا کر رجوع کرتے ہو، مگر جب وہ تم پر سے مصیبت ٹال دیتا ہے تو کچھ لوگ تم میں ایسے ہیں، جو اپنے رب کے ساتھ اس نعمت کی بخشش اور اس مشکل کشائی میں دوسروں کو شریک ٹھیرانے لگتے ہیں"۔

﴿قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ط﴾ (انعام. ۱۶۴)

"کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں۔ حالانکہ ہر چیز کا رب وہی ہے"۔

﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِیْلًا ۝﴾ (المزمل. ۹)

"وہ مغرب و مشرق کا رب ہے، جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ لہٰذا اسی کو اپنا وکیل (اپنے سارے معاملات کا کفیل وذمہ دار) بنالے"۔

تیسرے معنی میں:۔

﴿هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ (ہود. ۳۴)

"وہ تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم پلٹا کر لے جائے جاؤ گے"۔

﴿ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ﴾ (الزمر. ۷)

"پھر تمہارے رب کی طرف تمہاری واپسی ہے"۔

﴿قُلْ یَجْمَعُ بَیْنَنَا رَبُّنَا﴾ (سبا. ۲۶)

"کہو کہ ہم دونوں فریقوں کو ہمارا رب جمع کرے گا"۔

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ط مَا فَرَّطْنَا فِی

الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ﴿ (انعام.۳۸)

"زمین میں چلنے والا کوئی جاندار اور ہوا میں اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں ہے جو تمہاری ہی طرح ایک امت نہ ہو اور ہم نے اپنے دفتر میں کسی کے اندراج سے کوتاہی نہیں کی ہے پھر وہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جائیں گے"۔

﴾وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ﴿ (یس.۵۱)

"اور جونہی کہ صور پھونکا گیا وہ سب اپنے ٹھکانوں سے اپنے رب کی طرف نکل پڑیں گے"۔

چوتھے معنی میں جس کے ساتھ کم وبیش تیسرے معنی کا تصور بھی موجود ہے:

﴾اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴿ (التوبہ.۳۱)

"انھوں نے اللہ کے بجائے اپنے علماء اور درویشوں کو اپنا رب بنالیا"۔

﴾وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴿ (آل عمران.۶۴)

"اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے"۔

دونوں آیتوں میں ارباب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو قوموں اور گروہوں نے مطلقاً اپنا رہنما و پیشوا مان لیا ہو، جن کے امر و نہی، ضابطہ و قانون اور تحلیل و تحریم کو بلا کسی بالاتر سند کے تسلیم کیا جاتا ہو۔ جنھیں بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا حقدار سمجھا جاتا ہو۔

﴾اَمَّآ اَحَدُکُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا﴿ (یوسف.۴۱). ﴾وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّکَ ز فَاَنْسٰهُ الشَّیْطٰنُ ذِکْرَ رَبِّهٖ﴿ (یوسف.۴۲)

"یوسف نے کہا کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب کو شراب پلائے گا..........

اور ان دونوں میں سے جس کے متعلق یوسف کا خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائیگا' اس سے یوسف نے کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کرنا مگر شیطان نے اسے بھلادے میں ڈال دیا؛ اور اس کو اپنے رب سے یوسف کا ذکر کرنے کا خیال نہ رہا"۔

﴾فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ط اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ﴿ (یوسف.۵۰)

جب پیغام لانے والا یوسف کے پاس آیا تو یوسف نے اس سے کہا کہ اپنے رب کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، میرا رب تو ان کی چال سے باخبر ہی ہے"۔

ان آیات میں حضرت یوسفؑ نے مصریوں سے خطاب کرتے ہوئے بار بار فرعون مصر کو ان کا رب قرار دیا ہے، اس لئے کہ جب وہ اس کی مرکزیت اور اس کا اقتدار اعلیٰ اور اس کو امر و نہی کا مالک تسلیم کرتے تھے، تو وہی ان کا رب تھا۔ برعکس اس کے خود حضرت یوسفؑ اپنا رب اللہ کو قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ فرعون کو نہیں، صرف اللہ کو مقتدرِ اعلیٰ اور صاحب امر و نہی مانتے تھے۔

پانچویں معنی ہیں:۔

﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ۝ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ (قریش. ۳. ۴)

''لہٰذا انھیں اس گھر کے مالک کی عبادت کرنی چاہیے، جس نے ان کی رزق رسانی کا انتظام کیا ہے۔ اور انھیں بدامنی سے محفوظ رکھا ہے۔

﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾. (صافات. ۱۸۰)

''تیرا رب جو عزت واقتدار کا مالک ہے۔ ان تمام صفات عیب سے پاک ہے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں''۔

﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾. (انبیاء . ۲۲)

''اللہ جو عرش کا مالک ہے، ان تمام صفات عیب سے پاک ہے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں''۔

﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ (المؤمنون. ۸۶)

''پوچھو کہ ساتوں آسمانوں کا اور عرش بزرگ کا مالک کون ہے''؟۔

﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ﴾ (الصافات. ۵)

''وہ جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو آسمان وزمین کے درمیان ہیں، اور ان سب چیزوں کا جن پر سورج طلوع ہوتا ہے''۔

﴿وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى﴾. (النجم. ۴۹)

''اور یہ کہ شعری کا مالک بھی وہی ہے''۔

تَرَبَّصْتُم: (۵۷/۱۴) اصل الفاظ ہیں تربصتم، تربص عربی زبان میں انتظار کرنے اور موقع کی تلاش میں ٹھیرے رہنے کو کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص دو راستوں میں سے کسی ایک پر جانے کا قطعی فیصلہ نہ کرے، بلکہ اس فکر میں کھڑا ہو کہ جدھر جانا مفید ہوتا نظر آئے اسی طرف چل پڑے، تو کہا جائے گا کہ وہ تربص میں مبتلا ہے۔

رَبْوَة: (۵۰/۲۳) مختلف لوگوں نے اس سے مختلف مقامات مراد لیے ہیں۔ کوئی دمشق کہتا ہے کوئی الرملہ کہتا ہے کوئی بیت المقدس، اور کوئی مصریہ، مسیحی روایات کے مطابق حضرت مریم حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بعد ان کی حفاظت کے لیے دو مرتبہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئیں۔ پہلے ہیرودیس بادشاہ کے عہد میں وہ انہیں مصر لے گئیں اور اس کی موت تک وہیں رہیں پھر ازخلاؤس کے عہد حکومت میں ان کو گلیل کے شہر ناصرہ میں پناہ لینی پڑی (متی ۲۔ ۱۳ تا ۲۳) اب یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ قرآن کا اشارہ کس مقام کی طرف ہے لغت میں ربوہ اس بلند زمین کو کہتے ہیں جو ہموار ہو اور اپنے گرد وپیش کے علاقے سے اونچی ہو، ذات قرار

سے مراد یہ ہے کہ اس جگہ ضرورت کی سب چیزیں پائی جاتی ہوں اور رہنے والا وہاں بفراغت زندگی بسر کرسکتا ہو۔ اور معین سے مراد ہے بہتا ہوا پانی یا چشمہ جاری۔

الرِّبٰوٰا: (۲/۲۷۵) اصل میں لفظ ''ربٰوا'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی عربی میں زیادتی اور اضافے کے ہیں، اصطلاحاً اہل عرب اس لفظ کو اس زائد رقم کے لئے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرض دار سے ایک طے شدہ شرح کے مطابق اصل کے علاوہ وصول کرتا ہے، اسی کو ہماری زبان میں سود کہتے ہیں۔ نزول قرآن کے وقت سودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں اور جنہیں اہل عرب ''ربٰوا'' کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے وہ یہ تھیں کہ مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدت مقرر کردیتا۔ اگر وہ مدت گذر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کردیتا، یا مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کرلیتا کہ اتنی مدّت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنی ہوگی۔ یا مثلاً قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدت کے لیے ایک شرح طے ہوجاتی تھی اور اگر اس مدت میں اصل رقم مع اضافہ کے ادا نہ ہوتی تو مزید مہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔

رَبّٰنِيّٖن: (۳/۷۹) یہودیوں کے ہاں جو علماء مذہبی عہدہ دار ہوتے تھے اور جن کا کام مذہبی امور میں لوگوں کی رہنمائی کرنا اور عبادات کے قیام اور احکام دین کا اجراء کرنا ہوتا تھا، ان کے لئے لفظ ربانی استعمال کیا جاتا تھا جیسا کہ خود قرآن میں ارشاد ہوا ہے ﴿لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ﴾ (ان کے ربانی اور ان کے علماء ان کو گناہ کی باتیں کرنے اور حرام کے مال کھانے سے کیوں نہ روکتے تھے)۔ اسی طرح عیسائیوں کے ہاں لفظ (Divine) بھی ''ربانی'' کا ہی ہم معنی ہے۔

رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا: (۲۱:۳۰) اصل میں لفظ ''رتق'' اور ''فتق'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رتق کے معنی ہیں یکجا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق ہونا اور فتق کے معنی پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں۔ بظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک تودے (Mass) کی سی تھی، بعد میں اس کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کرکے زمین اور دوسرے اجرام فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے۔

ذَاتِ الرَّجْعِ: (۸۶/۱۱) آسمان کے لئے ذات الرجع کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ رجع کے لغوی معنی تو پلٹنے کے ہیں، مگر مجازاً عربی زبان میں یہ لفظ بارش کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ بس ایک دفعہ برس کر نہیں رہ جاتی بلکہ بار بار اپنے موسم میں اور کبھی خلاف موسم پلٹ پلٹ کر آتی ہے اور وقتاً فوقتاً برستی رہتی ہے۔ ایک اور وجہ بارش کو رجع کہنے کی یہ بھی ہے کہ زمین کے سمندروں سے پانی بھاپ بھی بن کر اٹھتا ہے اور پھر پلٹ کر زمین ہی پر برستا ہے۔

الرَّجْفَة: (۷/۷۸) اس آفت کو "رجفہ" (اضطراب انگیز، ہلا مارنے والی) کہا گیا ہے اور دوسرے مقامات پر اسی کے لیے صیحۃ (چیخ)، "صاعقۃ" (کڑاکا) اور "طاغیہ" (سخت زور کی آندھی) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

رَاجِفَة: (۷۹/۸) پہلے جھٹکے سے مراد وہ جھٹکا ہے جو زمین اور اس کی ہر چیز کو تباہ کر دے گا اور دوسرے جھٹکے سے مراد وہ جھٹکا ہے جس کے بعد تمام مردے زندہ ہو کر زمین سے نکل آئیں گے۔ اسی کیفیت کو سورہ زمر میں یوں بیان کیا گیا ہے "اور صور پھونکا جائے گا تو زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں وہ سب مر کر گر جائیں گے سوائے ان کے جنہیں اللہ (زندہ رکھنا) چاہے۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا تو یکایک سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے"۔ (آیت ۶۸)۔

المَرْجُومِيْن: (۲۶/۱۱۶) اصل الفاظ ہیں ﴿لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِيْنَ﴾۔ اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم کو رجم کیا جائے گا، یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ تم پر ہر طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ کی جائے گی۔ جہاں جاؤ گے دھتکارے اور پھٹکارے جاؤ گے۔ عربی محاورے کے لحاظ سے ان الفاظ کے یہ دونوں معنی لیے جاسکتے ہیں۔

رَجِيْمٌ: (۳۸/۷۷) اصل میں لفظ "رجیم" استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی ہیں "پھینکا ہوا" یا "مارا ہوا" اور محاورے میں یہ لفظ اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے مقام عزت سے گرا دیا گیا ہو اور ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ سورہ اعراف میں یہی مضمون ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے: ﴿فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ﴾۔ "پس تو نکل جا، تو ذلیل ہستیوں میں سے ہے"۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم: (۱/۲) انسان کا خاصہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وہ مبالغہ کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے اور اگر ایک مبالغہ کا لفظ بول کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس شئے کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہوا تو پھر وہ اسی معنی کا ایک اور لفظ بولتا ہے تاکہ وہ کمی پوری ہو جائے جو اس کے نزدیک مبالغہ میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں بھی یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔ رحمٰن عربی زبان میں بڑے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ لیکن خدا کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے، اس قدر وسیع ہے، ایسی بے حد و حساب ہے کہ اس کے بیان پر بڑے سے بڑا مبالغہ کا لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس لیے اس کی فراوانی کا حق ادا کرنے کے لیے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیاضی کے بیان میں "سخی" کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر "داتا" کا اضافہ کرتے ہیں۔ رنگ کی تعریف میں جب "گورے" کو کافی نہیں پاتے تو اس پر "چٹے" کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں۔ درازی قد کے ذکر میں جب "لمبا" کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس کے بعد "تڑنگا" بھی کہتے ہیں۔

ذُو الرَّحْمَةِ: (۶/ ۱۳۳) "مہربانی اس کا شیوہ ہے"۔ یہاں موقع و محل کے لحاظ سے اس فقرے کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارا رب تم کو راہ راست پر چلنے کی جو تلقین کرتا ہے اور حقیقت نفس الامری کے خلاف طرز عمل اختیار کرنے سے جو منع کرتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمہاری راست روی سے اس کا کوئی فائدہ اور غلط روی سے اس کا کوئی نقصان ہوتا ہے بلکہ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ راست روی اور غلط روی میں تمہارا نقصان ہے، لہذا یہ سراسر اس کی مہربانی ہے کہ وہ تمہیں اس صحیح طرز عمل کی تعلیم دیتا ہے جس سے تم بلند مدارج تک ترقی کرنے کے قابل بن سکتے ہو اور اس غلط طرز عمل سے روکتا ہے جس کی بدولت تم پست مراتب کی طرف تنزل کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تمہارا رب سخت گیر نہیں ہے، تم کو سزا دینے میں اسے کوئی لطف نہیں آتا ہے، وہ تمہیں پکڑنے اور مارنے پر تلا ہوا نہیں ہے کہ ذرا تم سے قصور سرزد ہو اور وہ تمہاری خبر لے ڈالے، درحقیقت وہ اپنی تمام مخلوقات پر نہایت مہربان ہے، غایت درجہ کے رحم و کرم کے ساتھ خدائی کر رہا ہے اور یہی اس کا معاملہ انسانوں کے ساتھ بھی ہے، اسی لیے وہ تمہارے قصور پر قصور معاف کرتا چلا جاتا ہے، تم نافرمانیاں کرتے ہو، گناہ کرتے ہو، جرائم کا ارتکاب کرتے ہو، اس کے رزق سے پل کر بھی اس کے احکام سے منہ موڑتے ہو، مگر وہ حلم اور عفو ہی سے کام لیے جاتا ہے اور تمہیں سنبھلنے اور سمجھنے اور اپنی اصلاح کرلینے کے لیے مہلت پر مہلت دیے چلا جاتا ہے۔ ورنہ اگر وہ سخت گیر ہوتا تو اس کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ تمہیں دنیا سے رخصت کر دیتا اور تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اٹھا کھڑا کرتا، یا سارے انسانوں کو ختم کر کے کوئی اور مخلوق پیدا کر دیتا۔

رَحْمَت: (۴۳/ ۳۲) یہاں رب کی رحمت سے مراد اس کی رحمت خاص، یعنی نبوت ہے، مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جن رئیسوں کو ان کی دولت و وجاہت اور مشیخت کی وجہ سے بڑی چیز سمجھ رہے ہو، وہ اس دولت کے قابل نہیں ہیں جو محمد بن عبد اللہ ﷺ کو دی گئی ہے۔ یہ دولت اس دولت سے بدرجہا اعلیٰ درجے کی ہے اور اس کے لئے موزونیت کا معیار کچھ اور ہے۔ تم نے اگر یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمہارا ہر چودھری اور سیٹھ نبی بننے کا اہل ہے تو یہ تمہارے اپنے ہی ذہن کی پستی ہے اللہ سے اس نادانی کی توقع کیوں رکھتے ہو؟

لِيُرْدُوهُم: (۶/ ۱۳۷) یہ ہلاکت کا لفظ نہایت معنی خیز ہے، اس سے مراد اخلاقی ہلاکت بھی ہے جو انسان سنگ دلی اور شقاوت کی اس حد کو پہنچ جائے کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے لگے اس میں جوہر انسانیت تو درکنار جوہر حیوانیت تک باقی نہیں رہتا، اور نوعی و قومی ہلاکت بھی کہ قتل اولاد کا لازمی نتیجہ نسلوں کا گھٹنا اور آبادی کا کم ہونا ہے، جس سے نوع انسانی کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور وہ قوم بھی تباہی کے گڑھے میں گرتی ہے جو اپنے حامیوں اور اپنے تمدن کے کارکنوں اور اپنی میراث کے وارثوں کو پیدا نہیں ہونے دیتی، یا پیدا ہوتے ہی خود اپنے ہاتھوں

انہیں ختم کر ڈالتی ہے۔۔ اور اس سے مراد انجامی ہلاکت بھی ہے کہ جو شخص معصوم بچوں پر یہ ظلم کرتا ہے، اور جو اپنی انسانیت کو بلکہ حیوانی فطرت تک کو یوں الٹی چھری سے ذبح کرتا ہے اور جو نوع انسانی کے ساتھ اور خود اپنی قوم کے ساتھ یہ دشمنی کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو خدا کے شدید عذاب کا مستحق بناتا ہے۔

رِزْقًا: (۱۳۲/۲۰) رزق کا ترجمہ ہم نے "رزق حلال" کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی حرام مال کو "رزق رب" سے تعبیر نہیں فرمایا ہے۔

رِزْقٌ كَرِيْمٌ: (۵۰/۲۲) رزق کریم کے دو مطلب ہیں۔ ایک عمدہ رزق دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عزت کے ساتھ بٹھا کر دیا جائے۔

رِزْقًا حَسَنًا: (۸۸/۱۱) رزق کا لفظ یہاں دوہرے معنی دے رہا ہے۔ اسکے ایک معنی تو علم حق کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشا گیا ہو، اور دوسرے معنی وہی ہیں جو بالعموم اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں، یعنی وہ ذرائع جو زندگی بسر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو دیتا ہے۔

رِزْقًا: (۱۳/۴۰) رزق سے مراد یہاں بارش ہے کیونکہ انسان کو جتنی اقسام کے رزق بھی دنیا میں ملتے ہیں ان سب کا دارومدار آخر کار بارش پر ہے۔

رِزْق: (۵۹/۱۰) اردو زبان میں رزق کا اطلاق صرف کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے، اسی وجہ سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہاں گرفت صرف اس قانون سازی پر کی گئی ہے جو دستر خوان کی چھوٹی سی دنیا میں مذہبی اوہام یا رسم ورواج کی بنا پر لوگوں نے کر ڈالی ہے۔ اس غلط فہمی میں جہلاء اور عوام ہی نہیں علماء تک مبتلا ہیں، حالانکہ عربی زبان میں رزق محض خوراک کے معنی تک محدود نہیں ہے بلکہ عطاء اور بخشش اور نصیب کے معنی میں عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دنیا میں انسان کو دیا ہے وہ سب اس کا رزق ہے، حتیٰ کہ اولاد تک رزق ہے، اسماء الرجال کی کتابوں میں بکثرت راویوں کے نام رزق اور رزیق اور رزق اللہ ملتے ہیں جس کے معنی تقریباً وہی ہیں جو اردو میں اللہ دیے کے معنی ہیں۔ مشہور دعا ہے اللھم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعه، یعنی ہم پر حق واضح کر اور ہمیں اس کے اتباع کی توفیق دے، محاورے میں بولا جاتا ہے رزق علما، فلاں شخص کو علم دیا گیا ہے، حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حاملہ کے پیٹ میں ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ پیدا ہونے والے کا رزق اور اسکی مدت عمر اور اس کا کام لکھ دیتا ہے، ظاہر ہے کہ یہاں رزق سے مراد صرف وہ خوراک ہی نہیں ہے جو بچے کو آئندہ ملنے والی ہے بلکہ وہ سب کچھ ہے جو اسے دنیا میں دیا جائے گا، خود قرآن میں ہے ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾، جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، پس رزق کو محض دستر خوان کی سرحدوں تک محدود سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ کو صرف ان پابندیوں اور آزادیوں پر اعتراض ہے جو کھانے پینے کے معاملہ میں لوگوں نے بطور خود اختیار کرلی ہیں، سخت غلطی ہے، اور یہ کوئی معمولی غلطی نہیں ہے

اس کی بدولت خدا کے دین کی بہت بڑی اصولی تعلیم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہے، یہ اسی غلطی کا تو نتیجہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں پر حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کا معاملہ تو ایک دینی معاملہ سمجھا جاتا ہے، لیکن تمدن کے وسیع تر معاملات میں اگر یہ اصول طے کر لیا جائے کہ انسان خود اپنے لئے حدود مقرر کرنے کا حق رکھتا ہے اور اسی بنا پر خدا اور اس کی کتاب سے بے نیاز ہو کر قانون سازی کی جانے لگے تو عوام تو درکنار علمائے دین و مفتیان شرع متین اور مفسرین قرآن و شیوخ حدیث تک کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ چیز بھی دین سے اسی طرح ٹکراتی ہے جس طرح ماکولات و مشروبات میں شریعت الٰہی سے بے نیاز ہو کر جائز و ناجائز کے حدود بطور خود مقرر کر لینا۔

رِزْقَكُم: (۸۲/۵۶) امام رازی نے تجعلون رزقکم کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ یہاں لفظ رزق معاش کے معنی میں ہو۔ چونکہ کفار قریش قرآن کی دعوت کو اپنے معاشی مفاد کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ یہ دعوت اگر کامیاب ہو گئی تو ہمارا رزق مارا جائیگا، اس لیے اس آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے اس قرآن کی تکذیب کو اپنے پیٹ کا دھندا بنا رکھا ہے۔ تمہارے نزدیک حق اور باطل کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اصل اہمیت تمہاری نگاہ میں روٹی کی ہے اور اس کی خاطر حق کی مخالفت کرنے اور باطل کا سہارا لینے میں تمہیں کوئی تامل نہیں۔

اَصْحَابُ الرَّسّ: (۳۸/۲۵) اصحاب الرس کے متعلق تحقیق نہ ہو سکی کہ یہ کون لوگ تھے۔ مفسرین نے مختلف روایات بیان کی ہیں مگر ان میں کوئی چیز قابل اطمینان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ یہ ایک ایسی قوم تھی جس نے اپنے پیغمبر کو کنویں میں پھینک کر یا لٹکا کر مار اتھا۔ رس عربی زبان میں پرانے کنوئیں یا اندھے کنوئیں کو کہتے ہیں۔

رَسُوْلاً: (۵۱/۱۹) "رسول" کے معنی ہیں "فرستادہ"، "بھیجا ہوا"۔ اس معنی کے لحاظ سے عربی زبان میں قاصد، پیغام بر، ایلچی اور سفیر کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور قرآن میں یہ لفظ یا تو ان ملائکہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کار خاص پر بھیجے جاتے ہیں یا پھر ان انسانوں کو اس نام سے موسوم کیا گیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے خلق کی طرف اپنا پیغام پہنچانے کے لئے مامور فرمایا۔

رُشْد: (۵۱/۲۱) "ہوشمندی" ہم نے "رشد" کا ترجمہ کیا ہے جس کے معنی ہیں "صحیح و غلط میں تمیز کر کے صحیح بات یا طریقے کو اختیار کرنا اور غلط بات یا طریقے سے احتراز کرنا۔" اس مفہوم کے لحاظ سے "رشد" کا ترجمہ "راست روی" بھی ہو سکتا ہے لیکن چونکہ رشد کا لفظ محض راست روی کو ظاہر کرتا ہے جو نتیجہ ہو فکر صحیح اور عقل سلیم کے استعمال کا۔ اس لیے ہم نے "ہوشمندی" کے لفظ کو اس کے مفہوم سے اقرب سمجھا ہے۔

مِرْصَادًا: (۲۱/۷۸) گھات اس جگہ کو کہتے ہیں جو شکار کو پھانسنے کے لیے بنائی جاتی ہے

تا کہ وہ بے خبری کی حالت میں آئے اور اچانک اس میں پھنس جائے، جہنم کے لئے یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ خدا کے باغی اس سے بے خوف ہو کر دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے اچھل کود کرتے پھر رہے ہیں کہ خدا کی خدائی ان کے لئے ایک کھلی آماجگاہ ہے اور یہاں کسی پکڑ کا خطرہ نہیں ہے لیکن جہنم ان کے لئے ایک ایسی چھپی ہوئی گھات ہے جس میں وہ یکایک پھنسیں گے اور بس پھنس کر ہی رہ جائیں گے۔

مُرْضِعَة: (۲/۲۲) آیت میں مرضع کے بجائے مرضعة کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ عربیت کے لحاظ سے دونوں میں فرق یہ ہے کہ مرضع اس عورت کو کہتے ہیں جو دودھ پلانے والی ہو اور مرضعہ اس حالت میں بولتے ہیں جبکہ وہ بالفعل دودھ پلا رہی ہو اور بچہ اس کی چھاتی سے منہ لگائے ہوئے ہو۔

المَرْعیٰ: (۴/۸۷) اصل میں لفظ مرعیٰ استعمال ہوا ہے جو جانوروں کے چارے کے لئے بولا جاتا ہے لیکن سیاق عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں صرف چارہ مراد نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نباتات مراد ہیں جو زمین سے اگتی ہیں۔

رَاعِنا: (۲/۱۰۴) یہودی جب آنحضرت ﷺ کی مجلس میں آتے تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقے سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذو معنی الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیر لب کچھ اور کہہ دیتے اور ظاہری ادب آداب برقرار رکھتے ہوئے درپردہ آپ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ قرآن میں آگے چل کر اس کی متعدد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے یہ ایک ذو معنی لفظ تھا۔ جب آنحضرت ﷺ کی گفتگو کے دوران میں یہودیوں کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ٹھیریے، ذرا ہمیں یہ بات سمجھ لینے دیجئے تو وہ راعنا کہتے تھے۔ اس لفظ کا ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجئے یا ہماری بات سن لیجئے۔ مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا، جس کے معنی تھے "سن، تو بہرا ہو جائے" اور خود عربی میں اس کے معانی صاحب رعونت اور جاہل واحمق کے بھی تھے، اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ تم ہماری سنو تو ہم تمہاری سنیں۔ اور ذرا زبان کو لچکا دے کر راعینا بھی بنا لیا جاتا تھا جس کے معنی "اے ہمارے چرواہے" کے تھے، اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو اور اس کے بجائے انظرنا کہا کرو، یعنی ہماری طرف توجہ فرمایئے یا ذرا ہمیں سمجھ لینے دیجئے، پھر فرمایا کہ "توجہ سے بات کو سنو" یعنی یہودیوں کو تو بار بار یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبی کی بات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تقریر کے دوران میں وہ اپنے ہی خیالات میں الجھے رہتے ہیں مگر تمہیں غور سے نبی کی بات سننی چاہئے تا کہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔

الرِّقَابِ: (۹/۶۰) گردنیں چھڑانے سے مراد یہ ہے کہ غلاموں کی آزادی میں زکوٰۃ کا

مال صرف کیا جائے، اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کیا ہو کہ اگر میں اتنی رقم تمہیں ادا کردوں تو تم مجھے آزاد کردو، اسے آزادی کی قیمت ادا کرنے میں مدد دی جائے۔ دوسرے یہ کہ خود زکوٰۃ کی مد سے غلام خرید کر آزاد کیے جائیں۔

الرَّقِيم : (۱۸ / ۹) الرقیم کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض صحابہ و تابعین سے منقول ہے کہ یہ اس بستی کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا اور وہ ایلہ "یعنی عقبہ" اور فلسطین کے درمیان واقع تھی۔ اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کتبہ ہے جو اس غار پر اصحاب کہف کی یادگار میں لگایا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان القرآن" میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقام وہی ہے جسے بائیبل کی کتاب یشوع (باب ۱۸۔ آیت ۲۷) میں رقم یا راقم کہا گیا ہے پھر وہ قبطیوں کے مشہور تاریخی مرکز پیڑا کا قدیم نام قرار دیتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ کتاب یشوع میں رقم یا راقم کا ذکر بنی یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے اور خود اسی کتاب کے بیان کی رو سے اس قبیلے کی میراث کا علاقہ دریائے اردن اور بحر لوط کے مغرب میں واقع تھا جس میں پیڑا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پیڑا کے کھنڈر جس علاقے میں پائے گئے ہیں اس کے اور بنی بن یمین کی میراث کے درمیان تو یودا اور ادومیہ کا پورا علاقہ حائل تھا۔ اسی بنا پر جدید زمانے کے محققین آثار قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ پیڑا اور راقم ایک چیز ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع ۱۹۴۶ء جلد ۱۷ ص ۶۵۸۔) ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رقیم سے مراد کتبہ ہے۔

رَهْبَانِيَّة: (۵۷ / ۲۷) اس کا تلفظ رَہبانیت بھی کیا جاتا ہے اور رُہبانیت بھی۔ اس کا مادہ رھب ہے جس کے معنی خوف کے ہیں۔ رَہبانیت کا مطلب ہے مسلک خوف زدگی اور رُہبانیت کے معنی ہیں مسلک خوف زدگان، اصطلاحاً اس سے مراد ہے کسی شخص کا خوف کی بنا پر (قطع نظر اس سے کہ وہ کسی کے ظلم کا خوف ہو یا دنیا کے فتنوں کا خوف، یا اپنے نفس کی کمزوریوں کا خوف) تارک الدنیا بن جانا اور دنیوی زندگی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینا یا گوشہائے عزلت میں جا بیٹھنا۔

رَاقٍ: (۷۵ / ۲۷) اصل میں لفظ راق استعمال ہوا ہے جو رقیہ سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے جس کے معنی تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے ہیں، اور رقی سے بھی جس کے معنی چڑھنے کے ہیں۔

رَقّ: (۵۲ / ۳) قدیم زمانے میں جن کتابوں اور تحریروں کو زمانہ دراز تک محفوظ رکھنا ہوتا تھا انہیں کاغذ کے بجائے ہرن کی کھال پر لکھا جاتا تھا۔ یہ کھال خاص طور پر لکھنے ہی کیلئے رقیق جلد یا جھلی کی شکل میں تیار کی جاتی تھی اور اصطلاح میں اسے رق کہا جاتا تھا۔ اہل کتاب بالعموم توراۃ، زبور، انجیل، اور صحف انبیاء کو اسی رق پر لکھا کرتے تھے تا کہ طویل مدت تک محفوظ رہ سکیں۔ یہاں کھلی کتاب سے مراد یہی مجموعہ کتب مقدسہ ہے جو اہل کتاب کے ہاں موجود تھا۔ اسے

کھلی کتاب اس لئے کہا گیا کہ وہ نایاب نہ تھا، پڑھا جاتا تھا اور بآسانی معلوم کیا جاسکتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔

رُوحُ القُدُس: (۱۶/ ۱۰۲) "روح القدس" کا لفظی ترجمہ ہے "پاک روح" یا "پاکیزگی کی روح"۔ اور اصطلاحاً یہ لقب حضرت جبریلؑ کو دیا گیا ہے۔ یہاں وحی لانے والے فرشتے کا نام لینے کے بجائے اس کا لقب استعمال کرنے سے مقصود سامعین کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ اس کلام کو ایک ایسی روح لے کر آرہی ہے جو بشری کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ وہ نہ خائن ہے کہ اللہ کچھ بھیجے اور وہ اپنی طرف سے کمی وبیشی کر کے کچھ اور بنادے۔ نہ کذاب ومفتری ہے کہ خود کوئی بات گھڑ کے اللہ کے نام سے بیان کردے۔ نہ بدنیت ہے کہ اپنی کسی نفسانی غرض کی بنا پر دھوکے اور فریب سے کام لے۔ وہ سراسر ایک مقدس ومطہر روح ہے جو اللہ کا کلام پوری امانت کے ساتھ لاکر پہنچاتی ہے۔

رُوحُ القُدُس: (۲/ ۸۷) روح پاک سے مراد علم وحی بھی ہے اور جبریل بھی جو وحی کا علم لاتے تھے اور خود حضرت مسیح کی اپنی پاکیزہ روح بھی جس کو اللہ نے قدسی صفات بنایا تھا۔

رُوحٌ: (۴/ ۱۷۱) یہاں خود مسیح کو روح منہ (خدا کی طرف سے پاک روح) کہا گیا ہے اور سورہ بقرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ ﴿اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ (ہم نے پاک روح سے مسیح کی مدد کی)، دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو بدی سے نا آشنا تھی، سراسر حقانیت اور راست بازتھی، اور ازسرتاپا فضیلت اخلاق تھی، یہ تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی، مگر انہوں نے اس میں بھی غلو کیا۔ روح من اللہ کو عین روح اللہ قرار دے لیا اور روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی روح مقدس تھی جو مسیح کے اندر حلول کر گئی تھی، اس طرح اللہ اور مسیح کے ساتھ تیسرا خدا روح القدس کو بناڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے، لطف یہ ہے کہ آج بھی انجیل متی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ "فرشتے نے اسے (یعنی یوسف نجار کو) خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف بن داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر، کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔" (باب ا، آیت ۲۰)

مُرِیْب: (۵۰/ ۲۵) اصل میں لفظ "مریب" استعمال ہوا ہے جسکے دو معنی ہیں ایک شک کرنے والا۔ دوسرے، شک میں ڈالنے والا اور دونوں ہی معنی یہاں مراد ہیں، مطلب یہ ہے کہ وہ خود شک میں پڑا ہوا تھا اور دوسروں کے دلوں میں شکوک ڈالتا تھا۔ اس کے نزدیک اللہ اور آخرت اور ملائکہ اور رسالت اور وحی، غرض دین کی سب صداقتیں مشکوک تھیں۔ حق کی جو بات انبیاء کی طرف سے پیش کی جاتی تھی، اس کے خیال میں وہ قابل یقین نہ تھی اور یہی وہ بیماری وہ اللہ کے

دوسرے بندوں کو لگاتا پھرتا تھا، جس شخص سے بھی اس کو سابقہ پیش آتا اس کے دل میں وہ کوئی نہ کوئی شک اور کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتا۔

رِيۡحًا صَرۡصَرًا: (۱۶/۴۱) طوفانی ہوا کے لئے "ریح صرصر" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کے معنی میں اہل لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سخت لو ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سخت ٹھنڈی ہوا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسی ہوا ہے جس کے چلنے سے سخت شور برپا ہوتا ہو۔ بہرحال اس معنی پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ بہت تیز طوفانی ہوا کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

(ز)

الزَّبَانِيَة: (۹۶/۱۸) اصل میں زبانیہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو قتادہ کی تشریح کے مطابق کلام عرب میں پولیس کے لئے بولا جاتا ہے، اور زبن کے اصل معنی دھکا دینے کے ہیں۔ بادشاہوں کے ہاں چوبدار بھی اسی غرض کے لئے ہوتے تھے کہ جس پر بادشاہ ناراض ہو اسے وہ دھکے دے کر نکال دیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے حمایتیوں کو بلالے، ہم اپنی پولیس، یعنی ملائکۂ عذاب کو بلالیں گے کہ وہ اس کی اور اس کے حمایتیوں کی خبر لیں۔

زُخْرُفَ الْقَولِ: (۶/۱۱۲) ''خوش آئند باتوں'' سے مراد وہ تمام چالیں اور تدبیریں اور شکوک و شبہات و اعتراضات ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعی حق اور اس کی دعوت کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کا کام لیتے ہیں، پھر ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی دھوکے اور فریب سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ حق سے لڑنے کے لیے جو ہتھیار بھی مخالفین حق استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف دوسروں کے لیے بلکہ خود ان کے لئے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکہ ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں۔

زُرْقًا: (۲۰/۱۰۲) اصل میں لفظ ''زُرقا'' استعمال ہوا ہے جو ازرق کی جمع ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ لوگ خود ازرق (سفیدی مائل نیلگوں) ہو جائیں گے کیونکہ خوف و دہشت کے مارے ان کا خون خشک ہو جائے گا اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی کہ گویا ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ تک نہیں ہے اور بعض دوسرے لوگوں نے اس لفظ کو ازرق العین (کرنجی آنکھوں والے) کے معنی میں لیا ہے اور وہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ شدت ہول سے ان کے دیدے پتھرا جائیں گے۔ جب کسی شخص کی آنکھ بے نور ہو جاتی ہے تو اس کے حدقۂ چشم کا رنگ سفید پڑ جاتا ہے۔

زَعِيم: (۶۸/۴۰) اصل میں لفظ زعیم استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں زعیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کفیل یا ضامن یا کسی قوم کی طرف سے بولنے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کون آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اللہ سے تمہارے لیے ایسا کوئی عہد و پیمان لے رکھا ہے۔

زَفِير: (۲۱/۱۰۰) اصل میں لفظ زفیر استعمال ہوا ہے۔ سخت گرمی، محنت اور تکان کی حالت میں جب آدمی لمبا سانس لے کر اس کو ایک پھنکار کی شکل میں نکالتا ہے تو اسے عربی میں زفیر کہتے ہیں۔

الزَّقُّوم: (۳۷/۶۲) زقوم ایک قسم کا درخت ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزہ

اس کا تلخ ہوتا ہے، بو ناگوار ہوتی ہے، اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔

الزَّکوٰۃ: (۴/۲۳) زکوٰۃ دینے اور زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہونے'' میں معنی کے اعتبار سے بڑا فرق ہے جسے نظر انداز کر کے دونوں کو ہم معنی سمجھ لینا صحیح نہیں ہے۔ آخر کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے یہاں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے ﴿یُؤْتُوْنَ الزَّکوٰۃَ﴾ کا معروف انداز چھوڑ کر ﴿لِلزَّکوٰۃِ فَاعِلُوْنَ﴾ کا غیر معمولی طرز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں زکوٰۃ کا مفہوم دو معنوں سے مرکب ہے۔ ایک پاکیزگی دوسرے نشوونما۔ کسی چیز کی تفقی میں جو چیزیں مانع ہوں ان کو دور کرنا، اور اس کے اصل جوہر کو پروان چڑھانا۔ یہ دو تصورات مل کر زکوٰۃ کا پورا تصور بناتے ہیں۔ پھر یہ لفظ جب اسلامی اصطلاح بنتا ہے تو اس کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ مال جو مقصد تزکیہ کے لئے نکالا جائے۔ دوسرے بجائے خود تزکیہ کا فعل۔ اگر یوتون الزکوٰۃ کہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تزکیہ کے لئے نکالا جائے۔ دوسرے بجائے خود تزکیہ کا فعل۔ اگر یوتون الزکوٰۃ کہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تزکیہ کی غرض سے اپنے مال کا ایک حصہ دیتے یا ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح بات صرف مال دینے تک محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر للزکوٰۃ فاعلون کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تزکیہ کا فعل کرتے ہیں اور اس صورت میں بات صرف مالی زکوٰۃ ادا کرنے تک محدود نہ رہے گی بلکہ تزکیہ نفس، تزکیہ اخلاق، تزکیہ زندگی، تزکیۂ مال، غرض ہر پہلو کے تزکیے تک وسیع ہو جائے گی اور مزید براں اس بات کا مطلب صرف اپنی ہی زندگی کے تزکیے تک محدود نہ رہے گا بلکہ اپنے گردوپیش کی زندگی کے تزکیے تک بھی پھیل جائے گا۔

زَکوٰۃ: (۴۱/۷) یہاں زکوٰۃ کے معنی میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، ابن عباس اور ان کے جلیل القدر شاگرد عکرمہ اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس مقام پر زکوٰۃ سے مراد وہ پاکیزگیٔ نفس ہے جو توحید کے عقیدے اور اللہ کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تباہی ہے ان مشرکین کے لیے جو پاکیزگی اختیار نہیں کرتے۔ دوسرا گروہ جس میں قتادہ، سدی، حسن بصری، ضحاک، مقاتل اور ابن ابی سائب جیسے مفسرین شامل ہیں، اس لفظ کو یہاں بھی زکوٰۃ مال ہی کے معنی میں لیتا ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو شرک کر کے خدا کا اور زکوٰۃ نہ دے کر بندوں کا حق مارتے ہیں۔

زَکّٰھَا: (۹۱/۹) تزکیہ کے معنی ہیں پاک کرنا، ابھارنا اور نشوونما دینا، سیاق وسباق سے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے اس کو ابھار کر تقویٰ کو بلندی پر لے جائے اور اس کے اندر بھلائی کو نشوونما دے وہ فلاح پائے گا۔

زُلْزِلَت: (۹۹/۱) اصل الفاظ ہیں زلزلت الارض زلزالھا، زلزلہ کے معنی پے درپے

زور زور سے حرکت کرنے کے ہیں، پس زلزلت الارض کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو جھٹکے دے کر شدت سے ہلا ڈالا جائے گا اور چونکہ زمین کو ہلانے کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ زمین کا کوئی مقام یا کوئی حصہ یا علاقہ نہیں بلکہ پوری کی پوری زمین ہلا ماری جائے گی، پھر اس زلزلے کی مزید شدت کو ظاہر کرنے کے لے زلزالھا کا اس پر اضافہ کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی ہیں ''اس کا ہلایا جانا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ایسا ہلایا جائے گا جیسا اس کو ہلانے کا حق ہے، یا جو اس کے ہلائے جانے کی انتہائی ممکن شدت ہو سکتی ہے۔ بعض مفسرین نے اس زلزلے سے مراد وہ پہلا زلزلہ لیا ہے جس سے قیامت کے پہلے مرحلے کا آغاز ہو گا یعنی جب ساری مخلوق ہلاک ہو جائے گی اور دنیا کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا لیکن مفسرین کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک اس سے مراد وہ زلزلہ ہے جس سے قیامت کا دوسرا مرحلہ شروع ہو گا، یعنی جب تمام اگلے پچھلے انسان دوبارہ زندہ ہو کر اٹھیں گے۔ یہی دوسری تفسیر زیادہ صحیح ہے کیونکہ بعد کا سارا مضمون اسی پر دلالت کرتا ہے۔

الاَزْلَامُ: (۵/۹۰) آستانوں اور پانسوں کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ مائدہ، حاشیہ نمبر ۱۲ و ۱۴۔ اسی سلسلہ میں جوئے کی تشریح بھی حاشیہ نمبر ۱۴ میں مل جائے گی۔ اگرچہ پانسے (ازلام) اپنی نوعیت کے اعتبار سے میسر (جوئے) ہی کی ایک قسم ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ عربی زبان میں ازلام فال گیری اور قرعہ اندازی کی اس صورت کو کہتے ہیں جو مشرکانہ عقائد اور وہمیات سے آلودہ ہو، اور میسر کا اطلاق ان کھیلوں اور ان کاموں پر ہوتا ہے جن میں اتفاقی امور کو کمائی اور قسمت آزمائی اور تقسیم اموال واشیاء کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

زَنِیْم: (۶۸/ ۱۳) اصل میں لفظ زنیم استعمال ہوا ہے، کلام عرب میں یہ لفظ اس ولد الزنا کے لیے بولا جاتا ہے جو دراصل ایک خاندان کا فرد نہ ہو مگر اس میں شامل ہو گیا ہو۔ سعید بن جبیر اور شعبی کہتے ہیں کہ یہ لفظ اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو لوگوں میں اپنے شر کی وجہ سے معروف و مشہور ہو۔

عَلٰٓی اَزْوَاجِھِم: (۲۳/۶) ازدواج کا اطلاق عربی زبان کے معروف استعمال کی رو سے بھی اور خود قرآن کی تصریحات کے مطابق بھی صرف ان عورتوں پر ہوتا ہے جن سے باقاعدہ نکاح کیا گیا ہو، اور یہی اس کے ہم معنی اردو لفظ ''بیوی'' کا مفہوم ہے۔

اَزْوَاجُکُم: (۴۳/ ۷۰) اصل میں ازواج کا لفظ استعمال ہوا ہے جو بیویوں کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے اور ایسے لوگوں کے لئے بھی جو کسی شخص کے ہم مشرب، ہم جولی اور ہم جماعت ہوں۔ یہ وسیع المعنی لفظ اسی لیے استعمال کیا گیا ہے تاکہ اس کے مفہوم میں دونوں داخل ہو جائیں۔ اہل ایمان کی مومن بیویاں بھی ان کے ساتھ ہوں گی اور ان کے مومن دوست بھی جنت میں ان کے رفیق ہوں گے۔

اَزْوَاج: (۲۵/۲) ازواج کے معنی ہیں ''جوڑے اور یہ لفظ شوہر اور بیوی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، شوہر کے لیے بیوی ''زوج'' ہے اور بیوی کے لئے شوہر ''زوج''۔

اَزْوَاجَهُمْ: (۲۲/۳۷) اصل میں لفظ ''ازواج'' استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد ان کی وہ بیویاں بھی ہو سکتی ہیں جو اس بغاوت میں ان کی رفیق تھیں، اور وہ سب لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو انہی کی طرح باغی و سرکش اور نافرمان تھے، علاوہ بریں اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ایک قسم کے مجرم الگ الگ جتھوں کی شکل میں جمع کیے جائیں گے۔

فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ: (۲۸/۱۰) متن میں فزیلنا بینھم کے الفاظ ہیں اس کا مفہوم بعض مفسرین نے یہ لیا ہے کہ ہم ان کا باہمی ربط و تعلق توڑ دیں گے تاکہ کسی تعلق کی بنا پر وہ ایک دوسرے کا لحاظ نہ کریں لیکن یہ معنی عربی محاورے کے مطابق نہیں ہیں۔ محاورہ عرب کی رو سے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے درمیان تمیز پیدا کر دیں گے، یا ان کو ایک دوسرے سے ممیز کر دیں گے، اسی معنی کو ادا کرنے کے لیے ہم نے یہ طرز بیان اختیار کیا ہے کہ ''ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے''، یعنی مشرکین اور ان کے معبود آمنے سامنے کھڑے ہوں گے اور دونوں گروہوں کی امتیازی حیثیت ایک دوسرے پر واضح ہوگی، مشرکین جان لیں گے کہ یہ ہیں وہ جن کو ہم دنیا میں معبود بنائے ہوئے تھے اور ان کے معبود جان لیں گے کہ یہ ہیں وہ جنہوں نے ہمیں معبود بنا رکھا تھا۔

زِيْنَتَهُنَّ: (۳۱/۲۴) ''بناؤ سنگھار'' ہم نے ''زینت'' کا ترجمہ کیا ہے، جس کے لئے دوسرا لفظ آرائش بھی ہے۔ اس کا اطلاق تین چیزوں پر ہوتا ہے۔ خوشنما کپڑے، زیور، اور سر، منھ، ہاتھ پاؤں وغیرہ کی مختلف آرائشیں جو بالعموم عورتیں دنیا میں کرتی ہیں، جن کے لئے موجودہ زمانے میں (Makeup) کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ بناؤ سنگھار کس کو نہ دکھایا جائے، اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

(س)

قَوْمِ سَبَاَ: (۱۵/۳۴) قوم سبا تاریخ کی طرف یہ اشارات جو قرآن مجید میں کیے گئے ہیں ان کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ معلومات بھی ہماری نگاہ میں رہیں جو اس قوم کے متعلق دوسرے تاریخی ذرائع سے فراہم ہوئی ہیں۔

تاریخ کی رو سے "سبا" جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم۔ ابن عبد البر اور ترمذی نے رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حسب ذیل قبیلے پیدا ہوئے: کندہ۔ حمیر، ازد، اشعریین، مذحج، انمار (جس کی دو شاخیں ہیں، خثعم اور بجیلہ)، عاملہ، جذام، لخم اور غسان۔

بہت قدیم زمانے میں اس قوم کا شہرہ تھا۔ ۲۵۰۰ء قبل مسیح میں اُور کے کتبات اس کا ذکر سابوم کے نام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابل اور آشور (اسیریا) کتبات میں اور اسی طرح بائیبل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے، (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو زبور، ۷۲: ۱۵، یرمیاہ ۶: ۲۰، حزقی ایل ۲۷: ۲۲۔ ۳۸: ۱۳، ایوب ۶: ۱۹) یونان و روم کے مورخین و جغرافیہ نویس تھیوفراسٹس (۲۸۸ قبل مسیح) کے وقت سے مسیح کے بعد کی کئی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔

اس کا وطن عرب کا جنوبی مغربی کونہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے اس کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔ آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمان (۹۶۵۔۹۲۶ ق م) کے ہاتھ پر ایمان لائی تو اغلب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت مسلمان ہو گئی۔

السَّبْتُ: (۶۵/۲) سبت یعنی ہفتے کا دن، بنی اسرائیل کے لئے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ ہفتے کو آرام اور عبادت کے لیے مخصوص رکھیں، اس روز کسی قسم کا دنیوی کام، حتیٰ کہ کھانا پکانے کا کام بھی خود نہ کریں، نہ اپنے خادموں سے لیں اس باب میں یہاں تک تاکیدی احکام تھے کہ جو شخص اس مقدس دن کی حرمت کو توڑے، وہ واجب القتل ہے (ملاحظہ ہو خروج، باب ۳۱، آیت ۱۲۔۱۷) لیکن جب بنی اسرائیل پر اخلاقی و دینی انحطاط کا دور آیا تو وہ علی الاعلان سبت کی بے حرمتی کرنے لگے حتیٰ کہ ان کے شہروں میں کھلے بندوں سبت کے روز تجارت ہونے لگی۔

السَّبْتُ: (۱۶۳/۷) سبت ہفتہ کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس

قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور اولاد اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اس روز کوئی دنیوی کام نہ کیا جائے، گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے، جانوروں اور لونڈی غلاموں تک سے کوئی خدمت نہ لی جائے اور یہ کہ جو شخص اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے اسے قتل کر دیا جائے لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کر اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی شروع کر دی۔ یرمیاہ نبی کے زمانہ میں (جو ۶۲۸ اور ۵۹۶ قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں) خاص یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ سبت کے دن مال واسباب لے کر گزرتے رہتے، اس پر نبی موصوف نے خدا کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی اس کھلم کھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذر آتش کر دیا جائے گا (یرمیاہ ۱۷: ۲۱۔ ۲۷)۔ اسی کی شکایت حزقی ایل نبی بھی کرتے ہیں کہ جن کا دور ۵۹۵ اور ۵۳۶ قبل مسیح کے درمیان گزرا ہے، چنانچہ ان کی کتاب میں سبت کی بے حرمتی کو یہودیوں کے قومی جرائم میں سے ایک بڑا جرم قرار دیا گیا ہے (حزقی ایل ۲۰: ۱۲۔ ۲۴) ان حوالوں سے یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید یہاں جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہے وہ بھی غالباً اسی دور کا واقعہ ہو گا۔

نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ : (۲/ ۳۰) تسبیح کا لفظ ذو معنین ہے۔ اس کے معنی پاکی بیان کرنے کے بھی ہیں اور سرگرمی کے ساتھ کام اور انہماک کے ساتھ سعی کرنے کے بھی۔ اسی طرح تقدیس کے بھی دو معنی ہیں ایک تقدس کا اظہار و بیان، دوسرے پاک کرنا۔

يُسَبِّحُونَهُ: (۷/ ۲۰۶) تسبیح کرتے ہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا بے عیب اور بے نقص اور بے خطا ہونا، ہر قسم کی کمزوریوں سے اس کا منزہ ہونا، اور اس کا لاشریک اور بے مثل اور بے ہمتا ہونا دل سے مانتے ہیں، اس کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں اور دائماً اس کے اظہار و اعلان میں مشغول رہتے ہیں۔

سَابِقُوا: (۵۷/ ۲۱) اصل میں لفظ سابقوا استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم محض "دوڑ" کے لفظ سے ادا نہیں ہوتا۔ مسابقت کے معنی مقابلے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم دنیا کی دولت اور لذتیں اور فائدے سمیٹنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی جو کوشش کر رہے ہو اسے چھوڑ کر اس چیز کو ہدف مقصود بناؤ اور اس کی طرف دوڑنے میں بازی جیت لے جانے کی کوشش کرو۔

اِبْنِ السَّبِيلِ: (۹/ ۶۰) مسافر خواہ اپنے گھر میں غنی ہو لیکن حالت سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اس کی مدد زکوٰۃ کی مد سے کی جائے گی یہاں بعض فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ جس شخص کا سفر معصیت کے لیے نہ ہو صرف وہی اس آیت کی رو سے مدد کا مستحق ہے، مگر قرآن و حدیث میں ایسی کوئی شرط موجود نہیں ہے اور دین کی اصولی تعلیمات سے ہم کو یہ معلوم

ہوتا ہے کہ جو شخص مدد کا محتاج ہو اس کی دست گیری کرنے میں اس کی گناہ گاری مانع نہ ہونی چاہیے بلکہ فی الواقع گناہ گاروں اور اخلاقی پستی میں گرے ہوئے لوگوں کی اصلاح کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ مصیبت کے وقت ان کو سہارا دیا جائے اور حسن سلوک سے ان کے نفس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے۔

سُبُلَ السَّلٰمِ: (۵/۱۶) ''سلامتی'' سے مراد غلط بینی، غلط اندیشی اور غلط کاری سے بچنا اور اس کے نتائج سے محفوظ رہنا ہے جو شخص اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی زندگی سے روشنی حاصل کرتا ہے اسے فکر و عمل کے ہر چوراہے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان غلطیوں سے محفوظ رہے۔

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ: (۹:۶۰) راہ خدا کا لفظ عام ہے، تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو، اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں، اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے لیکن حق یہ ہے، اور ائمہ سلف کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی وہ جدوجہد جس سے مقصود نظام کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو قائم کرنا ہو، اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں ان کو سفر خرچ کے لئے، سواری کے لئے، آلات و اسلحہ اور سروسامان کی فراہمی کے لیے زکوٰۃ سے مدد دی جا سکتی ہے خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح جو لوگ رضا کارانہ اپنی تمام خدمات اور اپنا تمام وقت، عارضی طور پر یا مستقل طور پر اس کام کے لیے دیدیں ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے زکوٰۃ سے وقتی یا استمراری اعانتیں دی جا سکتی ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ ائمہ سلف کے کلام میں بالعموم اس موقع پر غزو کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قتال کا ہم معنی ہے اس لیے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں فی سبیل اللہ کی جو مد رکھی گئی ہے وہ صرف قتال کے لیے مخصوص ہے لیکن در حقیقت جہاد فی سبیل اللہ، قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جو کلمہ کفر کو پست اور کلمہ خدا کو بلند کرنے اور اللہ کے دین کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لیے کی جائیں، خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلے میں ہوں یا قتال کے آخری مرحلے میں۔

سُجَّدًا: (۱۲/۱۰۰) اس لفظ سجدہ سے بکثرت لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے حتیٰ کہ ایک گروہ نے تو اسی سے استدلال کر کے بادشاہوں اور پیروں کے لیے سجدہ تحیۃ اور سجدہ تعظیمی کا جواز نکال لیا۔ دوسرے لوگوں کو اس قباحت سے بچنے کے لیے اس کی یہ توجیہ کرنی پڑی کہ اگلی شریعتوں میں صرف سجدہ عبادت غیر اللہ کے لیے حرام تھا۔ باقی رہا وہ سجدہ جو عبادت کے جذبہ سے خالی ہو تو وہ خدا کے سوا دوسروں کو بھی کیا جا سکتا ہے، البتہ شریعت محمدی میں ہر قسم کا سجدہ غیر اللہ

کے لیے حرام کر دیا گیا۔ لیکن ساری غلط فہمیاں دراصل اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ لفظ سجدہ کو موجودہ اسلامی اصطلاح کا ہم معنی سمجھ لیا گیا، یعنی ہاتھ، گھٹنے اور پیشانی زمین پر ٹکانا، حالانکہ سجدہ کے اصل معنی محض جھکنے کے ہیں اور یہاں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے، قدیم تہذیب میں یہ عام طریقہ تھا (اور آج بھی بعض ملکوں میں اس کا رواج ہے) کہ کسی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے یا کسی کا استقبال کرنے کے لیے یا محض سلام کرنے کے لیے سینے پر ہاتھ رکھ کر کسی حد تک آگے کی طرف جھکتے تھے۔ اسی جھکاؤ کے لیے عربی میں سجود اور انگریزی میں (Bow) کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ بائبل میں اس کی بکثرت مثالیں ہم کو ملتی ہیں کہ قدیم زمانے میں یہ طریقہ آداب تہذیب میں شامل تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے خیمہ کی طرف تین آدمیوں کو آتے دیکھا تو وہ ان کے استقبال کے لئے دوڑے اور زمین تک جھکے۔ عربی بائبل میں اس موقع پر جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں: فلما نظر رکض لاستقبالھم من باب الخیمة وسجد الیٰ الارض (تکوین:۱۸۔۳)، پھر جس موقع پر یہ ذکر آتا ہے کہ بنی حت نے حضرت سارہ کے دفن کے لیے قبر کی زمین مفت دی وہاں اردو بائبل کے الفاظ یہ ہیں "ابراہام نے اٹھ کر اور بنی حت کے آگے، جو اس ملک کے لوگ ہیں، آداب بجالا کر ان سے یوں گفتگو کی" اور جب ان لوگوں نے قبر کی زمین ہی نہیں بلکہ ایک پورا کھیت اور ایک غار نذر میں پیش کر دیا تب "ابراہام اس ملک کے لوگوں کے سامنے جھکا" مگر عربی ترجمہ میں ان دونوں مواقع پر آداب بجالانے اور جھکنے کے لیے "سجدہ کرنے" ہی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں: فقام ابراھیم وسجد لشعب الارض لبنی حت (تکوین ۲۳۔۷) فسجد ابراھیم امام شعب الارض (۱۲:۲۳) انگریزی بائبل میں ان مواقع پر جو الفاظ آئے ہیں وہ یہ ہیں۔

Bowed himself toward the ground.Bowed himself to the people of the land

and Abraham bowed down himself before the people of the land.

اسی مضمون کی مثالیں بڑی کثرت سے بائبل میں ملتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سجدے کا مفہوم یہ ہے ہی نہیں جو اسلامی اصطلاح کے لفظ "سجدہ" سے سمجھا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے معاملہ کی اس حقیقت کو جانے بغیر اس کی تاویل میں سرسری طور پر یہ لکھ دیا ہے کہ اگلی شریعتوں میں غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنا یا سجدہ تحیۃ بجالانا جائز تھا انہوں نے محض ایک بے اصل بات کہی ہے۔ اگر سجدہ سے مراد وہ چیز ہو جسے اسلامی اصطلاح میں سجدہ کہا جاتا ہے تو وہ خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت میں کبھی بھی غیر اللہ کے لیے جائز نہیں رہا ہے، بائبل میں ذکر آتا ہے کہ بابل کی اسیری کے زمانے میں جب اخسویرس بادشاہ نے ہامان کو اپنا امیر الامراء بنایا اور حکم دیا کہ سب لوگ اس کو سجدہ تعظیمی بجالایا کریں تو مردکی نے جو بنی اسرائیل کے اولیاء میں سے تھے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا (آستر ۳:۱۔۲) تلمود میں اس واقعہ کی شرح کرتے ہوئے اس کی

جو تفصیل دی گئی ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے:

"بادشاہ کے ملازموں نے کہا آخر تو کیوں ہامان کو سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے، ہم بھی آدمی ہیں مگر شاہی حکم کی تعمیل کرتے ہیں، اس نے جواب دیا تم لوگ نادان ہو، کیا ایک فانی انسان جو کل خاک میں مل جانے والا ہے اس قابل ہو سکتا ہے کہ اس کی بڑائی مانی جائے، کیا میں اس کو سجدہ کروں جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، کل بچہ تھا آج جوان ہے، کل بوڑھا ہو گا اور پرسوں مر جائے گا؟ نہیں میں تو اس ازلی و ابدی خدا ہی کے آگے جھکوں گا جو حی و قیوم ہے...... وہ جو کائنات کا خالق اور حاکم ہے، میں تو بس اسی کی تعظیم بجالاؤں گا اور کسی کی نہیں۔"

یہ تقریر نزول قرآن سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے ایک اسرائیلی مومن کی زبان سے ادا ہوئی ہے اور اس میں کوئی شائبہ تک اس تخیل کا نہیں پایا جاتا کہ غیر اللہ کو کسی میں بھی "سجدہ" کرنا جائز ہے۔

البَحرِ المَسجُورِ: (۶/۵۲) اصل میں لفظ البحر المسجور استعمال ہوا ہے۔ اس کے متعدد معنی بیان کیے گئے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کو "آگ سے بھرے ہوئے" کے معنی میں لیا ہے بعض اس کو فارغ اور خالی کے معنی میں لیتے ہیں جس کا پانی زمین میں اتر کر غائب ہو گیا ہو۔ بعض اسے محبوس کے معنی میں لیتے ہیں اور اس کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ سمندر کو روک کر رکھا گیا ہے تا کہ اس کا پانی زمین میں اتر کر غائب نہ ہو جائے اور خشکی پر چھا بھی نہ جائے کہ زمین کے سب باشندے اس میں غرق ہو جائیں۔ بعض اسے مخلوط معنی میں لیتے ہیں جس کے اندر میٹھا اور کھاری، گرم اور سرد ہر طرح کا پانی آ کر مل جاتا ہے اور بعض اس کو لبریز اور موجزن کے معنی میں لیتے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو معنی تو موقع و محل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ سمندر کی یہ دونوں کیفیات کہ اس کی تہ پھٹ کر اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے اور وہ آگ سے بھر جائے، قیامت کے وقت ظاہر ہوں گی، جیسا کہ سورہ تکویر آیت ۶، اور سورہ انفطار آیت ۳ میں بیان ہوا ہے۔ یہ آئندہ رونما ہونے والی کیفیات اس وقت موجود نہیں ہیں کہ ان کی قسم کھا کر آج کے لوگوں کو آخرت کے وقوع کا یقین دلایا جائے۔ اس لئے ان دو معنوں کو ساقط کر کے یہاں البحر المسجور کو محبوس، مخلوط اور لبریز و موجزن کے معنی ہی میں لیا جا سکتا ہے۔

سُجِّرَتْ: (۶/۸۱) اصل میں لفظ سجرت استعمال کیا گیا ہے جو تسجیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے، تسجیر عربی زبان میں تنور کے اندر آگ دہکانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی لیکن اگر پانی کی حقیقت لوگوں کی نگاہ میں ہو تو اس میں کوئی چیز بھی قابل تعجب محسوس نہ ہو گی۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے کہ اس نے آکسیجن اور ھائیڈروجن، دو ایسی گیسوں کو باہم ملایا جن میں سے ایک آگ

بھڑ کانے والی اور دوسری بھڑک اٹھنے والی ہے۔ اور ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادہ پیدا کیا جو آگ بجھانے والا ہے، اللہ کی قدرت کا ایک اشارہ اس بات کے لئے بالکل کافی ہے کہ وہ پانی کی اس ترکیب کو بدل ڈالے اور یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھڑکنے اور بھڑ کانے میں مشغول ہو جائیں جو ان کی اصل بنیادی خاصیت ہے

سِجِّیلٍ مَّنضُودٍ: (۱۱/ ۸۲) پکی ہوئی مٹی کے پتھروں سے مراد شاید وہ متحجر مٹی ہے جو آتش فشاں علاقے میں زیر زمین حرارت و لاوے کے اثر سے پتھر کی شکل اختیار کر لیتی ہے، آج تک بحر لوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں اس انفجار کے آثار نمایاں ہیں۔

سِجِّیل: (۱۰۵/ ۴) اصل الفاظ ہیں ﴿بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّیلٍ﴾ یعنی سجیل کی قسم کے پتھر، ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل فارسی کے الفاظ سنگ اور گل کا معرب ہے اور اس سے مراد وہ پتھر ہے جو مٹی کے گارے سے بنا ہو اور پک کر سخت ہو گیا ہو۔ قرآن مجید سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سورہ ہود آیت ۸۲ اور سورہ حجر آیت ۷۴ میں کہا گیا ہے کہ قوم لوط پر سجیل کی قسم کے پتھر برسائے گئے تھے اور انہی پتھروں کے متعلق سورہ ذاریات آیت ۳۳ میں فرمایا گیا ہے کہ وہ حجارة من طین یعنی مٹی کے گارے سے بنے ہوئے پتھر تھے۔

سِجِّیْنٌ: (۸۳/ ۸) اصل میں لفظ سجین استعمال ہوا ہے جو سجن (جیل یا قیدی خانے) سے ماخوذ ہے اور آگے اس کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ رجسٹر ہے جس میں سزا کے مستحق لوگوں کے اعمال نامے درج کیے جا رہے ہیں۔

سَجیٰ: (۹۳/ ۲) اصل میں رات کے لئے لفظ سجیٰ استعمال ہوا ہے جس میں صرف تاریکی چھا جانے ہی کا نہیں بلکہ سکوت اور سکون طاری ہو جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ رات کی اس صفت کا اس مضمون سے گہرا تعلق ہے جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

الْمُسَحَّرِیْنَ: (۲۶/ ۱۵۳) "سحر زدہ" یعنی دیوانہ و مجنون، جس کی عقل ماری گئی ہو۔ قدیم تصورات کے مطابق پاگل پن یا تو کسی جن کے اثر سے لاحق ہوتا تھا یا جادو کے اثر سے۔ اس لئے وہ جسے پاگل کہنا چاہتے تھے اس کو یا تو "مجنون" کہتے ہیں یا مسحور اور مسحر۔

سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ: (۵۴/ ۲) اصل الفاظ ہیں سحر مستمر۔ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ معاذ اللہ، شب و روز کی جادوگری کا جو سلسلہ محمد ﷺ نے چلا رکھا ہے یہ جادو بھی اسی میں سے ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ پکا جادو ہے، بڑی مہارت سے دکھایا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ جس طرح اور جادو گزر گئے یہ بھی گزر جائے گا۔ اس کا کوئی دیرپا اثر رہنے والا نہیں ہے۔

تُسْحَرُوْن: (۲۳/ ۸۹) اصل الفاظ ہیں انی تسحرون، جن کا لفظی ترجمہ ہے "کہاں سے تم مسحور کیے جاتے ہو۔" سحر اور جادو کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک چیز کو اس کی اصل ماہیت اور صحیح صورت کے خلاف بنا کر دکھاتا ہے اور دیکھنے والے کے ذہن میں یہ غلط تاثر پیدا کرتا ہے

کہ اس شے کی اصلیت وہ ہے جو بناوٹی طور پر ساحر پیش کر رہا ہے۔

سِحْرٌ: (۶/۶۱) اصل میں لفظ سحر استعمال ہوا ہے۔ سحر یہاں جادو کے نہیں بلکہ دھوکے اور فریب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی لغت میں جادو کی طرح اس کے یہ معنی بھی معروف ہیں کہتے ہیں سحرہ ای اخدعہ۔ اس نے فلاں شخص پر سحر کیا، یعنی اس کو فریب دیا۔ دل چھین لینے والی آنکھ کو عین ساحرۃ کہا جاتا ہے یعنی ساحر آنکھ۔ جس زمین میں ہر طرف سراب ہی سراب نظر آئے اس کو ارض ساحرہ کہتے ہیں، چاندی کو ملمع کرکے سونے جیسا کر دیا جائے تو کہتے ہیں سحرت الفضۃ۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ نبی جس کے آنے کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی، اپنے نبی ہونے کی بین نشانیوں کے ساتھ آ گیا تو بنی اسرائیل اور امت عیسیٰ نے اس کے دعوائے نبوت کو صریح فریب قرار دیا۔

سَحِیْق: (۳۱/۲۲) سحیق کا لفظ سحق سے نکلا ہے جس کے اصل معنی پیسنے کے ہیں۔ کسی جگہ کو سحیق اس صورت میں کہیں گے جبکہ وہ اتنی گہری ہو کہ جو چیز اس میں گرے وہ پاش پاش ہو جائے۔

سَخَّر: (۱۴/۳۳) "تمہارے لئے مسخر کیا" کو عام طور پر لوگ غلطی سے "تمہارے تابع کر دیا" کے معنی میں لے لیتے ہیں اور پھر اس مضمون کی آیات سے عجیب عجیب معنی پیدا کرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ بعض لوگ تو یہاں تک سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان آیات کی رو سے تسخیر سمٰوات و ارض انسان کے منتہائے مقصود ہے، حالانکہ انسان کیلئے ان چیزوں کو مسخر کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے قوانین کا پابند بنا رکھا ہے جن کی بدولت وہ انسان کے لیے نافع ہو گئی ہیں، کشتی اگر فطرت کے چند مخصوص قوانین کی پابند نہ ہوتی تو انسان کبھی بحری سفر نہ کر سکتا۔ دریا اگر مخصوص قوانین میں جکڑے ہوئے نہ ہوتے تو کبھی ان سے نہریں نہ نکالی جا سکتیں۔ سورج اور چاند اور روز و شب اگر ضابطوں میں کسے ہوئے نہ ہوتے تو زندگی ہی ممکن نہ ہوتی کجا کہ ایک پھلتا پھولتا انسانی تمدن وجود میں آ سکتا۔

سِدْرَةِ الْمُنْتَهیٰ: (۱۴/۵۳) سدرہ عربی زبان میں بیری درخت کو کہتے ہیں اور منتہیٰ کے معنی ہیں آخری سرا، "سدرۃ المنتہیٰ" کے لغوی معنی ہیں "وہ بیری کا درخت جو آخری یا انتہائی سرے پر واقع ہے۔" علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اس کی تشریح کی ہے کہ الیہا ینتھی علم کل عالم وما ورائھا لا یعلمہ الا اللہ۔ "اس پر ہر عالم کا علم ختم ہو جاتا ہے، آگے جو کچھ ہے اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ قریب قریب یہی تشریح ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور ابن کثیر نے النھایۃ فی غریب الحدیث والاثر میں کی ہے۔ ہمارے لیے یہ جاننا مشکل ہے کہ اس عالم مادی کی آخری سرحد پر وہ بیری کا درخت کیسا ہے اور اس کی حقیقی نوعیت و کیفیت کیا ہے۔ یہ کائنات خداوندی کے وہ اسرار ہیں جن تک ہمارے فہم کی رسائی نہیں ہے۔ بہر حال کوئی

ایسی ہی چیز ہے جس کے لیے انسانی زبان کے الفاظ میں ''سدرہ'' سے زیادہ موزوں لفظ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور کوئی نہ تھا۔

سُدًی: (۷۵/۳۶) عربی زبان میں ابل سدی اس اونٹ کے لئے بولتے ہیں جو یونہی چھوٹا پھر رہا ہو، جدھر چاہے چرتا پھرے، کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ اسی معنی میں ہم شتر بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شتر بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہو؟ کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو؟ کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو؟ اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اس کے اعمال کی باز پرس کی جائے؟

سُرَادِقُهَا: (۱۸/۲۹) سرادق کے اصل معنی ہیں قناتیں اور سراپردے جو کسی خیمہ گاہ کے گرد لگائے جاتے ہیں لیکن جہنم کی مناسبت سے دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ سرادق سے مراد اس کے وہ بیرونی حدود ہیں جہاں تک اس کی لپٹیں پہنچیں اور اس کی حرارت کا اثر ہو۔ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ''اس کے سرادق نے ان کو گھیرے میں لے لیا ہے''۔ بعض لوگوں نے اس کو مستقبل کے معنی میں لیا ہے یعنی وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عالم آخرت میں جہنم کے سراپردے ان کو گھیر لیں گے لیکن ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق سے منہ موڑنے والے ظالم یہیں سے جہنم کی لپٹ میں آچکے ہیں۔ اس سے بچ کر بھاگ نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

الْمُسْرِفِين: (۱۰/ ۸۳) متن میں مسرفین استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنے والا۔ مگر اس لفظی ترجمے سے اس کی اصل روح نمایاں نہیں ہوتی۔ مسرفین سے مراد دراصل وہ لوگ ہیں جو اپنے مطلب کے لیے کسی برے سے برے طریقے کو بھی اختیار کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ کسی ظلم اور کسی بداخلاقی اور کسی وحشت و بربریت کے ارتکاب سے نہیں چوکتے، اپنی خواہشات کے پیچھے ہر انتہا تک جاسکتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی حد نہیں جس پر جا کر وہ رک جائیں۔

السَّاعَة: (۱۱:۲۵) اصل میں لفظ الساعۃ استعمال ہوا ہے۔ ساعت کے معنی گھڑی اور وقت کے ہیں اور ال اس پر عہد کا ہے۔ یعنی وہ مخصوص گھڑی جو آنے والی ہے جس کے متعلق ہم پہلے تم کو خبر دے چکے ہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ لفظ ایک اصطلاح کے طور پر اس وقت خاص کے لئے بولا گیا ہے جب کہ قیامت قائم ہو گی۔ تمام اولین و آخرین از سر نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، سب کو اکٹھا کر کے اللہ تعالیٰ حساب لے گا اور ہر ایک کو اسکے عقیدہ و عمل کے لحاظ سے جزا و سزا دے گا۔

سَكِينَتَه': (۴۸/۲۶) یہاں سکینت سے مراد صبر اور وقار جس کے ساتھ نبی ﷺ اور مسلمانوں نے کفار قریش کی اس جاہلانہ حمیت کا مقابلہ کیا۔ وہ ان کی اس ہٹ دھرمی اور صریح زیادتی پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر نہ ہوئے اور ان کے جواب میں کوئی بات انہوں نے ایسی نہ

کی جو حق سے متجاوز اور راستی کے خلاف ہو یا جس سے معاملہ بخیر و خوبی سلجھنے کے بجائے اور زیادہ بگڑ جائے۔

السَّكِيْنَةَ: (۱۸/۴۸) یہاں سکینت سے مراد دل کی وہ کیفیت ہے جس کی بنا پر ایک شخص کسی مقصد عظیم کے لیے ٹھنڈے دل سے پورے سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو خطرے میں جھونک دیتا ہے اور کسی خوف یا گھبراہٹ کے بغیر فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ کام بہر حال کرنے کا ہے خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔

السَّكِيْنَةَ: (۴/۴۸) سکینت عربی زبان میں سکون و اطمینان اور ثبات قلب کو کہتے ہیں اور یہاں اللہ تعالیٰ مومنوں کے دل میں اس کے نازل کیے جانے کو اس فتح کا ایک اہم سبب قرار دے رہا ہے جو حدیبیہ کے مقام پر اسلام اور مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔

المَسٰكِيْن: (۶۰/۹) مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بے چارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں، اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں، نبی ﷺ نے اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کو مستحق امداد ٹھیرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں۔ مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انہیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے، چنانچہ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے کہ المسكين الذي لا يجد غنى يغنيه ولا يفطن له فيتصدق عليه ولا يقوم فيسأل الناس۔ ''مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا، اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے'' گویا وہ ایک ایسا شریف آدمی ہے جو غریب ہو۔

سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا: (۱۵۳/۴) صریح فرمان سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر لکھ کر دیے گئے تھے۔ سورۂ اعراف، رکوع ۱۷ میں اس کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ اور عہد سے مراد وہ میثاق ہے جو کوہ طور کے دامن میں بنی اسرائیل کے نمائندوں سے لیا گیا تھا۔ سورۂ بقرہ آیت ۶۳ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے اور اعراف آیت ۱۷۱ میں پھر اس کی طرف اشارہ آئے گا۔

سُلْطٰنِيَهْ: (۲۹/۶۹) اصل الفاظ ہیں ﴿هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ﴾ سلطان کا لفظ دلیل و حجت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اقتدار کے لئے بھی۔ اگر اسے دلیل و حجت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جو دلیل بازیاں میں کیا کرتا تھا وہ یہاں نہیں چل سکتیں، میرے پاس اپنی صفائی میں پیش کرنے کے لیے اب کوئی حجت نہیں رہی۔ اور اقتدار کے معنی میں لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ دنیا میں جس طاقت کے بل بوتے پر میں اکڑتا تھا وہ یہاں ختم ہو چکی ہے۔ اب یہاں کوئی میرا

لشکر نہیں، کوئی میرا حکم ماننے والا نہیں۔ میں ایک بے بس اور لاچار بندے کی حیثیت سے کھڑا ہوں جو اپنے دفاع کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

نَسۡلُکُهٗ: (۱۵/۱۲) سلک کے معنی عربی زبان میں کسی چیز کو دوسری چیز میں چلانے، گزرنے اور پرونے کے ہیں، جیسے تاگے کو سوئی کے ناک میں گزارنا، پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کے اندر تو یہ ذکر قلب کی ٹھنڈک اور روح کی غذا بن کر اترتا ہے، مگر مجرموں کے دلوں میں یہ شتابہ بن کر لگتا ہے اور ان کے اندر اسے سن کر ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے گویا کہ ایک گرم سلاخ تھی جو سینے کے پار ہو گئی۔

السَّلٰمُ: (۵۹/۲۳) اصل میں لفظ السلام استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں سلامتی۔ کسی کو سلیم یا سالم کہنے کے بجائے سلامتی کہنے سے خود بخود مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کو حسین کہنے کے بجائے حسن کہا جائے تو اسکے معنی یہ ہوں گے کہ وہ سراپا حسن ہے۔ اللہ تعالیٰ کو السلام کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سراسر سلامتی ہے۔ اس کی ذات اس سے بالاتر ہے کہ کوئی آفت، یا کمزوری یا خامی اس کو لاحق ہو یا کبھی اسکے کمال پر زوال آئے۔

الاِسۡلَام: (۳/۱۹) یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظام زندگی اور ایک ہی طریقہ حیات صحیح و درست ہے اور وہ یہ کہ انسان اللہ کو اپنا مالک و معبود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سپرد کر دے اور اس کی بندگی بجالانے کا طریقہ خود نہ ایجاد کرے بلکہ اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے جو ہدایت بھیجی ہے ہر کمی و بیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے، اسی طرز فکر و عمل کا نام "اسلام" ہے اور یہ بات سراسر بجا ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اپنی مخلوق اور رعیت کے لیے اس اسلام کے سوا کسی دوسرے طرز عمل کو جائز تسلیم نہ کرے، آدمی اپنی حماقت سے اپنے آپ کو دہریت سے لے کر شرک و بت پرستی تک ہر نظریے اور ہر مسلک کی پیروی کا جائز حق دار سمجھ سکتا ہے مگر فرماں روائے کائنات کی نگاہ میں تو یہ نری بغاوت ہے۔

السَّلَمَ: (۴/۹۴) ابتدائے اسلام میں "السلام علیکم" کا لفظ مسلمانوں کے لیے شعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنی میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمہارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں، میرے پاس تمہارے لیے سلامتی و عافیت کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا تم نہ مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو، جس طرح فوج میں ایک لفظ شعار (Password) کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ فوج مخالف کے آدمیوں سے ممیز ہوں، اسی طرح سلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں شعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا، خصوصیت کے ساتھ اس زمانہ میں اس

شعار کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے نو مسلموں اور کافروں کے درمیان لباس، زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو۔

اَسۡلِمۡ: (۲/۱۳۱) مسلم وہ جو خدا کے آگے سر اطاعت خم کر دے، خدا ہی کو اپنا مالک، آقا، حاکم اور معبود مان لے جو اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دے اور اس ہدایت کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے، جو خدا کی طرف سے آئی ہو، اس عقیدے اور اس طرز عمل کا نام ''اسلام'' ہے اور یہی تمام انبیاء کا دین تھا جو ابتدائے آفرینش سے دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں آئے

بِسَلٰمٍ: (۵۰/۳۴) اصل الفاظ ہیں ادخلوھا بسلام۔ سلام کو اگر سلامتی کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہر قسم کے رنج اور غم اور فکر اور آفات سے محفوظ ہو کر اس جنت میں داخل ہو جاؤ اور اگر اسے سلام کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ آؤ اس جنت میں اللہ اور اس کے ملائکہ کی طرف سے تم کو سلام ہے۔

دَارُ السَّلٰمِ: (۶/۱۲۷) ''سلامتی کا گھر'' یعنی جنت جہاں انسان ہر آفت اور ہر خرابی سے مامون ہو گا۔

سَلٰماً: (۱۹/۶۲) اصل میں لفظ ''سلام'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں عیب اور نقص سے محفوظ۔ جنت میں جو نعمتیں انسان کو میسر ہوں گی ان میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہو گی کہ وہاں کوئی بیہودہ اور فضول اور گندی بات سننے میں نہ آئے گی۔ وہاں کا پورا معاشرہ ایک ستھرا اور سنجیدہ اور پاکیزہ معاشرہ ہو گا جس کا ہر فرد سلیم الطبع ہو گا۔ وہاں کے رہنے والوں کو غیبتوں اور گالیوں اور فحش گانوں اور دوسری بری آوازوں کی سماعت سے پوری نجات مل جائے گی۔ وہاں آدمی جو کچھ بھی سنے گا۔ بھلی اور معقول اور بجا باتیں ہی سنے گا۔ اس نعمت کی قدر وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اس دنیا میں فی الواقع ایک پاکیزہ اور ستھرا ذوق رکھتا ہو۔ کیونکہ وہی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ انسان کے لیے ایک ایسی گندی سوسائٹی میں رہنا کتنی بری مصیبت ہے جہاں کسی وقت بھی اس کے کان جھوٹ، غیبت، فتنہ فساد، شرارت، گندگی اور شہوانیت کی باتوں سے محفوظ نہ ہوں۔

وَسَلِّمُوا تَسۡلِيۡمًا: (۳۳/۵۶) سلام کا لفظ بھی دو معنی رکھتا ہے، ایک ہر طرح کی آفات اور نقائص سے محفوظ رہنا، جس کے لئے ہم اردو میں سلامتی کا لفظ بولتے ہیں دوسرے صلح اور عدم مخالفت۔ پس نبی ﷺ کے حق میں سلموا تسلیما کہنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم ان کے حق میں کامل سلامتی کی دعا کرو اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم پوری طرح دل و جان سے انکا ساتھ دو، ان کی مخالفت سے پرہیز کرو، اور ان کے سچے فرمانبردار بن کر رہو۔

سٰمِدُوۡنَ: (۵۳/۶۱) اصل میں لفظ سامدون استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی اہل لغت نے بیان کیے ہیں۔ ابن عباس، عکرمہ اور ابو عبیدہ نحوی کا قول ہے کہ یمنی زبان میں سمود کے معنی

گانے بجانے کے ہیں اور آیت کا اشارہ اس طرف ہے کہ کفار مکہ قرآن کی آواز کو دبانے اور لوگوں کی توجہ دوسری طرف ہٹانے کے لیے زور زور سے گانا شروع کر دیتے تھے دوسرے معنی ابن عباس اور مجاہد نے یہ بیان کیے ہیں کہ السمود البرطمه وهي رفع الراس تكبرا، كانوا يمرون على النبي ﷺ غضابا مبرطمين۔ یعنی سمود تکبر کے طور پر سر نیوڑھانے کو کہتے ہیں، کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے جب گزرتے تھے تو غصے کے ساتھ منہ اوپر اٹھائے ہوئے نکل جاتے تھے راغب اصفہانی نے مفردات میں بھی یہی معنی اختیار کیے ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے سامدون کا مفہوم قتادہ نے غافلون اور سعید بن جبیر نے معرضون بیان کیا ہے۔

سَامِراً: (۲۳/۶۷) اصل میں لفظ ''سامرا'' استعمال کیا گیا ہے سمر کے معنی ہیں رات کے وقت بات چیت کرنا۔ گپیں ہانکنا۔ قصے کہانیاں کہنا۔ دیہاتی اور قصباتی زندگی میں یہ راتوں کی گپیں عموماً چوپالوں میں ہوا کرتی ہیں اور یہی اہل مکہ کا بھی دستور تھا۔ (مزید تفصیل کیلئے دیکھئے ص ۲۰۸)

السَّمُوْم: (۵۲/۲۷) اصل میں لفظ سموم استعمال ہوا ہے جس کے معنی سخت گرم ہوا کے ہیں۔ اس سے مراد لو کی وہ لپٹیں ہیں جو دوزخ سے اٹھ رہی ہوں گی۔

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: (۲۴/۳۵) آسمانوں اور زمین کا لفظ قرآن مجید میں بالعموم ''کائنات'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہذا دوسرے الفاظ میں آیت کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا نور ہے۔

سَمِيًّا: (۱۹/۶۵) اصل میں لفظ سمی استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی ''ہم نام'' کے ہیں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے، کیا کوئی دوسرا اللہ بھی تمہارے علم میں ہے؟ اگر نہیں ہے اور تم جانتے ہو کہ نہیں ہے تو پھر تمہارے لیے اس کے سوا اور راستہ ہی کونسا ہے کہ ان کی بندگی کرو اور اس کے حکم کے بندے بن کر رہو۔

السَّمُوْم: (۱۵/۲۷) سموم گرم ہوا کو کہتے ہیں اور نار سموم کی طرف نسبت دینے کی صورت میں اس کے معنی آگ کے بجائے تیز حرارت کے ہو جاتے ہیں، اس سے ان مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے جہاں قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جن آگ سے پیدا کیے گئے ہیں۔

سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَق: (۴۴/۵۳) اصل میں سندس اور استبرق کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، سندس عربی زبان میں باریک ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں اور استبرق فارسی ستبر کا معرب ہے اور یہ دبیز ریشمی کپڑے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

مَسْنُوْن: (۱۵/۲۶) مسنون کے دو معنی ہیں ایک معنی ہیں متغیر، منتن اور املس، یعنی ایسی سڑی ہوئی جس میں سڑنے کی وجہ سے چکنائی پیدا ہو گئی ہو، دوسرے معنی ہیں مصور اور مصبوب، یعنی قالب میں ڈھلی ہوئی جس کو ایک خاص صورت دے دی گئی ہو۔

سُوَاعًا: (۷۱/۲۳) سواع قبیلہ ہذیل کی دیوی تھی اور اس کا بت عورت کی شکل کا بنایا گیا

تھا۔ینبوع کے قریب رباط کے مقام پر اس کا مندر واقع تھا۔

السّاق: (۲۹/۷۵) مفسرین میں سے بعض نے لفظ ساق (پنڈلی) کو عام لغوی معنی میں لیا ہے اور اس کے لحاظ سے مراد یہ ہے کہ مرنے کے وقت جب ٹانگیں سوکھ کر ایک دوسری سے جڑ جائیں گی۔اور بعض نے عربی محاورے کے مطابق اسے شدت اور سختی اور مصیبت کے معنی میں لیا ہے، یعنی اس وقت دو مصیبتیں ایک ساتھ جمع ہو جائیں گی، ایک دنیا اور اس کی ہر چیز سے جدا ہو جانے کی مصیبت، جس سے ہر کافر و منافق اور ہر فاسق و فاجر کو سابقہ پیش آئے گا۔

سَوَّلَتْ: (۱۸/۱۲) علامہ زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں:

''سَوَّلَتْ (سهّلت من السوَلِ وهو الا ستر خاء) لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا (عظيمًا ارتكبتموه من يوسف وهونته فى اعينكم).

(سولت کے معنی سہلت کے ہیں یعنی آسان کر دیا (اس کا مادہ سول ہے، یعنی نرم ہو جانا، جھک جانا) تمہارے نفوس نے تمہارے لیے اس بھاری کام کو جس کا ارتکاب تم نے یوسف کے معاملے میں کیا اور تمہاری نگاہوں میں اسے معمولی چیز بنا دیا)۔

بخلاف اس کے سورۂ طٰہٰ کی آیت ۹۶ میں سولت کا وہ مفہوم موقع و محل سے مناسبت نہیں رکھتا، جو سورۂ یوسف کے ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ یہاں سامری اپنی صفائی پیش کر رہا ہے اس لیے یہاں میں نے تسویل کو تحسین کے معنی میں لیا ہے۔اور اس کی گنجائش بھی لغت میں موجود ہے۔'' التسويل، تحسين الشیء وتزيينه الى الانسان ليفعله او يقوله''۔(تسویل کے معنی یہ ہیں کہ کسی شے کو انسان کے لیے خوشنما اور مزین بنا دیا جائے تا کہ وہ اسے کرے یا کہے) گویا سامری یہ کہہ رہا ہے کہ ''میرے سامنے ایک اچھے کام کی حیثیت سے پیش کیا''۔

اسی مفہوم کو میں نے 'بھانے' کے لفظ سے ادا کیا ہے۔اردو زبان میں ایسے مواقع پر بھانا قریب قریب اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس میں تسویل کا لفظ عربی زبان میں استعمال کیا جاتا ہے۔شاہ عبدالقادر صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

''یہی مصلحت دی مجھ کو میرے جی نے''۔

امام راغبؒ نے بھی اپنی مفردات القرآن میں تسویل کے معنی تزیین و تحسین بیان کیے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

'' التسويل: تزيين النفس لما تحرض عليه وتصوير القبيح منه بصورة الحسن''۔

(تسویل سے مراد یہ ہے کہ انسان کا نفس اپنی انگیخت کو اس کے لیے مزین کر دے اور برائی کو اس کے لیے خوبصورت بنا کر پیش کرے)

قاموس میں ہے:'' سوّلت له' نفسه' كذا: زيّنت والا سول من فى اسفله استرخاء''۔

لین (Lane) نے اپنی لغت مدّ القاموس میں سوّل کے معنی درج کیے ہیں:۔

(Made it appear easy to him) (اس بات کو اس کے لیے آسان بنادیا)

(رسائل ومسائل حصہ پنجم ص ۱۴۷۔۱۵۰)

السَّیِّات: (۹/۴۰) "سیئات" (برائیوں) کا لفظ تین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور تینوں ہی یہاں مراد ہیں، ایک غلط عقائد اور بگڑے ہوئے اخلاق اور برے اعمال۔ دوسرے، گمراہی اور اعمال بد کا وبال، تیسرے، آفات اور مصائب اور اذیتیں خواہ وہ اس دنیا میں ہوں یا عالم برزخ کی، یا روز قیامت کی۔ فرشتوں کی دعا کا مقصود یہ ہے کہ ان کو ہر اس چیز سے بچا جو انکے حق میں بری ہو۔

اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ: (۷/۵۴) خدا کے استواء علی العرش (تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہونے) کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے، بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے بعد کسی مقام کو اپنی اس لامحدود سلطنت کا مرکز قرار دے کر اپنی تجلیات کو وہاں مرتکز فرمادیا ہو اور اسی کا نام عرش ہو جہاں سے سارے عالم پر وجود اور قوت کا فیضان بھی ہو رہا ہے اور تدبیر امر بھی فرمائی جارہی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش سے مراد اقتدار فرماں روائی ہو اور اس پر جلوہ افروز ہونے سے مراد یہ ہو کہ اللہ نے کائنات پیدا کر کے اس کی زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی، بہر حال استواء علی العرش کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو، قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبر کائنات بھی ہے، وہ دنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر کہیں بیٹھ نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جزو کل پر فرماں روائی کر رہا ہے، سلطانی و حکمرانی کے تمام اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں، ہر چیز اس کے امر تابع ہے، ذرہ ذرہ اس کے فرمان کا مطیع ہے اور موجودات کی قسمتیں دائماً اس کے حکم سے وابستہ ہیں، اس طرح قرآن اس بنیادی غلط فہمی کی جڑ کاٹنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور کبھی خود مختاری و خودسری کی ضلالت میں، خدا کو کائنات کے انتظام سے عملاً بے تعلق سمجھ لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی قسمت کو دوسروں سے وابستہ سمجھے اور انکے آگے سر جھکادے یا پھر اپنی قسمت کا مالک خود اپنے آپ کو سمجھے اور خود مختار بن بیٹھے۔

یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے، قرآن مجید میں خدا اور خلق کو واضح کرنے کے لیے انسانی زبان میں سے زیادہ تر وہ الفاظ، مصطلحات، استعارے اور انداز بیان انتخاب کیے گئے ہیں جو سلطنت و بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں، یہ طرز بیان قرآن میں اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی شخص جو سمجھ کر قرآن کو پڑھتا ہو اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا، بعض کم فہم ناقدین کے معکوس دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ کتاب جس عہد کی "تصنیف" ہے اس زمانہ میں انسان کے ذہن پر شاہی نظام کا تسلط تھا اس لیے مصنف نے (جس سے مراد ان ظالموں کے نزدیک محمد ﷺ ہیں)

خود کو بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا۔ حالانکہ دراصل قرآن جس دائمی وابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں بادشاہی صرف ایک ذات کی ہے اور حاکمیت (Sovereignty) جس شے کا نام ہے وہ اسی ذات کے لیے خاص ہے، اور یہ نظام کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے لہٰذا اس نام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جزوی یا کلی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے نیز یہ کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے انسان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسی ایک ذات کو مذہبی معنوں میں واحد معبود بھی مانے اور سیاسی و تمدنی معنوں میں واحد سلطان (Sovereign) بھی تسلیم کرے۔

سَوَآءَ السَّبِیۡل: (۱۲/۵) "سواء السبیل" کا ترجمہ "توسط واعتدال کی شاہراہ" کیا جاسکتا ہے مگر اس سے پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا، اسی لیے ہم نے ترجمہ میں اصل لفظ ہی کو جوں کا توں لے لیا ہے۔

اس لفظ کی معنویت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ انسان بجائے خود اپنی ذات میں ایک عالم اصغر ہے جس کے اندر بے شمار مختلف قوتیں اور قابلیتیں ہیں، خواہشیں ہیں، جذبات اور رجحانات ہیں، نفس اور جسم کے مختلف مطالبے ہیں، روح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں۔ پھر ان افراد کے ملنے سے جو اجتماعی زندگی بنتی ہے وہ بھی بے حد وحساب پیچیدہ تعلقات سے مرکب ہوتی ہے اور تمدن و تہذیب کے نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں، پھر دنیا میں جو سامان زندگی انسان کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اس سے کام لینے اور اس کو انسانی تمدن میں استعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بکثرت شاخ در شاخ مسائل پیدا کرتا ہے۔

انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پورے عرصہ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس بناپر انسان اپنے لیے خود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو، اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے، اس کے سارے جذبات ورجحانات میں توازن قائم رہے، اس کے سب اندرونی وبیرونی تقاضے تناسب کے ساتھ پورے ہوں، اس کی اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ملحوظ ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے اور مادی اشیاء کو بھی شخصی اور تمدنی زندگی میں عدل، انصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہے، جب انسان خود اپنا رہنما اور اپنا شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو، زندگی کی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک مسئلہ اس کے دماغ پر اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ یا بلاارادہ بے انصافی

کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی اس رائے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ بے اعتدالی کی کسی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چلنے لگتی ہے، پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنے آخری حدود پر پہنچتے پہنچتے انسان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پہلو اور وہ ضروریات اور وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی، بغاوت شروع کر دیتے ہیں اور زور لگانا شروع کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو۔ مگر ان کے ساتھ انصاف پھر بھی نہیں ہوتا، کیونکہ پھر وہی عمل رونما ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک جو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے زیادہ دبایا گیا تھا، انسانی دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے مخصوص مقتضاء کے مطابق ایک خاص رخ پر بہالے جاتا ہے جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگتی ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ وہ ہچکولے ہی کھاتی رہتی ہے اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھلکتی چلی جاتی ہے۔ تمام وہ راستے جو خود انسان نے اپنی زندگی کے لیے بنائے ہیں، خط منحنی کی شکل میں واقع ہیں، غلط سمت سے چلتے ہیں اور غلط سمت پر ختم ہو کر پھر کسی دوسری غلط سمت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔

ان بہت سے ٹیڑھے اور غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں واقع ہو، جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ اس کے تمام جذبات و رجحانات کے ساتھ، اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ، اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ، کوئی کجی، کسی پہلو کی بے جا رعایت اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہ ہو، انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء اور اس کی کامیابی و بامرادی کے لیے سخت ضروری ہے۔ انسان کی عین فطرت اس راہ کی طالب ہے اور مختلف ٹیڑھے راستوں سے بار بار اس کے بغاوت کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس سیدھی شاہراہ کو ڈھونڈتی ہے۔ مگر انسان خود اس شاہراہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے، اس کی طرف صرف خدا راہ نمائی کر سکتا ہے اور خدا نے اپنے رسول اسی لیے بھیجے ہیں کہ اس راہ راست کی طرف انسان کی راہنمائی کریں۔

قرآن اسی راہ کو سواء السبیل اور صراط مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دنیا کی اس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بے شمار ٹیڑھے راستوں کے درمیان سے سیدھی گزرتی چلی جاتی ہے جو اس پر چلا، وہ یہاں راست رو اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے اور جس نے اس راہ کو گم کر دیا، وہ یہاں غلط رو اور غلط کار ہے اور آخرت میں لامحالہ اسے دوزخ میں جانا ہے کیونکہ زندگی کے تمام ٹیڑھے راستے دوزخ ہی کی طرف جاتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے در پے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتی چلی جارہی ہے، یہ غلط نتیجہ نکال لیا کہ ''جدلی عمل'' (Dialectical

(Process) انسانی زندگی کے ارتقاء کا فطری طریق ہے، وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقاء کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعویٰ (Thesis) اسے ایک رخ پر بہالے جائے پھر اس کے جواب میں دوسرا ویسا ہی انتہا پسندانہ دعویٰ (Antithesis) اسے دوسری انتہا کی طرف کھینچے۔ اور پھر دونوں کے امتزاج (Synthesis) سے ارتقاء حیات کا راستہ بنے، حالانکہ دراصل یہ ارتقاء کی راہ نہیں ہے بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء میں بار بار مانع ہو رہے ہیں، ہر انتہا پسندانہ دعویٰ زندگی کو اس کے کسی ایک پہلو کی طرف موڑتا ہے اور اسے کھینچے چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ سواء السبیل سے بہت دور جا پڑتی ہے تو خود زندگی ہی کی بعض دوسری حقیقتیں، جن کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی اس کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہیں اور یہ بغاوت ایک جوابی دعوے کی شکل اختیار کر کے اسے مخالف سمت میں کھینچنا شروع کرتی ہے۔ جوں جوں سواء السبیل قریب آتی ہے ان متصادم دعووں کے درمیان مصالحت ہونے لگتی ہے اور ان کے درمیان امتزاج سے وہ چیزیں وجود میں آتی ہیں جو انسانی زندگی میں نافع ہیں لیکن جب وہاں نہ سواء السبیل کے نشانات دکھانے والی روشنی موجود ہوتی ہے اور نہ اس پر ثابت قدم رکھنے والا ایمان تو وہ جوابی دعویٰ زندگی کو اس مقام پر ٹھیرنے نہیں دیتا بلکہ اپنے زور میں اسے دوسری جانب انتہا تک کھینچتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ پھر زندگی کی کچھ دوسری حقیقتوں کی نفی شروع ہو جاتی ہے اور نتیجہ میں ایک دوسری بغاوت اٹھ کھڑی ہوتی ہے، اگر ان کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انہوں نے سواء السبیل کو دیکھ لیا ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے لیے ارتقاء کا صحیح راستہ یہی سواء السبیل ہے نہ کہ خط منحنی پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتے پھرنا۔

سَوّٰاھَا: (۹۱/۷) ہموار کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ایسا جسم عطا کیا جو اپنے قامتِ راست اور اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنے دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے موزوں ترین تھا، اس کو دیکھنے سننے، چھونے، چکھنے اور سونگھنے کے ایسے حواس عطا کیے جو اپنے تناسب اور اپنی خصوصیات کی بنا پر اس کے لئے بہترین ذریعہ علم بن سکتے تھے۔ اس کو قوت عقل و فکر، قوت استدلال و استنباط، قوت خیال، قوت حافظہ، قوت تمیز، قوت فیصلہ، قوت ارادی اور دوسری ایسی ذہنی قوتیں عطا کیں جن کی بدولت وہ دنیا میں اس کام کے قابل ہوا جو انسان کے کرنے کا ہے۔ اس کے علاوہ ہموار کرنے میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اسے پیدائشی گناہ گار اور جبلی بدمعاش بنا کر نہیں بلکہ راست اور سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس کی ساخت میں کوئی خلقی کجی نہیں رکھ دی کہ وہ سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔

سَائِبَة: (۵/۱۰۳) سائبہ اس اونٹ یا اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی منت کے پورا ہونے یا کسی بیماری سے شفا پانے یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطور شکرانہ کے پن کر دیا گیا ہو، نیز جس

اونٹنی نے دس مرتبہ بچے دیے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو اسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

سَائِحَات : (۶۶/۵) اصل میں لفظ سائحات استعمال ہوا ہے۔ متعدد صحابہ اور بکثرت تابعین نے اس کے معنی صائمات بیان کئے ہیں۔ روزے کے لئے سیاحت کا لفظ جس مناسبت سے استعمال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں سیاحت زیادہ تر راہب اور درویش لوگ کیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ کوئی زادِ راہ نہیں ہوتا تھا۔ اکثر ان کو اس وقت تک بھوکا رہنا پڑتا تھا جب تک کہیں سے کچھ کھانے کو نہ مل جائے۔ اس بنا پر یہ روزہ بھی ایک طرح کی درویشی ہی ہے کہ جب تک افطار کا وقت نہ آئے روزہ دار بھی بھوکا رہتا ہے۔ ابن جریر نے سورہ توبہ آیت ۱۲ کی تفسیر میں حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ سیاحة هذه الامة الصيام، ''اس امت کی سیاحت (یعنی درویشی) روزہ ہے''۔ اس مقام پر نیک بیویوں کی تعریف میں ان کی روزہ داری کا ذکر اس معنی میں نہیں کیا گیا ہے کہ وہ محض رمضان کے فرض روزے رکھتی ہیں بلکہ اس معنی میں ہے کہ وہ فرض کے علاوہ نفل روزے بھی رکھا کرتی ہیں۔

السَّآئِحُونَ : (۱۱۲/۹) متن میں لفظ السآئحون استعمال ہوا ہے جس کی تفسیر بعض مفسرین نے الصائمون (روزہ رکھنے والے) سے کی ہے لیکن سیاحت کے معنی روزہ، مجازی معنی ہیں، اصل لغت میں اس کے یہ معنی نہیں ہیں اور جس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی علیہ ﷺ نے خود اس لفظ کے یہ معنی ارشاد فرمائے ہیں، اس کی نسبت حضور علیہ ﷺ کی طرف درست نہیں ہے، اس لئے ہم اس کو اصل لغوی معنی ہی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں، پھر جس طرح قرآن میں بکثرت مواقع پر مطلقاً انفاق کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی خرچ کرنے کے ہیں اور مراد اس سے راہ خدا میں خرچ کرنا ہے، اسی طرح یہاں بھی سیاحت سے مراد محض گھومنا پھرنا نہیں ہے بلکہ ایسے مقاصد کے لیے زمین میں نقل و حرکت کرنا ہے جو پاک اور بلند ہوں اور جن میں اللہ کی رضا مطلوب ہو، مثلاً اقامت دین کے لیے جہاد، کفر زدہ علاقوں سے ہجرت، دعوت دین، اصلاح خلق، طلب علم صالح، مشاہدہ آثار الٰہی اور تلاش رزق حلال۔ اس صفت کو یہاں مومنین کی صفات میں خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ جو آدمی ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود جہاد کی پکار پر گھروں سے نہیں نکلے تھے ان کو یہ بتایا جائے کہ حقیقی مومن ایمان کا دعویٰ کر کے اپنی جگہ چین سے بیٹھا نہیں رہ جاتا بلکہ وہ خدا کے دین کو قبول کرنے کے بعد اس کا بول بالا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے دنیا میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرتا پھرتا ہے۔

سَالَ : (۱/۷۰) اصل الفاظ ہیں سال سائل۔ بعض مفسرین نے یہاں سوال کو پوچھنے کے معنی میں لیا ہے اور وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب جس کی ہمیں خبر دی جارہی ہے، کس پر واقع ہو گا؟ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ کافروں پر واقع ہو گا، لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ سوال کو مانگنے اور مطالبہ کرنے کے معنی

میں لیا ہے۔ نسائی اور دوسرے محدثین نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ نضر بن حارث بن کلدہ نے کہا تھا ﴿اللّٰهُمَّ اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَقُّ مِنۡ عِنۡدِكَ فَاَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائۡتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ﴾۔ (الانفال، آیت ۳۲) ''خدایا اگر یہ واقعی تیری ہی طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔'' اس کے علاوہ متعدد مقامات پر قرآن مجید میں کفار مکہ کے اس چیلنج کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ لے کیوں نہیں آتے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: یونس: آیت ۴۶ تا ۴۸، الانبیاء: ۳۶ تا ۴۱، نمل: ۶۷ تا ۷۲، سبا: ۲۶ تا ۳۰، یٰسٓ: ۴۵ تا ۵۲، الملک: ۲۴ تا ۲۷۔

السَّائِل: (۱۰/۹۳) اس کے دو معنی ہیں اگر سائل کو مدد مانگنے والے حاجت مند کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مدد کر سکتے ہو تو کر دو، نہ کر سکتے ہو تو نرمی کے ساتھ معذرت کر دو۔ مگر بہر حال اسے جھڑ کو نہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے جواب میں ہے کہ ''تم نادار تھے پھر اس نے تمہیں مالدار کر دیا'' اور اگر سائل کو پوچھنے والے، یعنی دین کا کوئی مسئلہ یا حکم دریافت کرنے والے کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص خواہ کیسا ہی جاہل اور اجڈ ہو اور بظاہر خواہ کتنے ہی نامعقول طریقے سے یہ سوال کرے یا اپنے ذہن کی الجھن پیش کرے، بہر حال شفقت کے ساتھ اسے جواب دو اور علم کا زعم رکھنے والے بدمزاج لوگوں کی طرح اسے جھڑک کر دور نہ بھگا دو۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے جواب میں ہے کہ ''تم ناواقف راہ تھے پھر اس نے تمہیں ہدایت بخشی''۔ حضرت ابو الدرداءؓ، حسن بصریؒ، سفیان ثوری اور بعض دوسرے بزرگوں نے اسی دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے کیونکہ ترتیب کلام کے لحاظ سے یہ ارشاد ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ کے جواب میں آتا ہے۔

(ش)

شَآءَ رَبُّکَ: (۶/ ۱۱۲) مشیت اور رضا: یہاں ہماری سابق تشریحات کے علاوہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہیے کہ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی رضا میں بہت بڑا فرق ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوئی ہیں، کسی چیز کا اللہ کی مشیت اور اس کے اذن کے تحت رونما ہونا لازمی طور پر یہ معنی نہیں رکھتا کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی واقعہ کبھی صدور میں نہیں آتا جب تک اللہ اس کے صدور کا اذن نہ دے اور اپنی عظیم الشان اسکیم میں اس کے صدور کی گنجائش نہ نکالے اور اسباب کو اس حد تک مساعد نہ کر دے کہ وہ واقعہ صادر ہو سکے، کسی چور کی چوری، کسی قاتل کا قتل، کسی ظالم و مفسد کا ظلم و فساد اور کسی کافر و مشرک کا کفر و شرک اللہ کی مشیت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اسی طرح کسی مومن اور کسی متقی انسان کا ایمان و تقویٰ بھی مشیت الٰہی کے بغیر محال ہے۔ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر مشیت کے تحت رونما ہوتے ہیں۔ مگر پہلی قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے اور اس کے برعکس دوسری قسم کے واقعات کو اس کی رضا اور اس کی پسندیدگی و محبوبیت کی سند حاصل ہے، اگرچہ آخر کار کسی خیر عظیم ہی کے لئے فرمانروائے کائنات کی مشیت کام کر رہی ہے لیکن اس خیر عظیم کے ظہور کا راستہ نور و ظلمت، خیر و شر اور صلاح و فساد کی مختلف قوتوں کے ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما ہونے ہی سے صاف ہوتا ہے، اس لیے اپنی بزرگ تر مصلحتوں کی بنا پر وہ طاعت و معصیت، ابراہیمیت اور نمرودیت، موسویت اور فرعونیت، آدمیت اور شیطنت، دونوں کو اپنا اپنا کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس نے اپنی ذی اختیار مخلوق (جن اور انسان) کو خیر اور شر میں سے کسی ایک کے انتخاب کر لینے کی آزادی عطا کر دی ہے جو چاہے اس کارگاہ عالم میں اپنے لیے خیر کا کام پسند کر لے اور جو چاہے شر کا کام۔ دونوں قسم کے کارکنوں کو، جس حد تک خدائی مصلحتیں اجازت دیتی ہیں اسباب کی تائید نصیب ہوتی ہے لیکن اللہ کی رضا اور اس کی پسندیدگی صرف خیر ہی کے لئے کام کرنے والوں کو حاصل ہے اور اللہ کو محبوب یہی بات ہے کہ اس کے بندے اپنی آزادی انتخاب سے فائدہ اٹھا کر خیر کو اختیار کریں نہ کہ شر کو۔

اس کے ساتھ یہ بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ دشمنان حق کی مخالفانہ کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مشیت کا بار بار حوالہ دیتا ہے۔ اس سے مقصود دراصل نبی ﷺ کو، اور آپ کے ذریعہ سے اہل ایمان کو، یہ سمجھانا ہے کہ تمہارے کام کی نوعیت فرشتوں

کے کام کی سی نہیں ہے جو کسی مزاحمت کے بغیر احکام الٰہی کی تعمیل کر رہے ہیں۔ بلکہ تمہارا اصل کام شریروں اور باغیوں کے مقابلہ میں اللہ کے پسند کردہ طریقہ کو غالب کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ہے، اللہ اپنی مشیت کے تحت ان لوگوں کو بھی کام کرنے کا موقع دے رہا ہے جنہوں نے اپنی سعی و جہد کے لئے خود اللہ سے بغاوت کے راستے کو اختیار کیا ہے، اور اسی طرح وہ تم کو بھی جنہوں نے طاعت و بندگی کے راستے کو اختیار کیا، کام کرنے کا پورا موقع دیتا ہے، اگرچہ اس کی رضا اور ہدایت و رہنمائی اور تائید و نصرت تمہارے ساتھ ہے کیونکہ تم اس پہلو میں کام کر رہے ہو جسے وہ پسند کرتا ہے لیکن تمہیں یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی فوق الفطری مداخلت سے ان لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دے گا جو ایمان نہیں لانا چاہتے یا ان شیاطین جن و انس کو زبردستی تمہارے راستہ سے ہٹا دے گا جنہوں نے اپنے دل و دماغ کو اور دست و پا کی قوتوں کو اور اپنے وسائل و ذرائع کو حق کی راہ روکنے کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نہیں، اگر تم نے واقعی حق اور نیکی اور صداقت کے لئے کام کرنے کا عزم کیا ہے تو تمہیں باطل پرستوں کے مقابلہ میں سخت کشمکش اور جدوجہد کر کے اپنی حق پرستی کا ثبوت دینا ہو گا۔ ورنہ معجزوں کے زور سے باطل کو مٹانا اور حق کو غالب کرنا ہوتا تو تمہاری ضرورت ہی کیا تھی، اللہ خود ایسا انتظام کر سکتا تھا کہ دنیا میں کوئی شیطان نہ ہوتا اور کسی شرک و کفر کے ظہور کا امکان نہ ہوتا۔

مُتَشٰبِهٰت: (۳/۷) متشابہات یعنی وہ آیات جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے زندگی کا کوئی راستہ تجویز نہیں کیا جا سکتا جب تک کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس میں انسان کی حیثیت اور ایسے ہی دوسرے بنیادی امور کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات انسان کو نہ دی جائیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماوراء ہیں جو انسانی علم کی گرفت میں نہ کبھی آئی ہیں، نہ آسکتی ہیں جن کو اس نے نہ کبھی دیکھا نہ چھوا، نہ چکھا، ان کے لیے انسانی زبان میں نہ ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو انہی کے لیے وضع کیے گئے ہوں اور نہ ایسے معروف اسالیب بیان مل سکتے ہیں، جن سے ہر سامع کے ذہن میں ان کی صحیح تصویر کھنچ جائے، لامحالہ یہ ناگزیر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کو بیان کرنے کے لئے الفاظ اور اسالیب بیان وہ استعمال کئے جائیں جو اصل حقیقت سے قریب تر مشابہت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لیے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں چنانچہ مابعد الطبیعی مسائل کے بیان میں قرآن کے اندر ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں یہ زبان استعمال ہوئی ہے۔

لیکن اس زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب تک پہنچا دے یا اس کا ایک دھندلا سا تصور پیدا کر دے۔ ایسی آیات کے مفہوم کو متعین کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے گی، اتنے ہی زیادہ اشتباہات و احتمالات سے سابقہ پیش آئے گا حتیٰ کہ

انسان حقیقت سے قریب تر ہونے کے بجائے اور زیادہ دور ہوتا چلا جائے گا، پس جو لوگ طالب حق ہیں اور ذوق فضول نہیں رکھتے وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اس دھندلے تصور پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کے لیے کافی ہے اور اپنی تمام تر توجہ محکمات پر صرف کرتے ہیں، مگر جو لوگ بوالفضول یا فتنہ جو ہوتے ہیں ان کا تمام تر مشغلہ متشابہات ہی کی بحث وتنقیب ہوتا ہے۔

شَجَرَةً: (۲۰/۲۳) مراد ہے زیتون جو بحر روم کے گرد و پیش کے علاقے کی پیداوار میں سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ اس کا درخت ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ہزار برس تک چلتا ہے، حتیٰ کہ فلسطین کے بعض درختوں کا قد و قامت اور پھیلاؤ دیکھ کر اندازہ کیا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کے زمانے سے اب تک چلے آرہے ہیں، طور سیناء کی طرف اس کو منسوب کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہی علاقہ جس کا مشہور ترین اور نمایاں ترین مقام طور سیناء ہے، اس درخت کا وطن اصلی ہے۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّار: (۲۹/۴۸) اصل الفاظ ہیں اشداء علی الکفار۔ عربی زبان میں کہتے ہیں فلان شدید علیہ۔ فلاں شخص اس پر شدید ہے یعنی اس کو رام کرنا اور اپنے مطلب پر لانا اس کے لیے مشکل ہے۔ کفار پر اصحاب محمد ﷺ کے سخت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ درشتی اور تند خوئی سے پیش آتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی پختگی، اصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے کفار کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کا حکم رکھتے ہیں وہ موم کی ناک نہیں ہیں کہ انہیں کافر جدھر چاہیں موڑ دیں۔ وہ نرم چارہ نہیں ہیں کہ کافر انہیں آسانی کے ساتھ چبا جائیں۔ انہیں کسی خوف سے دبایا نہیں جا سکتا۔ انہیں کسی ترغیب سے خریدا نہیں جا سکتا۔ کافروں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ انہیں اس مقصد عظیم سے ہٹا دیں جس کے لئے وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر محمد ﷺ کا ساتھ دینے کے لئے اٹھے ہیں۔

شِدَادًا: (۱۲/۷۸) مضبوط کا لفظ اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ ان کی سرحدیں اتنی مستحکم ہیں کہ ان میں ذرہ برابر تغیر و تبدل نہیں ہونے پاتا اور ان سرحدوں کو پار کر کے عالم بالا کے بے شمار ستاروں اور سیاروں میں سے کوئی نہ ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے اور نہ تمہاری زمین پر آگرتا ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ: (۱/۹۴) سینہ کھولنے کا لفظ قرآن مجید میں جن مواقع پر آیا ہے ان پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں۔

(۱) سورہ انعام آیت ۱۲۵ میں فرمایا: ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَه‘ يَشْرَحْ صَدْرَه‘ لِلْاِسْلَامِ﴾ ”پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے“۔ اور سورہ زمر آیت ۲۲ میں فرمایا ﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَه‘ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾۔ ”تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہو پھر وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہو۔۔۔“۔ ان دونوں مقامات پر شرح صدر سے مراد ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردد سے پاک

ہو کر اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی عقائد، وہی اصول اخلاق و تہذیب و تمدن اور وہی احکام و ہدایات بالکل صحیح ہیں جو اسلام نے انسان کو دیے ہیں۔

(۲) سورہ شعراء آیت ۱۲۔۱۳ میں ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰ کو جب اللہ تعالیٰ نبوت کے منصب عظیم پر مامور کر کے فرعون اور اس کی عظیم سلطنت سے جا ٹکرانے کا حکم دے رہا تھا تو انہوں نے عرض کیا کہ ﴿رَبِّ اِنِّیٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ o وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ﴾ ''میرے رب میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے۔'' اور سورہ طٰہٰ آیت ۲۵۔۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسی موقع پر حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْٓ اَمْرِیْ﴾۔ ''میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام آسان کر دے''۔ یہاں سینے کی تنگی سے مراد یہ ہے کہ نبوت جیسے کار عظیم کا بار سنبھالنے اور تن تنہا کفر کی ایک جابر و قاہر طاقت سے ٹکر لینے کی آدمی کی ہمت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرح صدر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بلند ہو جائے، کسی بڑی سے بڑی مہم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو انجام دینے میں بھی اسے تامل نہ ہو اور نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی اس میں ہمت پیدا ہو جائے۔

غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں معنی مراد ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت سے پہلے رسول اللہ ﷺ مشرکین عرب، نصاریٰ، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے اور اس حنیفیت پر بھی مطمئن نہ تھے جو عرب کے بعض قائلین توحید میں پائی جاتی تھی کیونکہ یہ ایک مبہم عقیدہ تھا جس میں راہ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی لیکن آپ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہ راست کیا ہے، اس لئے آپ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا تھے۔ نبوت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس خلجان کو دور کر دیا اور وہ راہ راست کھول کر آپ کے سامنے رکھ دی جس سے آپ کو کامل اطمینان قلب حاصل ہو گیا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ حوصلہ، وہ ہمت اور وہ اولوالعزمی اور وہ وسعت قلب عطا فرمادی جو اس منصب عظیم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے درکار تھی، آپ اس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سمانہ سکتا تھا۔ آپ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دور کرنے اور سنوار دینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ آپ اس قابل ہو گئے کہ جاہلیت میں مستغرق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اکھڑ معاشرے میں کسی سروسامان اور ظاہرا کسی پشت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جائیں، مخالفت اور دشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے سے نہ ہچکچائیں۔ اس راہ میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پیش آئیں ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں اور کوئی طاقت آپ کو اپنے موقف سے نہ ہٹا سکے۔ یہ شرح صدر کی بیش بہا دولت جب اللہ نے آپ کو عطا کر دی ہے تو آپ ان

مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغاز کار کے اس مرحلے میں پیش آ رہی ہیں۔

بعض مفسرین نے شرح صدر کو شق صدر کے معنی میں لیا ہے اور اس آیت کو اس معجزہ شق صدر کا ثبوت قرار دیا ہے جو احادیث کی روایات میں بیان ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معجزے کے ثبوت کا مدار احادیث کی روایات ہی پر ہے۔ قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرح صدر کو کسی طرح بھی شق صدر کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ حمل الشرح فی الآیۃ علی شق الصدر ضعیف عند المحققین۔ "محققین کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شق صدر پر محمول کرنا ایک کمزور بات ہے"۔

يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ: (۱۲۵/۶) سینہ کھول دینے سے مراد اسلام کی صداقت پر پوری طرح مطمئن کر دینا اور شکوک و شبہات اور تذبذب و تردد کو دور کر دینا ہے۔

شَرَّ: (۲/۱۱۳) چہارم یہ کہ شر کا لفظ نقصان، ضرر، تکلیف اور الم کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اور ان اسباب کے لئے بھی جو نقصان و ضرر اور تکلیف و الم کے موجب ہوتے ہیں۔ مثلاً بیماری، بھوک، کسی حادثے یا جنگ میں زخمی ہونا، آگ سے جل جانا، سانپ بچھو وغیرہ سے ڈسا جانا، اولاد کی موت کے غم میں مبتلا ہونا اور ایسے ہی دوسرے شرور پہلے معنی میں شر ہیں کیونکہ یہ بجائے خود تکلیف اور اذیت ہیں، بخلاف اس کے مثال کے طور پر کفر شرک اور ہر قسم کے گناہ اور ظلم دوسرے معنی میں شر ہیں کیونکہ ان کا انجام نقصان اور ضرر ہے اگرچہ بظاہر ان سے فی الوقت کوئی تکلیف نہ پہنچتی ہو بلکہ بعض گناہوں سے لذت ملتی یا نفع حاصل ہوتا ہو پس شر سے پناہ مانگنا ان دونوں مفہومات کا جامع ہے۔

شَرَعَ: (۴۲/۱۳) فرمایا کہ شرع لکم، "مقرر کیا تمہارے لئے"۔ شرع کے لغوی معنی راستہ بنانے کے ہیں۔ اور اصطلاحاً اس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے۔ عربی زبان میں اسی اصطلاحی معنی کے لحاظ سے تشریع کا لفظ قانون سازی (Legislation) کا، شرع اور شریعت کا لفظ قانون (Law) کا اور شارع کا لفظ واضع قانون (Lawgiver) کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تشریع خداوندی دراصل فطری اور منطقی نتیجہ ہے ان اصولی حقائق کا جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئے ہیں کہ اللہ ہی کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے اور وہی انسان کا حقیقی ولی ہے اور انسانوں کے درمیان جس امر میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اسی کا کام ہے۔ اب چونکہ اصولاً اللہ ہی مالک اور ولی اور حاکم ہے، اس لئے لامحالہ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ انسان کے لیے قانون و ضابطہ بنائے اور اسی کی ذمہ داری ہے کہ انسانوں کو یہ قانون و ضابطہ دے، چنانچہ اپنی اس ذمہ داری کو اس نے یوں ادا کیا۔

شُرَكٰٓؤُا: (۴۲/۲۱) اس آیت میں شرکاء سے مراد، ظاہر بات ہے کہ وہ شریک نہیں

ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں، یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، یا جن کے آگے پوجاپاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں بلکہ لامحالہ ان سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اخلاقی اصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور ضابطوں کو اپنے مذہبی مراسم اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں میں، اور اپنی سیاست اور حکومت میں اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی ان کو کرنی چاہیے، یہ ایک پورا کا پورا دین ہے جو اللہ رب العالمین کی تشریع کے خلاف، اور اس کے اذن (Sanction) کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے ایجاد کیا اور ماننے والوں نے مان لیا۔ اور یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۱۳۴۔ ۱۹۶۔ ۲۶۲۔ ۳۶۶، ۳۶۷، ۴۳۷۔ ۴۳۸، ۴۹۸۔ ۴۹۹، ۵۷۷۔ ۵۷۸، ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ جلد دوم: ص ۱۸۹۔ ۱۹۰، ۲۹۲ تا ۲۹۴، ۴۸۲۔ ۴۸۳، ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ جلد سوم: ص ۳۱، ۶۹، ۶۵۶۔ جلد چہارم: سبا آیت ۴۱۔ حاشیہ ۶۳۔ یٰس آیت ۶۰ حاشیہ ۵۳۔

شُرَکَآؤُھُم: (۶/ ۱۳۷) "شریکوں" کا لفظ ایک دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اوپر کے معنی سے مختلف ہے، اوپر کی آیت میں جنہیں "شریک" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا وہ ان کے معبود تھے جن کی برکت یا سفارش یا توسط کو یہ لوگ نعمت کے حصول میں مددگار سمجھتے تھے اور شکر نعمت کے استحقاق میں انہیں خدا کے ساتھ حصہ دار بناتے تھے، بخلاف اس کے اس آیت میں "شریک" سے مراد وہ انسان اور شیطان ہیں جنہوں نے قتل اولاد کو ان لوگوں کی نگاہ میں ایک جائز اور پسندیدہ فعل بنادیا تھا۔ انہیں شریک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے جس طرح پرستش کا مستحق تنہا اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح بندوں کے لیے قانون بنانے اور جائز و ناجائز کی حدیں مقرر کرنے کا حق دار بھی صرف اللہ ہے، لہٰذا جس طرح کسی دوسرے کے آگے پرستش کے افعال میں سے کوئی فعل کرنا اسے خدا کا شریک بنانے کا ہم معنی ہے، اسی طرح کسی کے خود ساختہ قانون کو برحق سمجھتے ہوئے اس کی پابندی کرنا اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کو واجب الاطاعت ماننا بھی اسے خدائی میں اللہ کا شریک قرار دینے کا ہم معنی ہے۔ یہ دونوں افعال بہرحال شرک ہیں، خواہ ان کا مرتکب ان ہستیوں کو زبان سے الٰہ اور رب کہے یا نہ کہے جن کے آگے وہ نذر و نیاز پیش کرتا ہے یا جن کے مقرر کیے ہوئے قانون کو واجب الاطاعت مانتا ہے۔

شَیٰطِیۡنِھِم: (۲/ ۱۴) شیطان عربی زبان میں سرکش، متمرد اور شوریدہ سر کو کہتے ہیں۔ انسان اور جن دونوں کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطین جن کے

لیے آیا ہے لیکن بعض مقامات پر شیطان صفت انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان مراد ہیں اور کہاں جن۔

الشَّيَاطِيْن: (۱۰۲/۲) شیاطین سے مراد شیاطین جن اور شیاطین انس دونوں ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔

شَيْطَان: (۳۶/۲) قرآن میں بالعموم "شیاطین" کا لفظ انہی جنوں اور ان کی ذریت (نسل) کے لیے استعمال ہوا ہے اور جہاں شیاطین سے مراد انسان مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہ ہو وہاں یہی شیطان جن مراد ہوتے ہیں۔

الشِّعْرٰى: (۴۹/۵۳) شعریٰ آسمان کا روشن ترین تارا ہے جسے مرزم الجوزاء، الکلب الاکبر، الکلب الجبار، الشعری العبور وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کو Sirius اور Dog Star اور Canis Majoris کہتے ہیں۔ یہ سورج سے ۲۳ گنا زیادہ روشن ہے، مگر زمین سے اس کا فاصلہ آٹھ سال نوری سے بھی زیادہ ہے اس لیے۔ یہ سورج سے چھوٹا اور کم روشن نظر آتا ہے۔ اہل مصر اس کی پرستش کرتے تھے، کیونکہ اس کے طلوع کے زمانے میں نیل کا فیضان شروع ہوتا تھا، اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ یہ اسی کے طلوع کا فیضان ہے، جاہلیت میں اہل عرب کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ یہ ستارہ لوگوں کی قسمتوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اسی بنا پر یہ عرب کے معبودوں میں شامل تھا اور خاص طور پر قریش کا ہمسایہ قبیلہ خزاعہ اس کی پرستش کے لئے مشہور تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری قسمتیں شعریٰ نہیں بناتا بلکہ اس کا رب بناتا ہے۔

شَعَآئِرَ اللّٰهِ: (۲/۵) ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے یا طرز فکر و عمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو، وہ اس کا "شعار" کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کے لیے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے، سرکاری جھنڈے، فوج اور پولیس وغیرہ کے یونیفارم، سکے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکوموں سے، بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے، سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں، چوٹی اور زنار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں۔ کیس اور کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں، ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیت کا شعار ہے، سواستیکا آریہ نسل پرستی کا شعار ہے، یہ سب مسلک اپنے اپنے پیرووں سے اپنے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے، اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اسی نظام سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے ارتداد اور بغاوت کا ہم معنی ہے۔

"شعائر اللہ" سے مراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک و کفر اور دہریت کے بالمقابل خالص خدا پرستی کے مسلک کی نمائندگی کرتی ہوں، ایسی علامات جہاں جس مسلک اور جس نظام

میں بھی پائی جائیں مسلمان ان کے احترام پر مامور ہیں، بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پس منظر خالص خدا پرستانہ ہو، کسی مشرکانہ یا کافرانہ تخیل کی آلودگی سے انہیں ناپاک نہ کردیا گیا ہو۔" کوئی شخص خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اپنے عقیدہ و عمل میں خدائے واحد کی بندگی و عبادت کا کوئی جزء رکھتا ہے، تو اس جز کی حد تک مسلمان اس سے موافقت کریں گے اور ان شعائر کا بھی پورا احترام کریں گے جو اس کے مذہب میں خالص خدا پرستی کی علامت ہوں۔ اس چیز میں ہمارے اور اس کے درمیان نزاع نہیں بلکہ موافقت ہے نزاع اگر ہے تو اس امر میں نہیں کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ شعائر اللہ کے احترام کا یہ حکم اس زمانہ میں دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں اور مشرکین قبائل کے لوگ حج و زیارت کے لیے کعبہ کی طرف جاتے تھے اور بہت سے قبیلوں کے راستے مسلمانوں کی زد میں تھے۔ اس وقت حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک ہی سہی، تمہارے اور ان کے درمیان جنگ ہی سہی، مگر جب یہ خدا کے گھر کی طرف جاتے ہیں تو انہیں نہ چھیڑو، حج کے مہینوں میں ان پر حملہ نہ کرو، خدا کے دربار میں نذر کرنے کے لئے جو جانور یہ لیے جا رہے ہوں ان پر ہاتھ نہ ڈالو، کیونکہ ان کے بگڑے ہوئے مذہب میں خدا پرستی کا جتنا حصہ باقی ہے وہ بجائے خود احترام کا مستحق ہے نہ کہ بے احترامی کا۔

احرام بھی من جملہ شعائر اللہ ہے اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے۔ اس لیے شعائر اللہ ہی کے سلسلہ میں اس کا ذکر کردیا گیا کہ جب تک تم احرام بند ہو، شکار کرنا خدا پرستی کے شعائر میں سے ایک شعار کی توہین کرنا ہے۔ البتہ جب شرعی احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے۔

شَقَقْنَا: (۲۶/۸۰) زمین کو پھاڑنے سے مراد اس کو اس طرح پھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گٹھلیاں یا نباتات کی پنیریاں انسان اس کے اندر بوئے یا جو ہواؤں اور پرندوں کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقے سے اس کے اندر پہنچ جائیں وہ کونپلیں نکال سکیں۔ انسان اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا کہ زمین کو کھودتا ہے یا اس میں ہل چلاتا ہے اور جو تخم خدا نے پیدا کردئے ہیں انہیں زمین کے اندر اتار دیتا ہے۔ اس کے سوا سب کچھ خدا کا کام ہے۔ اسی نے بے شمار اقسام کی نباتات کے تخم پیدا کیے ہیں۔ اسی نے ان تخموں میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کر وہ ان تخموں کو کھولے اور ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کے مناسب حال غذا پہنچا کر اسے نشو ونما دے۔ یہ تخم ان خاصیتوں کے ساتھ اور زمین کی یہ بالائی تہیں ان صلاحیتوں کے ساتھ خدا نے پیدا نہ کی ہوتیں تو کیا انسان کوئی غذا بھی یہاں پا سکتا تھا؟

الشّٰکِرِین: (۱۴۵) "شکر کرنے والوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی اس نعمت کے

قدر شناس ہوں کہ اس نے دین کی صحیح تعلیم دے کر انہیں دنیا اور اس کی محدود زندگی سے بہت زیادہ وسیع، ایک ناپیدا کنار عالم کی خبر دی، اور انہیں اس حقیقت سے آگاہی بخشی کہ انسانی سعی و عمل کے نتائج صرف اس دنیا کی چند سالہ زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس زندگی کے بعد ایک دوسرے عالم تک ان کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔ یہ وسعت نظر اور یہ دور بینی و عاقبت اندیشی حاصل ہو جانے کے بعد جو شخص اپنی کوششوں اور محنتوں کو اس دنیوی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں بار آور ہوتے نہ دیکھے، یا ان کا برعکس نتیجہ نکلتا دیکھے اور اس کے باوجود اللہ کے بھروسہ پر وہ کام کرتا چلا جائے جس کے متعلق اللہ نے اسے یقین دلایا ہے کہ بہر حال آخرت میں اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلے گا، وہ شکر گزار بندہ ہے برعکس اس کے جو لوگ اس کے بعد بھی دنیا پرستی کی تنگ نظری میں مبتلا رہیں جن کا حال یہ ہو کہ دنیا میں جن غلط کوششوں کے بظاہر اچھے نتائج نکلتے نظر آئیں ان کی طرف وہ آخرت کے برے نتائج کی پروا کیے بغیر جھک پڑیں اور جن صحیح کوششوں کے یہاں بار آور ہونے کی امید نہ ہو یا جن سے یہاں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو، ان میں آخرت کے نتائج خیر کی امید پر اپنا وقت اپنے مال اور اپنی قوتیں صرف کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، وہ ناشکرے ہیں اور اس علم کے ناقدر شناس ہیں جو اللہ نے انہیں بخشا ہے۔

شَاکِرًا: (۱۴۷/۴) اصل میں لفظ ''شاکر'' استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے ''قدر دان'' کیا ہے۔ شکر جب اللہ کی طرف سے بندے کی جانب ہو تو اس کے معنی ''اعتراف خدمت'' یا قدر دانی کے ہوں گے اور جب بندے کی طرف سے اللہ کی جانب ہو تو اس کو اعتراف نعمت یا احسان مندی کے معنی میں لیا جائے گا، اللہ کی طرف سے بندوں کا شکریہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ناقدر شناس نہیں ہے، جتنی اور جیسی خدمات بھی بندے اس کی راہ میں بجا لائیں، اللہ کے ہاں ان کی قدر کی جاتی ہے۔ کسی کی خدمات صلہ و انعام سے محروم نہیں رہتیں، بلکہ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ ہر شخص کو اس کی خدمت سے زیادہ صلہ دیتا ہے، بندوں کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے نہیں کیا ہے اس پر محاسبہ کرنے میں وہ بہت نرمی اور چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور جو کچھ کیا ہے، اس کی قدر اس کے مرتبے سے بڑھ کر کرتا ہے۔

شَکَرْتُم: (۱۴۷/۴) شکر کے اصل معنی اعتراف نعمت یا احسان مندی کے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رویہ اختیار نہ کرو، بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تم کو سزا دے۔

ایک محسن کے مقابلہ میں صحیح احسان مندانہ رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے، انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام شکر ہے اور اس شکر کا اقتضاء یہ ہے کہ اولاً آدمی احسان کو اسی طرف منسوب کرے جس نے دراصل احسان کیا ہے، کسی دوسرے کو احسان کے شکریہ اور

نعمت کے اعتراف میں اس کا حصہ دار نہ بنائے، ثانیاً آدمی کا دل اپنے محسن کے لیے محبت اور وفاداری کے جذبہ سے لبریز ہو اور اس کے مخالفوں سے محبت اور وفاداری کا ذرہ برابر تعلق بھی نہ رکھے، ثالثاً وہ اپنے محسن کا مطیع و فرمانبردار ہو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے منشاء کے خلاف استعمال نہ کرے۔

شَكُورٍ: (۳۳/۴۲) شکر کرنے والے سے مراد وہ شخص ہے جسے تقدیر الٰہی خواہ کتنا ہی اونچا اٹھالے جائے وہ اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ کا احسان سمجھتا رہے، اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے، اس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے ان نعمتوں پر ہی مرکوز رہے جو برے سے برے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں اور خوشحالی و بدحالی، دونوں حالتوں میں اس کی زبان اور اس کے دل سے اپنے رب کا شکر ہی ادا ہوتا رہے۔

شَانِئَكَ: (۳/۱۰۸) اصل میں لفظ شانئک استعمال ہوا ہے، شانئی شنأ سے ہے جس کے معنی ایسے بغض اور ایسی عداوت کے ہیں جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰىٓ اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ ''اور اے مسلمانو کسی گروہ کی عداوت تمہیں اس زیادتی پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم انصاف نہ کرو''۔ پس شانئک سے مراد ہر وہ شخص ہے جو رسول اللہ ﷺ کی دشمنی اور عداوت میں ایسا اندھا ہو گیا ہو کہ آپؐ کو عیب لگاتا ہو، آپؐ کے خلاف بدگوئی کرتا ہو، آپؐ کی توہین کرتا ہو اور آپؐ پر طرح طرح کی باتیں چھانٹ کر اپنے دل کا بخار نکالتا ہو۔

شِهَابٌ مُّبِيْنٌ: (۱۸/۱۵) شہاب مبین کے لغوی معنی ''شعلہ روشن'' کے ہیں دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کے لیے ''شہاب ثاقب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی ''تاریکی کو چھیدنے والا شعلہ'' اس سے مراد ضروری نہیں کہ وہ ٹوٹنے والا تارہ ہی ہو جسے ہماری زبان میں اصطلاحاً شہاب ثاقب کہا جاتا ہے، ممکن ہے کہ یہ اور کسی قسم کی شعائیں ہوں، مثلاً کائناتی شعاعیں (Cosmic Rays) یا ان سے بھی زیادہ شدید کوئی اور قسم جو ابھی ہمارے علم میں نہ آئی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہاب ثاقب مراد ہوں جنہیں کبھی کبھی ہماری آنکھیں زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھتی ہیں، زمانہ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دوربین سے دکھائی دینے والے شہاب ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف نظر آتے ہیں ان کی تعداد کا اوسط ۱۰ کھرب روزانہ ہے، جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے، ان کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سکنڈ ہوتی ہے اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سکنڈ تک دیکھی گئی ہے، بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے، چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرقی علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر

صبح تک ۲ لاکھ شہاب ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے (انسائکلو پیڈیا برٹانیکا۔۱۹۴۶ء جلد ۱۵۔ ص ۳۳۷۔۳۹) ہو سکتا ہے کہ یہی بارش عالم بالا کی طرف شیاطین کی پرواز میں مانع ہوتی ہو، کیونکہ زمین کے بالائی حدود سے گزر کر فضائے بسیط میں ۱۰ کھرب روزانہ کے اوسط سے ٹوٹنے والے تاروں کی برسات ان کے لیے اس فضا کو بالکل ناقابل عبور بنادیتی ہو گی۔

الشَّهَادَة: (۶/ ۷۳) وہ سب کچھ جو مخلوقات کے لیے ظاہر و معلوم ہے۔

الشُّهَدَآء: (۴/ ۶۹) شہید کے اصل معنی گواہ کے ہیں، اس سے مراد وہ شخص جو اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے طرز عمل سے شہادت دے، اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے کو بھی شہید اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ جان دے کر ثابت کر دیتا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لایا تھا، اسے واقعی سچے دل سے حق سمجھتا تھا اور اسے اتنا عزیز رکھتا تھا کہ اس کے لیے جان قربان کرنے میں بھی اس نے دریغ نہ کیا ایسے راستباز لوگوں کو بھی شہید کہا جاتا ہے جو اس قدر قابل اعتماد ہوں کہ جس چیز پر وہ شہادت دیں اس کا صحیح و برحق ہونا بلا تامل تسلیم کر لیا جائے۔

شَاهِدًا: (۴۸/ ۸) شاہ ولی اللہ صاحب نے شاہد کا ترجمہ "اظہار حق کنندہ" فرمایا ہے اور دوسرے مترجمین اس کا ترجمہ "گواہی دینے والا" کرتے ہیں۔ شہادت کا لفظ ان دونوں مفہومات پر حاوی ہے۔

شُهَدَآء: (۳/ ۱۴۰) اصل الفاظ ہیں ویتخذ منکم شھداء۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم میں سے کچھ شہید لینا چاہتا تھا یعنی کچھ لوگوں کو شہادت کی عزت بخشنا چاہتا تھا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اور منافقین کے اس مخلوط گروہ میں سے جس پر تم اس وقت مشتمل ہو، ان لوگوں کو الگ چھانٹ لینا چاہتا تھا جو حقیقت میں شھداء علی الناس ہیں یعنی اس منصب جلیل کے اہل ہیں جس پر ہم نے امت مسلمہ کو سرفراز کیا ہے۔

شَهِيقًا: (۶۷/ ۷) اصل میں لفظ شھیق استعمال ہوا ہے جو گدھے کی سی آواز کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس فقرے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خود جہنم کی آواز ہو گی اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ آواز جہنم سے آ رہی ہو، جہاں ان لوگوں سے پہلے گرے ہوئے لوگ چیخیں مار رہے ہوں گے۔

شُوَاظٌ: (۵۵/ ۳۵) اصل میں شواظ اور نحاس کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ شواظ اس خالص شعلے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دھواں نہ ہو۔

المَشْئَمَة: (۵۶/ ۹) اصل میں لفظ اصحاب المشئمہ استعمال ہوا ہے۔ مشئمہ، شئوم سے ہے جس کے معنی بدبختی، نحوست اور بدفالی کے ہیں اور عربی زبان میں بائیں ہاتھ کو بھی شومیٰ کہا جاتا ہے۔ اردو میں شومیٔ قسمت اسی لفظ سے ماخوذ ہے، اہل عرب شمال (بائیں ہاتھ) اور شئوم (فال بد) کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں بایاں ہاتھ کمزوری اور ذلت کا نشان تھا، سفر کو

جاتے ہوئے اگر پرندہ اٹھ کر بائیں ہاتھ کو جاتا تو وہ اس کو بری فال سمجھتے تھے۔ کسی کو اپنے بائیں ہاتھ بٹھاتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہ اسے کمتر درجے کا آدمی سمجھتے ہیں۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہو کہ میرے ہاں اس کی کوئی عزت نہیں تو کہا جاتا کہ فلان منی بالشمال ''وہ تو میرے بائیں ہاتھ کی طرف ہے''۔ اردو میں بھی کسی کام کو بہت ہلکا اور آسان قرار دینا ہو تو کہا جاتا ہے یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پس اصحاب المشئمہ سے مراد ہیں بدبخت لوگ یا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت سے دوچار ہوں گے اور دربار الٰہی میں بائیں طرف کھڑے ہو جائیں گے۔

(ص)

صَبًّا: (۲۵/۸۰) اس سے مراد بارش ہے۔ سورج کی حرارت سے بے حد و حساب مقدار میں سمندروں سے پانی بھاپ بنا کر اٹھایا جاتا ہے پھر اس سے کثیف بادل بنتے ہیں، پھر ہوائیں ان کو لے کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلاتی ہیں، پھر عالم بالا کی ٹھنڈک سے وہ بھاپیں از سر نو پانی کی شکلیں اختیار کرتی ہیں اور ہر علاقے میں ایک خاص حساب سے برستی ہیں، پھر وہ پانی براہ راست بھی زمین پر برستا ہے، زیر زمین کنوؤں اور چشموں کی شکل بھی اختیار کرتا ہے، دریاؤں اور ندی نالوں کی شکل میں بھی بہتا ہے اور پہاڑوں پر برف کی شکل میں جم کر پھر پگھلتا ہے اور بارش کے موسم کے سوا دوسرے موسموں میں بھی دریاؤں کے اندر رواں ہوتا ہے۔ کیا یہ سارے انتظامات انسان نے خود کیے ہیں؟ اس کا خالق اس کی رزق رسانی کے لئے یہ انتظام نہ کرتا تو کیا انسان زمین پر جی سکتا تھا؟

وَاصْبِرُوا: (۴۶/۸) یعنی اپنے جذبات و خواہشات کو قابو میں رکھو، جلد بازی، گھبراہٹ، ہراس، طمع اور نامناسب جوش سے بچو، ٹھنڈے دل اور جچی تلی قوت فیصلہ کے ساتھ کام کرو، خطرات اور مشکلات سامنے ہوں تو تمہارے قدموں میں لغزش نہ آئے، اشتعال انگیز مواقع پیش آئیں تو غیظ و غضب کا ہیجان تم سے کوئی بے محل حرکت سرزد نہ کرانے پائے۔ مصائب کا حملہ ہو اور حالات بگڑتے نظر آرہے ہوں تو اضطراب میں تمہارے حواس پراگندہ نہ ہو جائیں۔ حصول مقصد کے شوق سے بے قرار ہو کر یا کسی نیم پختہ تدبیر کو سرسری نظر میں کارگر دیکھ کر تمہارے ارادے شتاب کاری سے مغلوب نہ ہوں۔ اور اگر کبھی دنیوی فوائد و منافع اور لذات نفس کی ترغیبات تمہیں اپنی طرف لبھا رہی ہوں تو ان کے مقابلہ میں بھی تمہارا نفس اس درجہ کمزور نہ ہو کہ بے اختیار ان کی طرف کھنچ جاؤ۔ یہ تمام مفہومات صرف ایک لفظ ''صبر'' میں پوشیدہ ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ ان تمام حیثیات سے صابر ہوں، میری تائید انہی کو حاصل ہے۔

صَبَرُوا: (۱۱/۱۱) یہاں صبر کے ایک اور مفہوم پر روشنی پڑتی ہے، صبر کی صفت اس چھچھورپن کی ضد ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ صابر وہ شخص ہے جو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے ذہن کے توازن کو برقرار رکھے۔ وقت کی ہر گردش سے اثر لے کر اپنے مزاج کا رنگ بدلتا نہ چلا جائے بلکہ ایک معقول اور صحیح رویہ ہر حال میں قائم رہے۔ اگر کبھی حالات سازگار ہوں اور وہ دولت مندی، اقتدار اور ناموری کے آسمانوں پر چڑھا چلا جا رہا ہو تو بڑائی کے نشے

میں مست ہو کر بہکنے نہ لگے۔ اور اگر کوئی دوسرے وقت مصائب و مشکلات کی چکی اسے پیسے ڈال رہی ہو تو اپنے جوہر انسانیت کو اس میں ضائع نہ کر دے۔ خدا کی طرف سے آزمائش خواہ نعمت کی صورت میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، دونوں صورتوں میں اس کی بردباری اپنے حال پر قائم رہے اور اس کا ظرف کسی چیز کی بھی چھوٹی یا بڑی مقدار سے چھلک نہ پڑے۔

صَبَّارٍ : (۴۲/۳۳) ''صبر کرنے والے'' سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اچھے اور برے تمام حالات میں بندگی کے رویے پر ثابت قدم رہے۔ جس کا حال یہ نہ ہو کہ اچھا وقت آئے تو اپنی ہستی کو بھول کر خدا سے باغی اور بندوں کے حق میں ظالم بن جائے اور برا وقت آجائے تو دل چھوڑ بیٹھے اور ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے پر اتر آئے۔

صَبَرُوا : (۲۵/۷۵) صبر کا لفظ یہاں اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ دشمنان حق کے مظالم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا۔ دین حق کو قائم اور سر بلند کرنے کی جدوجہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو سہہ جانا۔ ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہ راست پر ثابت قدم رہنا۔ شیطان کی تمام ترغیبات اور نفس کی ساری خواہشات کے علی الرغم فرض کو بجالانا، حرام سے پرہیز کرنا اور حدود اللہ پر قائم رہنا، گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرا دینا اور نیکی و دوستی کے ہر نقصان اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جانا۔ غرض اس ایک لفظ کے اندر دین اور دینی رویے اور دینی اخلاق کی ایک دنیا سمو کر رکھ دی گئی ہے۔

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ: (۱۲/۱۸) متن میں ''صبر جمیل'' کے الفاظ ہیں جن کا لفظی ترجمہ ''اچھا صبر'' ہو سکتا ہے۔ اس سے مراد ایسا صبر ہے جس میں شکایت نہ ہو، فریاد نہ ہو، جزع فزع نہ ہو، ٹھنڈے دل سے اس مصیبت کو برداشت کیا جائے جو ایک عالی ظرف انسان پر آپڑی ہو۔

الصَّبْرِ: (۲/۴۵) صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشات نفس کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب و ضمیر کے پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔

صَابِرُوا: (۳/۲۰۰) اصل عربی متن میں صابروا کا لفظ آیا ہے اس کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ کفار اپنے کفر پر جو مضبوطی دکھا رہے ہیں اور اس کو سر بلند رکھنے کے لیے جو زحمتیں اٹھا رہے ہیں تم ان کے مقابلے میں ان سے بڑھ کر پامردی دکھاؤ۔ دوسرے یہ کہ ان کے مقابلہ میں ایک دوسرے سے بڑھ کر پامردی دکھاؤ۔

صَبَرُوا: (۷۶/۱۲) یہاں صبر بڑے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بلکہ درحقیقت صالح اہل ایمان کی پوری زندگی ہی کو صبر کی زندگی قرار دیا گیا ہے، ہوش سنبھالنے یا ایمان لانے کے بعد سے مرتے دم تک کسی شخص کا اپنی ناجائز خواہشوں کو دبانا، اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کی پابندی

کرنا، اللہ کے عائد کئے ہوئے فرائض کو بجالانا، اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا وقت، اپنا مال، اپنی محنتیں، اپنی قوتیں اور قابلیتیں حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کردینا، ہر اس لالچ اور ترغیب کو ٹھکرادینا جو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لئے سامنے آئے ہر اس خطرے اور تکلیف کو برداشت کرلینا جو راہ راست پر چلنے میں پیش آئے، ہر اس فائدے اور لذت سے دست بردار ہوجانا جو حرام طریقوں سے حاصل ہو، ہر اس نقصان اور رنج اور اذیت کو انگیز کرجانا جو حق پرستی کی وجہ سے پہنچے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کرنا کہ اس نیک رویے کے ثمرات اس دنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے، ایک ایسا طرز عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی کو صبر کی زندگی بنادیتا ہے، یہ ہر وقت کا صبر ہے، دائمی صبر ہے، ہمہ گیر صبر ہے اور عمر بھر کا صبر ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰہ: (۱۳۸/۲) مسیحیت کے ظہور سے پہلے یہودیوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جو شخص ان کے مذہب میں داخل ہوتا اسے غسل دیتے تھے اور اس غسل کے معنی ان کے ہاں یہ تھے کہ گویا اس کے گناہ دھل گئے اور اس نے زندگی کا ایک نیا رنگ اختیار کرلیا۔ یہی چیز بعد میں مسیحیوں نے اختیار کرلی۔ اس کا اصطلاحی نام ان کے ہاں اصطباغ (بپتسمہ) ہے اور یہ اصطباغ نہ صرف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو ان کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں بلکہ بچوں کو بھی دیا جاتا ہے۔

الصَّابِئِیْن: (۲۵/۲۲) صابئی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے۔ ایک حضرت یحیٰ علیہ السلام کے پیرو، جو بالائی عراق (یعنی الجزیرہ) کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے، اور حضرت یحیٰ کی پیروی میں اصطباغ کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پر سیاروں اور سیاروں پر فرشتوں کی فرماں روائی کے قائل تھے۔ ان کا مرکز حران تھا اور عراق کے مختلف حصہ میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفہ و سائنس اور فن طب کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا ہے، لیکن اغلب یہ ہے کہ یہاں پہلا گروہ مراد ہے۔ کیونکہ دوسرا گروہ غالباً نزول قرآن کے زمانے میں اس نام سے موسوم نہ تھا۔

اَصْحَابُ الْاَیْکَۃ: (۷۹/۱۵) یعنی حضرت شعیب کی قوم کے لوگ، اس قوم کا بنی بدیان تھا، مدین ان کے مرکزی شہر کو بھی کہتے تھے اور ان کے پورے علاقے کو بھی، رہا ایکہ تو یہ تبوک کا قدیم نام تھا۔ اس لفظ کے لغوی معنی گھنے جنگل کے ہیں۔ آج کل ایکہ ایک پہاڑی نالے کا نام ہے جو جبل اللوذ سے وادی افل میں آکر گرتا ہے۔

اَصْحَابُ الْحِجْر: (الحجر: ۸۰) یہ قوم ثمود کا مرکزی شہر تھا، اس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العلا سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ مدینہ سے تبوک جاتے ہوئے یہ مقام شاہ راہ عام پر ملتا ہے، اور قافلے اس وادی میں سے ہوکر گزرتے ہیں۔ مگر نبی ﷺ کی

ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔ آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ حج کو جاتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''یہاں سرخ رنگ کے پہاڑوں میں قوم ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں، ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہوں، ان مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں''۔

الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ: (۳۶/۴) متن میں ''الصاحب بالجب'' فرمایا گیا ہے جس سے مراد ہم نشیں دوست بھی ہے اور ایسا شخص بھی جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے، مثلاً آپ بازار جا رہے ہوں اور کوئی شخص آپ کے ساتھ راستہ چل رہا ہو، یا کسی دوکان پر آپ سودا خرید رہے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے پاس بیٹھا ہو، یا سفر کے دوران میں کوئی شخص آپ کا ہم سفر ہو، یہ عارضی ہمسائیگی بھی ہر مہذب اور شریف انسان پر ایک حق عائد کرتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حتی الامکان اس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اور اسے تکلیف دینے سے مجتنب رہے۔

صَاحِبُکُمْ: (۲/۵۳) مراد ہیں رسول اللہ ﷺ اور مخاطب ہیں قریش کے لوگ۔ اصل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں صاحبکم (تمہارا صاحب)۔ ''صاحب'' عربی زبان میں دوست، رفیق، ساتھی، پاس رہنے والے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے کو کہتے ہیں۔ اس مقام پر آپؐ کا نام لینے یا ''ہمارا رسولؐ'' کہنے کے بجائے ''تمہارا صاحب'' کہہ کر آپ کا ذکر کرنے میں بڑی گہری معنویت ہے۔

صُحُفًا: (۲/۹۸) لغت کے اعتبار سے تو صحیفوں کے معنی ہیں ''لکھے ہوئے اوراق'' لیکن قرآن مجید میں اصطلاحاً یہ لفظ انبیاء علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتابوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور پاک صحیفوں سے مراد ہیں ایسے صحیفے جن میں کسی قسم کے باطل۔ کسی طرح کی گمراہی وضلالت، اور کسی اخلاقی گندگی کی آمیزش نہ ہو۔ ان الفاظ کی پوری اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب انسان قرآن مجید کے مقابلے میں بائبل (اور دوسرے مذاہب کی کتاب کا بھی) مطالعہ کرتا ہے اور ان میں صحیح باتوں کے ساتھ ایسی باتیں لکھی ہوئی دیکھتا ہے جو حق وصداقت اور عقل سلیم کے بھی خلاف ہیں اور اخلاقی اعتبار سے بھی بہت گری ہوئی ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد جب آدمی قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنی پاک اور مطہر کتاب ہے۔

الصَّآخَّةُ: (۸۰/۳۳) مراد ہے آخری نفخ صور کی قیامت خیز آواز جس کے بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان جی اٹھیں گے۔

صَدُّوْا: (۷/۴۱) اصل میں ﴿صَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللهِ﴾ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔ صد عربی زبان میں لازم اور متعدی، دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے ان الفاظ کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ

خود اللہ کے راستے پر آنے سے باز رہے اور یہ بھی کہ انھوں نے دوستوں کو اس راہ پر آنے سے روکا۔
دوسروں کو خدا کی راہ سے روکنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی زبردستی کسی کو ایمان لانے سے روک دے اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ایمان لانے والوں پر ایسا ظلم و ستم ڈھائے کہ ان کے لیے ایمان پر قائم رہنا اور دوسروں کے لئے ایسے خوفناک حالات میں ایمان لانا مشکل ہو جائے۔ تیسری صورت یہ کہ وہ مختلف طریقوں سے دین اور اہل دین کے خلاف لوگوں کو ورغلائے اور ایسے وسوسے دلوں میں ڈالے جس سے لوگ اس دین سے بدگمان ہو جائیں۔ اس کے علاوہ ہر کافر اس معنی میں خدا کی راہ روکنے والا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کفر کے طریقے پر پرورش کرتا ہے اور پھر اس کی آئندہ نسل کے لئے دین آبائی کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہر کافر معاشرہ خدا کے راستے میں ایک سنگ گراں ہے کیوں کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت سے، اپنے اجتماعی نظام اور رسم و رواج سے اور اپنے تعصبات سے دین حق کے پھیلنے میں شدید رکاوٹیں ڈالتا ہے۔

الصِدِّیقِین: (۶۹/۴) صدیق: سے مراد وہ شخص ہے جو نہایت راستباز ہو جس کے اندر صداقت پسندی اور حق پرستی کمال درجہ پر ہو، جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کرے جب ساتھ دے تو حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے اور سچے دل سے دے اور جس چیز کو حق کے خلاف پائے اس کے مقابلہ میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا کمزوری نہ دکھائے، جس کی سیرت ایسی ستھری اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر کسی کو بھی اس سے خالص راست روی کے سوا کسی دوسرے طرز عمل کا اندیشہ نہ ہو۔

الصِدِّیقُون: (۱۹/۵۷) یہ صدق کا مبالغہ ہے، صادق سچا اور صدیق نہایت سچا۔ مگر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ صدق محض سچے اور مطابق حقیقت قول کو نہیں کہتے بلکہ اس کا اطلاق صرف اس قول پر ہوتا ہے جو بجائے خود بھی سچا ہو اور جس کا قائل بھی سچے دل سے اس حقیقت کو مانتا ہو جسے وہ زبان سے کہہ رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص اگر کہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو یہ بات بجائے خود عین حقیقت کے مطابق ہے کیونکہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں لیکن وہ شخص اپنے اس قول میں صادق صرف اسی وقت کہا جائے گا جبکہ اس کا اپنا عقیدہ بھی یہی ہو کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لہذا صدق کے لیے ضروری ہے کہ قول کی مطابقت حقیقت کے ساتھ بھی ہو اور قائل کی ضمیر کے ساتھ بھی۔ اسی طرح صدق کے مفہوم میں وفا اور خلوص اور عملی راستبازی بھی شامل ہے۔ صادق الوعد (وعدے کا سچا) اس شخص کو کہیں گے جو عملاً اپنا وعدہ پورا کرتا ہو اور کبھی اس کی خلاف ورزی نہ کرتا ہو۔ صدیق (سچا دوست) اسی کو کہا جائے گا جس نے آزمائش کے مواقع پر دوستی کا حق ادا کیا ہو اور کبھی آدمی کو اسے بے وفائی کا تجربہ نہ ہوا ہو۔ جنگ میں صادق فی القتال (سچا سپاہی) صرف وہی شخص کہلائے گا جو جان توڑ کر لڑا ہو اور جس نے

اپنے عمل سے اپنی بہادری ثابت کر دی ہو۔ پس صدق کی حقیقت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ قائل کا عمل اس کے قول سے مطابقت رکھتا ہو۔ قول کے خلاف عمل کرنے والا صادق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی بنا پر تو آپ اس شخص کو جھوٹا واعظ کہتے ہیں جو کہے کچھ اور کرے کچھ۔ اب غور کرنا چاہیے کہ یہ تعریف جب صدق و صادق کی ہے تو مبالغہ کے صیغہ میں کسی کو صدیق کہنے کا مطلب کیا ہوگا۔ اس کے معنی لازماً ایسے راستباز آدمی کے ہیں جس میں کوئی کھوٹ نہ ہو، جو کبھی حق و راستی سے نہ ہٹا ہو، جس سے یہ توقع ہی نہ کی جاسکتی ہو کہ وہ کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کہے گا، جس نے کسی بات کو مانا ہو تو پورے خلوص کے ساتھ مانا ہو، اس کی وفاداری کا حق ادا کیا ہو اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہو کہ وہ فی الواقع ویسا ہی ماننے والا ہے جیسا ایک ماننے والے کو ہونا چاہیے۔

اَلْمُصَّدِّقٰت: (۱۸/۵۷) صدقہ اردو زبان میں تو بہت ہی برے معنوں میں بولا جاتا ہے مگر اسلام کی اصطلاح میں یہ اس عطیے کو کہتے ہیں جو سچے دل اور خالص نیت کے ساتھ محض اللہ کی خوشنودی کے لئے دیا جائے جس میں کوئی ریا کاری نہ ہو کسی پر احسان نہ جتایا جائے، دینے والا صرف اس لیے دے کہ وہ اپنے رب کے لئے عبودیت کا سچا جذبہ رکھتا ہے۔ یہ لفظ صدق سے ماخوذ ہے اس لئے صداقت عین اس کی حقیقت میں شامل ہے کوئی عطیہ اور کوئی صرفِ مال اس وقت تک صدقہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی تہ میں انفاق فی سبیل اللہ کا خالص اور بے کھوٹ جذبہ موجود نہ ہو۔

تَصْدِیقَ الَّذِی بَیْنَ یَدَیْہِ: (۱۰/۳۷) "جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق ہے"، یعنی ابتدا سے جو اصولی تعلیمات انبیاء علیہم السلام کی معرفت انسان کو بھیجی جاتی رہی ہیں یہ قرآن ان سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ انہی کی تصدیق و توثیق کر رہا ہے۔ اگر یہ کسی نئے مذہب کے بانی کی ذہنی اپج کا نتیجہ ہوتا تو اس میں ضرور یہ کوشش پائی جاتی کہ پرانی صداقتوں کے ساتھ کچھ اپنا نرالا رنگ بھی ملا کر اپنی شان امتیاز نمایاں کی جائے۔ "الکتاب کی تفصیل ہے"، یعنی ان اصولی تعلیمات کو جو کہ تمام کتب آسمانی کا لب لباب (الکتاب) ہیں، اس میں پھیلا کر دلائل و شواہد کے ساتھ، تلقین و تفہیم کے ساتھ، تشریح و توضیح کے ساتھ اور عملی حالات پر انطباق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

صَرَّفْنَاہُ: (۵۰/۲۵) لقد صرفناہ، اس کے تین معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ بارش کے اس مضمون کو ہم نے بار بار قرآن میں بیان کر کے حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم بار بار گرمی و خشکی کے۔ موسمی ہواؤں اور گھٹاؤں کے، اور برسات اور اس سے رونما ہونے والی رونق حیات کے کرشمے ان کو دکھاتے رہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہم بارش کو گردش دیتے رہتے ہیں۔ یعنی ہمیشہ ہر جگہ یکساں بارش نہیں ہوتی بلکہ کبھی کہیں بالکل خشک سالی ہوتی ہے،

کبھی کہیں کم بارش ہوتی ہے، کبھی کہیں مناسب بارش ہوتی ہے، کبھی کہیں طوفان اور سیلاب کی نوبت آجاتی ہے، اور ان سب حالتوں کے بے شمار مختلف نتائج ان کے سامنے آتے رہتے ہیں۔

لَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ: (۳۱/۱۸) اصل الفاظ ہیں لا تصعر خدک للناس۔ صعر عربی زبان میں ایک بیماری کو کہتے ہیں جو اونٹ کی گردن میں ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اونٹ اپنا منہ ہر وقت ایک ہی طرف پھیرے رکھتا ہے۔ اس سے محاورہ نکلا فلان صعر خده۔ "فلاں شخص نے اونٹ کی طرح اپنا کلہ پھیرلیا" یعنی تکبر کے ساتھ پیش آیا اور منہ پھیر کر بات کی۔ اسی کے متعلق قبیلہ تغلب کا ایک شاعر عمرو بن حی کہتا ہے۔

و کنا اذا الجبار صعر خده اقمنا له من میله فتقوما

الصّٰعِقَةُ: (۵۱/۴۴) قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس عذاب کے لئے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں اسے رجفه (دہلا دینے والی اور ہلا مارنے والی آفت) کہا گیا ہے۔ کہیں اس کو صیحه (دھماکے اور کڑکے) سے تعبیر کیا گیا ہے کہیں اس کے لئے طاغیه (انتہائی شدید آفت) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہاں اسی کو صاعقه کہا گیا ہے جس کے معنی بجلی کی طرح اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کے بھی ہیں اور سخت کڑک کے بھی۔ غالباً یہ عذاب ایک ایسے زلزلے کی شکل میں آیا تھا جس کے ساتھ خوفناک آواز بھی تھی۔

الصّٰغِرِیْنَ: (۷/۱۳) صاغر کے معنی ہیں الراضی بالذل، یعنی وہ ذلت اور صغار اور چھوٹی حیثیت کو خود اختیار کرے۔

فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا: (۶۶/۴) اصل الفاظ ہیں فقد صغت قلوبکما۔ صغو عربی زبان میں مڑ جانے اور ٹیڑھا ہو جانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس فقرے کا ترجمہ کیا ہے: "هر آئینه کج شده است دل شما" اور شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ ہے "کج ہو گئے دل تمہارے" حضرات عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، سفیان ثوریؒ اور ضحاکؒ نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے زاغت قلوبکما، یعنی "تمہارے دل راہ راست سے ہٹ گئے ہیں۔" امام رازیؒ اس کی تشریح میں کہتے ہیں عدلت ومالت عن الحق وھو حق الرسول ﷺ، "حق سے ہٹ گئے ہیں، اور حق سے مراد رسول اللہ ﷺ کا حق ہے"۔ اور علامہ آلوسی کی تشریح یہ ہے: مالت عن الواجب من موافقته ﷺ بحب ما یحبه و کراھة ما یکرھه الیٰ مخالفته یعنی "تم پر واجب تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ پسند کریں اسے پسند کرنے میں اور جو کچھ آپ ناپسند کریں اسے ناپسند کرنے میں آپؐ کی موافقت کرو۔ مگر تمہارے دل اس معاملہ میں آپ کی مخالفت کی طرف مڑ گئے ہیں۔"

الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ: (۲/۱۵۸) صفا اور مروہ مسجد حرام کے قریب دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان دوڑنا منجملہ ان مناسک کے تھا۔

الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ: (۳۸/۳۱) اصل الفاظ ہیں الصافنات الجیاد۔ اس سے مراد ایسے گھوڑے ہیں جو کھڑے ہوں تو نہایت سکون کے ساتھ کھڑے رہیں، کوئی اچھل کود نہ کریں اور جب دوڑیں تو نہایت تیز دوڑیں۔

بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ: (۸۶/۷) اصل میں صلب اور ترائب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صلب ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں اور ترائب کے معنی ہیں سینے کی ہڈیاں، یعنی پسلیاں، چونکہ عورت اور مرد دونوں کے مادۂ تولید انسان کے اس دھڑ سے خارج ہوتے ہیں جو صلب اور سینے کے درمیان واقع ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ انسان اس پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یہ مادہ اس صورت میں بھی پیدا ہوتا ہے جب کہ ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ انسان کے پورے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ درحقیقت جسم کے اعضاء رئیسہ اس کے ماخذ ہیں اور وہ سب آدمی کے دھڑ میں واقع ہیں۔ دماغ کا الگ ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ صلب دماغ کا وہ حصہ ہے جس کی بدولت ہی جسم کے ساتھ دماغ کا تعلق قائم ہوتا ہے۔

الصّٰلِحِين: (۴/۶۹) صالح سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے خیالات اور عقائد میں، اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال میں راہ راست پر قائم ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رویہ رکھتا ہو۔

الصّٰلِحٰت: (۱۰۳/۳) ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسارے سے بچانے کے لئے ضروری ہے وہ صالحات (نیک کاموں) پر عمل کرنا ہے۔ صالحات کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے جس سے نیکی اور بھلائی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کی رو سے کوئی عمل بھی اس وقت تک عمل صالح نہیں ہو سکتا جب تک اس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو، اور وہ اس ہدایت کی پیروی میں نہ کیا جائے جو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے، اس لئے قرآن مجید میں ہر جگہ عمل صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں بھی اس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عمل صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے جب وہ اس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے، جب تک بیج زمین میں نہ ہو، کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں جتنی بشارتیں دی گئی ہیں انہی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لا کر عمل

صالح کریں، اور یہی بات اس سورہ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسارے سے بچانے کے لئے جو دوسری صفت ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے، بالفاظ دیگر عمل صالح کے بغیر محض ایمان آدمی کو خسارے سے نہیں بچاسکتا۔

صَلْصَالٍ: (۲۸/۱۵) صلصال اس سوکھے گارے کو کہتے ہیں جو خشک ہوجانے کے بعد بجنے لگے، یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کا ایک پتلا بنایا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر روح پھونکی گئی۔

صَلَوٰت: (۴۰/۲۲) صلوات سے مراد یہودیوں کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ یہودیوں کے ہاں اس کا نام صلوتا تھا جو آرامی زبان کا لفظ ہے۔ بعید نہیں کہ انگریزی لفظ (Salute) اور (Salution) اسی سے نکل کر لاطینی میں اور پھر انگریزی میں پہنچا ہو۔

الصَّلٰوۃ الوُسطیٰ: (۲۳۸/۲) ''وسطیٰ کے معنی بیچ والی چیز کے بھی ہیں اور ایسی چیز کے بھی جو اعلیٰ اور اشرف ہو، صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد بیچ کی نماز بھی ہو سکتی ہے اور ایسی نماز بھی جو صحیح وقت پر پورے خشوع اور توجہ الی اللہ کے ساتھ پڑھی جائے، اور جس میں نماز کی تمام خوبیاں موجود ہوں، بعد کا فقرہ کہ ''اللہ کے آگے فرمانبردار بندوں کی طرح کھڑے ہو'' خود اس کی تفسیر کر رہا ہے۔

صَلُّوا عَلَیهِ: (۵۶/۳۳) صلوٰۃ کا لفظ جب علیٰ کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے تین معنی ہوتے ہیں ایک کسی پر مائل ہونا۔ اس کی طرف محبت کے ساتھ متوجہ ہونا اور اس پر جھکنا۔ دوسرے کسی کی تعریف کرنا، تیسرے کسی کے حق میں دعا کرنا۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جائے تو ظاہر ہے کہ تیسرے معنی میں نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ کا کسی اور سے دعا کرنا قطعاً ناقابل تصور ہے۔ اس لئے لامحالہ وہ صرف پہلے دو معنوں میں ہو گا لیکن جب یہ لفظ بندوں کے لئے بولا جائے گا، خواہ وہ فرشتے ہوں یا انسان، تو وہ تینوں معنوں میں ہو گا، اس میں محبت کا مفہوم بھی ہو گا، مدح و ثنا کا مفہوم بھی اور دعائے رحمت کا مفہوم بھی، لہٰذا اہل ایمان کو نبی ﷺ کے حق میں صلوعلیہ کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے گرویدہ ہو جاؤ ان کی مدح و ثنا کرو اور ان کے لئے دعا کرو۔

یُصَلِّی عَلَیْکُمْ: (۴۳/۳۳) صلوٰۃ کا لفظ جب علیٰ کے صلے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف بندوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی رحمت، مہربانی اور شفقت کے ہوتے ہیں۔ اور جب ملائکہ کی طرف سے انسانوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اسکے معنی دعائے رحمت کے ہوتے ہیں، یعنی ملائکہ انسانوں کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ تو ان پر فضل فرما اور اپنی عنایات سے انہیں سرفراز کر ایک مفہوم یصلی علیکم کا یہ بھی ہے کہ یشیع عنکم الذکر الجمیل فی عباد اللہ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے بندوں کے درمیان ناموری عطا فرماتا ہے اور تمہیں

اس درجے کو پہنچا دیتا ہے کہ خلق خدا تمہاری تعریف کرنے لگتی ہے اور ملائکہ تمہاری مدح وثنا کے چرچے کرتے ہیں۔

الصَّمَدُ: (۱۱۲/ ۲) اصل میں لفظ صمد استعمال کیا گیا ہے جس کا مادہ ص، م، د، ہے عربی زبان میں اس مادے سے جو الفاظ نکلے ہیں ان پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے معانی کی وسعت کس قدر ہے:

الصمد۔ قصد کرنا، بلند مقام جو بڑی ضخامت رکھتا ہو، سطح مرتفع، وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو، وہ سردار جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہو۔

الصَّمَدُ۔ ہر چیز کا بلند حصہ، وہ شخص جس سے بالاتر کوئی دوسرا شخص نہ ہو، وہ سردار جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور اس کے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کیا جاتا ہو، وہ سردار جس کی طرف حاجتمند لوگ رجوع کرتے ہوں، دائم، بلند مرتبہ، ٹھوس جس میں کوئی خول یا جھول نہ ہو اور جس سے نہ کوئی چیز نکلتی ہو نہ اس میں داخل ہو سکتی ہو، وہ آدمی جسے جنگ میں بھوک پیاس نہ لگتی ہو۔

المُصْمَدُ۔ ٹھوس چیز جس کا کوئی جوف نہ ہو۔

المُصَمَّدُ۔ مقصود جس کی طرف جانے کا قصد کیا جائے، سخت چیز جس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔

بَیْتٌ مُصَمَّدٌ۔ وہ گھر جس کی طرف حاجات میں رجوع کیا جاتا ہو۔

بناءٌ مُصْمَدٌ۔ بلند عمارت

صَمَدَہٗ وَصَمَدَ اِلَیْہِ صَمْدًا۔ اس شخص کی طرف جانے کا قصد کیا۔

اَصْمَدَ اِلَیْہِ الْاَمْرَ۔ اس کے سپرد معاملہ کر دیا، اس کے آگے معاملہ پیش کر دیا، اس کے اوپر معاملہ میں اعتماد کیا۔ (صحاح، قاموس، لسان العرب)۔

ان لغوی معنوں کی بنا پر آیت اللہ الصمد میں لفظ الصمد کی جو تفسیریں صحابہ و تابعین اور بعد کے اہل علم سے منقول ہیں انہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں: حضرت علی، عکرمہ اور کعب احبار: "صمد وہ ہے جس سے بالاتر کوئی نہ ہو"۔

حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور ابو وائل شقیق بن سلمہ: "وہ سردار جس کی سیادت کامل ہو اور انتہا کو پہنچی ہوئی ہو"۔

ابن عباس کا دوسرا قول: "صمد وہ ہے جس کی طرف لوگ کسی بلا یا مصیبت کے نازل ہونے پر مدد کے لئے رجوع کریں"۔ ان کا ایک اور قول: "وہ سردار جو اپنی سیادت میں، اپنے شرف میں، اپنی عظمت میں، اپنے حلم اور بردباری میں اپنے علم میں اور اپنی حکمت میں کامل ہو۔

حضرت ابو ہریرہ: "وہ جو سب سے بے نیاز ہو اور سب اس کے محتاج ہوں"

عکرمہ کے دوسرے اقوال: وہ جس میں سے نہ کوئی چیز کبھی نکلی ہو نہ نکلتی ہو۔ "جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو" اسی کے ہم معنی اقوال شعبی اور محمد بن کعب القرظی سے بھی منقول ہیں۔

سدی: ’’مطلوب چیزیں حاصل کرنے کے لئے لوگ جس کا قصد کریں اور مصائب میں مدد کے لئے جس کی طرف رجوع کریں‘‘۔

سعید بن جبیر: ’’وہ جو اپنی تمام صفات اور اعمال میں کامل ہو‘‘

ربیع بن انس: ’’وہ جس پر کوئی آفت نہ آتی ہو‘‘

مقاتل بن حیان: ’’وہ جو بے عیب ہو‘‘

ابن کیسان: ’’وہ جس کی صفت سے کوئی دوسرا متصف نہ ہو‘‘

حسن بصری اور قتادہ: ’’جو باقی رہنے والا اور لازوال ہو‘‘۔ اسی سے ملتے جلتے اقوال مجاہد اور معمر اور مرہ الہمدانی سے بھی منقول ہیں۔

مرہ الہمدانی کا ایک اور قول یہ ہے کہ ’’وہ جو اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے فیصلہ کرے اور جو کام چاہے کرے اس کے حکم اور فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا کوئی نہ ہو‘‘۔

ابراہیم نخعی: ’’وہ جس کی طرف لوگ اپنی حاجتوں کے لئے رجوع کریں‘‘۔ ابوبکر الانباری: ’’اہل لغت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ صمد اس سردار کو کہتے ہیں جس سے بالاتر کوئی اور سردار نہ ہو اور جس کی طرف لوگ اپنی حاجات اور اپنے معاملات میں رجوع کریں‘‘۔ اسی کے قریب الزجاج کا قول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صمد وہ ہے جس پر سرداری ختم ہو گئی ہو اور ہر ایک اپنی حاجات کے لئے جس کی طرف رجوع کرے‘‘۔

اب غور کیجئے کہ پہلے فقرے میں اللہ احد کیوں کہا گیا اور اس فقرے میں **اللہ الصمد** کہنے کی کیا وجہ ہے لفظ احد کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے کسی اور کے لئے سرے سے مستعمل ہی نہیں ہے۔ اس لئے اسے احد، یعنی نکرہ کی صورت میں استعمال کیا گیا ہے لیکن **صمد** کا لفظ چونکہ مخلوقات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اس لئے **اللہ صمد** کہنے کے بجائے **اللہ الصمد** کہا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اصلی اور حقیقی صمد اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مخلوق اگر کسی حیثیت سے صمد ہو بھی تو کسی دوسری حیثیت سے وہ صمد نہیں ہے کیونکہ وہ فانی ہے، لازوال نہیں ہے، قابل تجزیہ و تقسیم ہے، مرکب ہے کسی وقت اس کے اجزا بکھر سکتے ہیں، بعض مخلوقات اس کی محتاج ہیں تو وہ خود محتاج ہے، اس کی سیادت اضافی ہے نہ کہ مطلق، کسی کے مقابلے میں وہ برتر ہے تو اس کے مقابلے میں کوئی اور برتر ہے، بعض مخلوقات کی بعض حاجات کو وہ پورا کر سکتا ہے مگر اس کی تمام حاجات کو پورا کرنا کسی مخلوق کے بس میں نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کی صمدیت ہر حیثیت سے کامل ہے، ساری دنیا اس کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ دنیا کی ہر چیز اپنے وجود و بقا اور اپنی حاجات و ضروریات کے لئے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اسی کی طرف رجوع کرتی ہے اور سب کی تمام حاجات پوری کرنے والا وہی ہے۔ وہ غیر فانی اور لازوال ہے، رزق دیتا ہے، لیتا نہیں ہے۔ مفرد ہے مرکب نہیں ہے

کہ قابل تجزیہ و تقسیم ہو۔ ساری کائنات پر اس کی سیادت قائم ہے اور وہ سب سے برتر ہے۔ اس لئے وہ محض صمد نہیں بلکہ الصمد ہے یعنی ایک ہی ایسی ہستی جو حقیقت میں صمدیت سے ،تمام و کمال متصف ہے۔

پھر چونکہ وہ الصمد ہے اس لئے لازم آتا ہے کہ وہ یکتا و یگانہ ہو کیونکہ ایسی ہستی ایک ہی ہو سکتی ہے جو کسی کی حاجتمند نہ ہو اور سب جس کے محتاج ہوں۔ دو یا زاید ہستیاں سب سے بے نیاز اور اس کی حاجت روا نہیں ہو سکتیں۔ نیز اس کے الصمد ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہی ایک معبود ہو کیونکہ انسان عبادت اسی کی کرتا ہے جس کا وہ محتاج ہو اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہ ہو کیونکہ جو حاجت روائی کی طاقت اور اختیارات ہی نہ رکھتا ہو اس کی بندگی و عبادت کوئی ہوشمند آدمی نہیں کر سکتا۔

صَوَامِع : (۲۲/۴۰) صومعہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں راہب اور سنیاسی اور تارک الدنیا فقیر رہتے ہیں۔

الصُّوْر : (۲۰/۱۰۲) صور یعنی نرسنگھا۔ قرناء، یا ابوق، آج کل اسی چیز کا قائم مقام بگل ہے جو فوج کو جمع یا منتشر کرنے اور ہدایت دینے کے لئے بجایا جاتا ہے۔

الصَّیْحَةُ: (۱۱/۹۴) ا۔ سورہ ہود، آیات ۹۴۔۹۵۔ یہ حضرت شعیبؑ کی امت کے بارے میں ہیں۔ حضرت شعیبؑ کی امت پر عذاب آنے کی صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک ''صیحہ'' نے ان کو آلیا اور وہ تباہ ہو گئے۔ صیحہ عربی زبان میں زور کی آواز یا چیخ اور کڑکے کے لیے بولا جاتا ہے میں نے موقع و محل کے لحاظ سے اس کا ترجمہ ''زبردست دھماکہ'' کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک غیر معمولی سخت آواز انسانوں اور ان کی بستیوں کے لیے تباہ کن ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ بھی مدتِ دراز سے اس دنیا میں ہوتا رہا ہے۔ یہی لفظ ''صیحہ'' قیامت کے ذکر میں بھی سورہ یٰسں آیت ۴۹ میں بیان ہوا ہے۔ اور اسی کو قرآن میں لفظ ''صور'' سے بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ الزمر، آیت ۶۸ میں آیا ہے کہ: ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ..﴾ دونوں قسم کی آوازوں میں جو فرق قرآن مجید کے مختلف مقامات سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک زور کی آواز تو وہ ہے جو محدود پیمانے پر کسی ایک علاقے میں بلند ہو اور وہ اسی علاقے کے لوگوں کو تباہ کرے۔ اور دوسرے قسم کی زبردست آواز وہ ہے جو نہ صرف پوری زمین پر بلکہ آسمانوں تک بلند ہو گی اور تمام مخلوق کو ہلاک کر دے گی۔ بہر حال اس سے آواز کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کان ہی نہیں پھاڑ دیتی بلکہ ہلاک کر ڈالتی ہے۔ کبھی اس کی طاقت سے ایک قوم ہلاک ہوتی ہے اور کبھی اس کی طاقت سے قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ اس فرق کا انحصار (Intensity of Sound) پر ہے جو ہوا کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے اور اشیاء پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ قیامت کے صور کی آواز ہوا کے بجائے کسی اور عنصر کے ذریعے سے بلند

ہو، کیونکہ وہ صرف زمین تک محدود نہیں ہو گی بلکہ زمین سمیت آسمانوں تک پر محیط ہو گی اور ہوا زمین کے گرد ایک محدود دائرے تک ہی پائی جاتی ہے اس کے آگے خلا میں نہیں ہے۔

۲۔ الحجر، آیت ۸۳، ۸۴۔ یہ آیات قومِ ثمود (اصحاب الحجر) کے بارے میں ہیں۔ اس سے پہلے اسی سورہ کی آیت ۷۳ میں بھی اس عذاب کے لیے جو قومِ لوط پر آیا تھا "صیحہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت میں نے اوپر کر دی ہے۔ آیت ۷۳ میں قومِ لوط کے متعلق "صیحہ" کا جو اثر بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی بستیاں الٹ گئیں یعنی ان کی چھتیں زمین پر آ رہیں۔ یہ آواز کی اس طاقت کو ظاہر کرتا ہے جو آدمیوں ہی کو ہلاک نہیں کرتی بلکہ معذب قوم کی بستیوں کو بھی تلپٹ کر دیتی ہے۔ جہاں تک آیت ۸۳، ۸۴ کا تعلق ہے، میں نے خود قومِ ثمود کا علاقہ دیکھا ہے۔ اس میں تمام علاقے کے پہاڑ تہ سے لے کر چوٹی تک کھیل کھیل ہو گئے ہیں۔ یہ آواز کی اس طاقت کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ پہاڑوں تک کو جھنجھوڑ ڈالتی ہے اور ان کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔

۳۔ سورۂ المومنون، آیت ۴۱۔ یہ بھی قومِ ثمود ہی کے بارے میں ہے۔ اس میں صیحہ کی تباہی اس حد تک بیان کی گئی ہے کہ "ہم نے اس کو بھس بنا کر رکھ دیا"۔ اس سے آواز کی طاقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ انسان کو صرف ہلاک ہی نہیں کرتی بلکہ اس کے جسم تک ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔

۴۔ سورہ یٰسٓ، آیت ۲۸، ۲۹۔ یہ ایک قوم کے متعلق ہے جس کا قرآن میں نام نہیں لیا گیا۔ وہ بھی "صیحہ" سے تباہ ہوئی اور اس کے متعلق صیحہ کی تاثیر یہ بیان کی گئی ہے کہ فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ، (یکایک وہ بجھ کے رہ گئے)۔ بالفاظ دیگر ان کی شمعِ حیات گل ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ "خامدون" کا مطلب یہ ہو کہ ان کے جسم کی حرارت ختم ہو گئی جس سے وہ مر گئے۔

۵۔ سورہ ص، آیت ۱۴۔ ۱۵۔ اس میں اہلِ مکہ کو خوف دلایا گیا ہے کہ اگر وہ نہ مانے یا ایمان نہ لائے یا رسول اللہ کو جھٹلانے پر مصر رہے تو دوسری قوموں کی طرح ان پر بھی ایک "صیحہ" آئے گا جس کے بعد پھر دوسرا صیحہ نہ ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ہی صیحہ ان کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہو گا۔ دوسرے صیحہ کی نوبت نہیں آئے گی۔ مَالَهَا مِنْ فَوَاقٍ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس صیحہ سے ان کی تباہی میں اتنی دیر بھی نہ لگے گی جتنی دیر اونٹنی کا دودھ نچوڑتے وقت ایک دفعہ سونتے ہوئے تھن میں دوبارہ سونتنے تک دودھ اترنے میں لگتی ہے۔ یہ بات اہلِ عرب کو یہ بتانے کے لیے بیان کی گئی ہے کہ اس آواز کی طاقت یکا یک ان کو ہلاک کر دے گی۔ اس کی نوبت نہیں آئے گی کہ کوئی شخص گر کر کچھ دیر تڑپتا رہے۔

۶۔ سورۂ الحاقہ، آیت ۱ تا ۵ اور ۱۳ تا ۱۵۔ پہلی تین آیات میں قیامت کے لیے "الحاقہ" استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا آنا بالکل برحق ہے اور وہ آ کر رہے گی۔ اسی بات کو

میں نے اپنے ترجمے میں ''ہونی شدنی'' کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ آیت نمبر ۴ میں اسی قیامت کے لیے ''قارعہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ قرع عربی زبان میں ٹھوکنے، کھڑکھڑا دینے اور ایک چیز کو دوسری چیز پر مار دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کی تفصیلی کیفیت آیت ۱۳، ۱۴ میں یہ بیان کی گئی ہے کہ ''جب ایک ہی دفعہ صُور پھونک دیا جائے گا اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا''۔ پھر آیت ۱۶ میں اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''صور پھونکنے کے اس فعل کی بدولت آسمان پھٹ جائے گا اور اس کی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی''۔ بالفاظ دیگر تارے اور سیارے جن مداروں پر قائم ہیں ان سے وہ بکھر جائیں گے اور ان کے درمیان جو جگہ (Space) رکھی گئی ہے وہ سب درہم برہم ہو جائے گی۔ یہ القارعہ ہی کی واضح تشریح ہے اور قرآن میں جگہ جگہ اس کی مزید تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ یہ سب نفخ صور کی بدولت ہو گا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صور سے جو چیز بلند ہو گی وہ محض آواز نہیں ہو گی بلکہ کوئی ایسی طاقتور چیز ہو گی جو زمین اور پہاڑوں کو ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دے گی اور نظامِ فلکی کو درہم برہم کر ڈالے گی۔ آیت ۵ میں ثمود کی تباہی کا سبب طاغیہ بیان کیا گیا ہے جس سے مراد سخت حادثہ ہے۔ اسی حادثہ کو سورہ اعراف میں ''رجفہ'' کہا گیا ہے جس سے مراد زبردست زلزلہ ہے اور اسی کو سورہ حٰم السجدہ میں ''صاعقة العذاب'' (عذاب کا کڑکا) کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قومِ ثمود پر صرف ایک زبردست آواز ہی کا عذاب نہیں آیا تھا بلکہ ساتھ ساتھ زلزلہ آیا تھا۔ پھر آیت ۶ میں قوم ثمود کی تباہی کا ذکر ہے جس میں ہوا کی طاقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اس نے پوری قومِ عاد کو تباہ کر دیا اور وہ کٹے ہوئے کھجور کے درختوں کی طرح گر گئے۔

۷۔ سورۃ القارعہ کے متعلق لفظ القارعہ کی تشریح میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ یہاں قیامت ہی کے لیے ٹھوکنے والی چیز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ ٹھکائی ایسی زبردست ہو گی کہ انسان پروانوں کی طرح بکھر جائیں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کچھ دوسرے آثار بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق آواز یا ہوا سے نہیں ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ پنجم ص ۱۴۰۔۱۴۵)

صٓ: (۱/۳۸) اگرچہ تمام حروف مقطعات کی طرح (ص) کے مفہوم کا تعین بھی مشکل ہے لیکن ابن عباس اور ضحاک کا یہ قول بھی کچھ دل کو لگتا ہے کہ اس سے مراد صادق فی قولہ، یا صدق محمد، یعنی محمد ﷺ صادق ہیں، جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ صاد کے حرف کو ہم اردو میں بھی اسی سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں میں اس پر صاد کرتا ہوں یعنی اس کی تصدیق کرتا ہوں، یا اسے صحیح قرار دیتا ہوں۔

(ض)

الضُّحٰی: (۱/۹۳) یہاں لفظ ضحی رات کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اس لئے اس سے مراد روز روشن ہے۔ اس کی نظیر سورہ اعراف کی یہ آیات ہیں: (اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰىٓ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ. اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰىٓ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ) (۹۷-۹۸)۔ ''کیا بستیوں کے لوگ اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو آجائے جبکہ وہ سو رہے ہوں؟ اور کیا بستیوں کے لوگ اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن دہاڑے آجائے جبکہ وہ کھیل رہے ہوں؟'' ان آیات میں بھی چونکہ ضحیٰ کا لفظ رات کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اس لئے اس سے مراد چاشت کا وقت نہیں بلکہ دن ہے''۔

ضُحٰهَا: (۱/۹۱) اصل میں لفظ ضحی استعمال کیا گیا ہے جو سورج کی روشنی اور اس کی حرارت دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ عربی زبان میں اس کے معروف معنی چاشت کے وقت کے ہیں جبکہ سورج طلوع ہونے کے بعد خاصا بلند ہو جاتا ہے لیکن جب سورج چڑھتا ہے تو صرف روشنی ہی نہیں دیتا بلکہ گرمی بھی دیتا ہے اس لئے ضحی کا لفظ جب سورج کی طرف منسوب ہو تو اس کا پورا مفہوم اس کی روشنی یا اس کی بدولت نکلنے والے دن کے بجائے اس کی دھوپ ہی سے زیادہ صحیح طور پر ادا ہوتا ہے۔

يَضْرِبُ اللّٰهُ: (۳/۴۷) اصل الفاظ ہیں ﴿كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ﴾۔ اس فقرے کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ ''اس طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کی مثالیں دیتا ہے'' لیکن اس لفظی ترجمہ سے اصل مفہوم واضح نہیں ہوتا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح فریقین کو ان کی پوزیشن ٹھیک بتائے دیتا ہے۔ ایک فریق باطل کی پیروی پر مصر ہے اس لئے اللہ نے اس کی ساری سعی و عمل کو لاحاصل کر دیا ہے اور دوسرے فریق نے حق کی پیروی اختیار کی ہے اس لیے اللہ نے اس کو برائیوں سے پاک کر کے اس کے حالات درست کر دیے ہیں۔

مَسْجِداً ضِرَاراً: (۹/۱۰۷) مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں ایک مسجد قبا جو شہر کے مضافات میں تھی، دوسری مسجد نبوی جو شہر کے اندر تھی، ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اور وہ زمانہ ایسی احمقانہ ذہنیت کا نہ تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجائے خود کار ثواب ہو قطع نظر اس سے کہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خواہ مخواہ تفریق رونما ہو جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے یہ لوگ مجبور ہوئے کہ اپنی علیحدہ مسجد بنانے سے پہلے اس کی ضرورت ثابت کریں، چنانچہ انہوں نے نبی ﷺ کے سامنے اس

تعمیر نو کے لیے یہ ضرورت پیش کی کہ بارش اور جاڑے کی راتوں میں عام لوگوں کو اور خصوصاً ضعیفوں اور معذوروں کو، جو ان دونوں مسجدوں سے دور رہتے ہیں، پانچوں وقت حاضری دینی مشکل ہوتی ہے، لہذا ہم محض نمازیوں کی آسانی کے لیے ایک نئی مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

ان پاکیزہ ارادوں کی نمائش کے ساتھ جب یہ مسجد ضرار بن کر تیار ہوئی تو یہ اشرار نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ ایک مرتبہ خود نماز پڑھا کر ہماری مسجد کا افتتاح فرمادیں۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس وقت میں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں اور ایک بڑی مہم در پیش ہے۔ اس مہم سے واپس آکر دیکھوں گا، اس کے بعد آپ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے اور آپ کے پیچھے یہ لوگ اس مسجد میں اپنی جتھ بندی اور سازش کرتے رہے، حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک طے کر لیا کہ ادھر رومیوں کے ہاتھ مسلمانوں کا قلع قمع ہو اور ادھر یہ فوراً ہی عبد اللہ بن ابی کے سر پر تاج شاہی رکھ دیں، لیکن تبوک میں جو معاملہ پیش آیا اس نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا، واپسی پر جب نبی ﷺ مدینہ کے قریب زیدان کے مقام پر پہنچے تو یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ نے اسی وقت چند آدمیوں کو مدینہ بھیج دیا تا کہ آپ کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے وہ اس مسجد ضرار کو مسمار کر دیں۔

الضَّآلِّیْن: (۲۶/۲۰) اصل الفاظ ہیں ﴿وَاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْن﴾، ”میں اس وقت ضلالت میں تھا“ یا ”میں نے اس وقت یہ کام ضلالت کی حالت میں کیا تھا۔“ یہ لفظ ضلالت لازماً ”گمراہی“ کا ہی ہم معنی نہیں ہے۔ بلکہ عربی زبان میں اسے ناواقفیت، نادانی، خطا، نسیان، نادانستگی وغیرہ معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، جو واقعہ سورہ قصص میں بیان ہوا ہے اس پر غور کرنے سے یہاں ضلالت بمعنی خطا یا نادانستگی ہی لینا زیادہ صحیح ہے۔

اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ: (۴۷/۱) اصل الفاظ ہیں اضل اعمالهم۔ ان کے اعمال کو بھٹکا دیا۔ گمراہ کر دیا، ضائع کر دیا، یہ الفاظ بڑے وسیع مفہوم کے حامل ہیں۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ توفیق سلب کر لی کہ ان کی کوششیں اور محنتیں صحیح راستے میں صرف ہوں۔ اب وہ جو کچھ کریں گے غلط مقاصد کے لیے غلط طریقوں ہی سے کریں گے، اور ان کی تمام سعی و جہد ہدایت کے بجائے ضلالت ہی کی راہ میں صرف ہو گی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو کام اپنے نزدیک وہ خیر کے کام سمجھ کر کرتے رہے ہیں، مثلاً خانہ کعبہ کی نگہبانی، حاجیوں کی خدمت، مہمانوں کی ضیافت، رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور ایسے ہی دوسرے کام جنہیں عرب میں مذہبی خدمات اور مکارم اخلاق میں شمار کیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ضائع کر دیا۔ ان کا کوئی اجر و ثواب ان کو نہ ملے گا، کیونکہ جب وہ اللہ کی توحید اور صرف اسی کی عبادت کا طریقہ اختیار کرنے سے انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس راہ پر آنے سے روکتے ہیں تو ان کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہو سکتا۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ راہ حق کو روکنے اور اپنے

کافرانہ مذہب کو عرب میں زندہ رکھنے کے لئے جو کوششیں وہ محمد ﷺ کے مقابلے میں کر رہے ہیں۔ اللہ نے ان کو رائیگاں کر دیا۔ ان کی ساری تدبیریں اب محض ایک تیر بے ہدف ہیں۔ ان تدبیروں سے وہ اپنے مقصد کو ہرگز نہ پہنچ سکیں گے۔

تَضۡلِیۡل: (۱۰۵/۲) اصل الفاظ ہیں فی تضلیل۔ یعنی ان کی تدبیر کو اس نے گمراہی میں ڈال دیا ہے لیکن محاورے میں کسی تدبیر کو گمراہ کرنے کا مطلب اسے ضائع کر دینا اور اسے اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام کر دینا ہے جیسے ہم اردو زبان میں کہتے ہیں فلاں شخص کا کوئی داؤں نہ چل سکا یا اس کا کوئی تیر نشانے پر نہ بیٹھا۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے ﴿وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ﴾ "مگر کافروں کی چال اکارت ہی گئی" (المومن۔ ۲۵) اور دوسری جگہ ارشاد ہوا ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ﴾ "اور یہ کہ اللہ خائنوں کی چال کو کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا" (یوسف۔ ۵۲)۔ اہل عرب امرؤالقیس کو الملك الضليل "ضائع کرنے والا بادشاہ" کہتے تھے کیونکہ اس نے اپنے باپ سے پائی ہوئی بادشاہی کو کھو دیا تھا۔

ضَآلًّا: (۹۳/۷) اصل میں لفظ ضالا استعمال ہوا ہے جو ضلالت سے ہے عربی زبان میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنی گمراہی کے ہیں، دوسرے معنی یہی ہیں کہ کوئی شخص راستہ نہ جانتا ہو اور ایک راہ گیر حیران کھڑا ہو کہ مختلف راستے جو سامنے ہیں ان میں سے کدھر جاؤں۔ ایک اور معنی کھوئے ہوئے کے ہیں چنانچہ عربی محاورے میں کہتے ہیں ضل الماء فی اللبن، پانی دودھ میں گم ہو گیا۔ اس درخت کو عربی میں ضالة کہتے ہیں جو صحراء میں اکیلا کھڑا ہو اور آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو، ضائع ہونے کے لئے ضلال کا لفظ بولا جاتا ہے مثلاً کوئی چیز ناموافق اور ناسازگار حالات میں ضائع ہو رہی ہو، غفلت کے لئے ضلال کا لفظ استعمال ہوتا ہے چنانچہ خود قرآن مجید میں اس کی مثال موجود ہے کہ ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى﴾۔ (طٰہٰ۔ ۵۲) میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے"۔ ان مختلف معنوں میں سے پہلے معنی یہاں چسپاں نہیں ہوتے کیونکہ بچپن سے قبل نبوت تک رسول اللہ ﷺ کے جو حالات تاریخ میں موجود ہیں ان میں کہیں اس بات کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ آپ کبھی بت پرستی، شرک یا دہریت میں مبتلا ہوئے ہوں یا جاہلیت کے جو اعمال، رسوم اور طریقے آپ کی قوم میں پائے جاتے تھے ان میں سے کسی میں آپ ملوث ہوئے ہوں، اس لئے لامحالہ ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا﴾ کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقیدے یا عمل کے لحاظ سے گمراہ پایا تھا۔ البتہ باقی معنی کسی نہ کسی طور پر یہاں مراد ہو سکتے ہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایک اعتبار سے سب مراد ہوں۔

ضَامِرٍ: (۲۲/۲۷) اصل میں لفظ ضامر استعمال ہوا ہے جو خاص طور پر دبلے پتلے اونٹوں کے لئے بولتے ہیں۔ اس سے ان مسافروں کی تصویر کھینچنا مقصود ہے جو دور دراز مقامات سے چلے آ رہے ہیں اور راستے میں ان کے اونٹ چارہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے دبلے ہو گئے ہوں۔

(ط)

طَرَائِق: (۱۷/۲۳) اصل میں لفظ طرائق استعمال ہوا ہے جس کے معنی راستے کے بھی ہیں اور طبقوں کے بھی۔ اگر پہلے معنی لیے جائیں تو غالباً اس سے مراد سات سیاروں کی گردش کے راستے ہیں اور چونکہ اس زمانے کا انسان سبع سیارہ ہی سے واقف تھا، اس لیے سات ہی راستوں کا ذکر کیا گیا۔ اس کے معنی بہر حال یہ نہیں ہیں کہ ان کے علاوہ اور دوسرے راستے نہیں ہیں۔ اور اگر دوسرے معانی لیے جائیں تو سبع طرائق کا وہی مفہوم ہو گا جو سبع سمٰوٰت طباقا (سات آسمان طبق بر طبق) کا مفہوم ہے۔

طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ: (۱۸/۸۹) طعام کا لفظ عربی زبان میں ''کھانے'' کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ چیز جو کھائی جائے۔ اور اطعام کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے، یعنی کھانا کھلانا۔

پہلے معنی کے لحاظ سے طعام المساکین کا مطلب ہے ''مسکین کا کھانا'' اور اس سے خود بخود یہ معنی نکلتے ہیں کہ جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ اسی کا کھانا ہے، ذی استطاعت آدمی کے کھانے میں اس کا کھانا بطور ایک حق کے شامل ہے جسے اس کو ادا کرنا چاہیے۔ یہی بات قرآن مجید میں ایک دوسرے طریقے سے یوں بیان کی گئی ہے کہ ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ اور ''ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حق ہے''۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب واضح ہے۔ ﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰي طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کے لیے کسی کو آمادہ نہیں کرتا۔

(رسائل ومسائل حصہ پنجم ص ۱۳۹)

طَعَامِ الْمِسْكِيْن: (۱۰۷/۳) اطعام المسکین نہیں بلکہ طعام المسکین کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اگر اطعام المسکین کہا گیا ہوتا تو معنی یہ ہوتے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکساتا۔ لیکن طعام المسکین کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ بالفاظ دیگر جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ دینے والے کا کھانا نہیں بلکہ اسی مسکین کا کھانا ہے وہ اس کا حق ہے جو دینے والے پر عائد ہوتا ہے اور دینے والا کوئی بخشش نہیں دے رہا ہے بلکہ اس کا حق ادا کر رہا ہے۔ یہی بات جو سورہ ذاریات آیت ۱۹ میں فرمائی گئی ہے کہ ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ ''اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے''۔

الطَّاغُوت: (۲/۲۵۶) ''طاغوت'' لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو، قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد

سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں، پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً اس کی فرماں برداری ہی کو حق مانے۔ مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے، اس کا نام فسق ہے، دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے اصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگے، یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کے ملک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے۔ اس کا نام طاغوت ہے اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو۔

الطَّاغُوت: (۶۰/۴) یہاں صریح طور پر "طاغوت" سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور وہ نظام عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو، لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت "طاغوت" کی حیثیت رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لیے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر، دونوں لازم و ملزوم ہیں، اور خدا اور طاغوت دونوں کے سامنے بیک وقت جھکنا عین منافقت ہے۔

الطَّاغُوت: (۲۵۷/۲) "طاغوت" یہاں طواغیت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی خدا سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے چنگل میں نہیں پھنستا بلکہ بہت سے طواغیت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ ایک طاغوت شیطان ہے، جو اس کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدا بہار سبز باغ پیش کرتا ہے، دوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے جو اسے جذبات و خواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے لیے پھرتا ہے، اور بے شمار طاغوت باہر کی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، بیوی اور بچے، اعزہ اور اقربا، برادری اور خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور رہنما، حکومت اور حکام، یہ سب اس کے لیے طاغوت ہی طاغوت ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے بچے۔

الطَّاغُوتَ: (۱۷/۳۹) طاغوت طغیان سے ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ کسی کو طاغی (سرکش) کہنے کے بجائے اگر طاغوت (سرکشی) کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انتہا درجے کا سرکش ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو حسین کے بجائے اگر یہ کہا جائے کہ وہ حسن ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ خوبصورتی میں درجہ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ معبودان غیر اللہ کو طاغوت اس لیے

کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے کی بندگی کرنا صرف سرکشی ہے مگر جو دوسروں سے اپنی بندگی کرائے وہ کمال درجے کا سرکش ہے۔ طاغوت کا لفظ یہاں طواغیت، یعنی بہت سے طاغوتوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اسی لئے ان یعبدوھا فرمایا گیا۔ اگر واحد مراد ہوتا تو یعبدوہ ہوتا۔

المُطَفِّفِین: (۸۳/۱) اصل میں لفظ مطففین استعمال کیا گیا ہے جو تطفیف سے مشتق ہے۔ عربی زبان میں طفیف چھوٹی اور حقیر چیز کے لئے بولتے ہیں اور تطفیف کا لفظ اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے کمی کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اڑاتا بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے حصے میں سے تھوڑا تھوڑا اڑاتا رہتا ہے اور خریدار بیچارے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ تاجر اسے کیا اور کتنا گھاٹا دے گیا ہے۔

تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَۃِ: (۱۰۴/۷) اصل الفاظ ہیں تطلع علیٰ الافئدہ۔ تطلع اطلاع سے ہے جس کے ایک معنی چڑھنے اور اوپر پہنچ جانے کے ہیں اور دوسرے معنی باخبر ہونے اور اطلاع پانے کے۔ افئدہ فواد کی جمع ہے جس کے معنی دل کے ہیں لیکن یہ لفظ اس عضو کیلئے استعمال نہیں ہوتا جو سینے کے اندر دھڑکتا ہے بلکہ اس مقام کے لئے استعمال ہوتا ہے جو انسان کے شعور و ادراک اور جذبات و خواہشات اور عقائد و افکار اور نیتوں اور ارادوں کا مقام ہے۔ دلوں تک اس آگ کے پہنچنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ آگ اس جگہ تک پہنچے گی جو انسان کے برے خیالات، فاسد عقائد، ناپاک خواہشات و جذبات، خبیث نیتوں اور ارادوں کا مرکز ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وہ آگ دنیا کی آگ کی طرح اندھی نہیں ہوگی کہ مستحق اور غیر مستحق سب کو جلادے گی بلکہ وہ ایک ایک مجرم کے دل تک پہنچ کر اس کے جرم کی نوعیت معلوم کرے گی اور ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق عذاب دے گی۔

الطَّآمَّۃُ الْکُبْرٰی: (۷۹/۳۴) یعنی جب انسان دیکھ لے گا کہ وہی محاسبہ کا دن آگیا ہے جس کی اسے دنیا میں خبر دی جارہی تھی تو قبل اس کے کہ اس کا نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دیا جائے اسے ایک ایک کر کے اپنی وہ سب حرکتیں یاد آنے لگیں گی جو وہ دنیا میں کر کے آیا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ تجربہ اس دنیا میں بھی ہوتا ہے کہ اگر یکایک کسی وقت وہ کسی ایسے خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں جس میں موت ان کو بالکل قریب کھڑی نظر آنے لگتی ہے تو اپنی پوری زندگی کی فلم ان کی چشم تصور کے سامنے یک لخت پھر جاتی ہے۔

النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ: (۸۹/۲۷) نفس مطمئن سے مراد وہ انسان ہے جس نے کسی شک وشبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اللہ وحدہ لاشریک کو اپنا رب اور انبیاء کے لائے ہوئے دین حق کو اپنا دین قرار دیا، جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسول سے ملا اسے سراسر حق مانا، جس چیز سے بھی اللہ کے دین نے منع کیا اس سے بادل نخواستہ نہیں بلکہ اس

یقین کے ساتھ رک گیا کہ فی الواقع وہ بری چیز ہے جس قربانی کی بھی حق پرستی کی راہ میں ضرورت پیش آئی بے دریغ اسے پیش کر دیا جن مشکلات اور تکالیف اور مصائب سے بھی اس راہ میں سابقہ درپیش ہوا نہیں پورے سکون قلب کے ساتھ برداشت کیا اور دوسرے راستوں پر چلنے والوں کو دنیا میں جو فوائد اور منافع اور لذائذ حاصل ہوتے نظر آرہے تھے ان سے محروم رہ جانے پر اسے کوئی حسرت لاحق نہ ہوئی بلکہ وہ اس بات پر پوری طرح مطمئن رہا کہ دین حق کی پیروی نے اسے ان گندگیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ اسی کیفیت کو دوسری جگہ قرآن میں شرح صدر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

طَهِّرا: (۱۲۵/۲) پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اسے پاک رکھا جائے۔ خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو، جس نے خانہ خدا میں خدا کے سوا کسی دوسرے کو مالک، معبود، حاجت روا اور فریاد رس کی حیثیت سے پکارا، اس نے حقیقت میں اسے گندا کر دیا، یہ آیت ایک نہایت لطیف طریقے سے مشرکین قریش کے جرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ ظالم لوگ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے وارث ہونے پر فخر تو کرتے ہیں، مگر وراثت کا حق ادا کرنے کے بجائے الٹا اس حق کو پامال کر رہے ہیں، لہذا جو وعدہ ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا، اس سے جس طرح بنی اسرائیل مستثنیٰ ہوگئے ہیں۔ اسی طرح یہ مشرک بنی اسماعیل بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔

الطَّوْد: (۶۳/۲۶) اصل الفاظ ہیں کالطود العظیم۔ طود عربی زبان میں کہتے ہیں بڑے پہاڑ کو۔ لسان العرب میں ہے الطود، الجبل العظیم۔

الطُّوْر: (۵۲/۱) طور کے اصل معنی پہاڑ کے ہیں اور الطور سے مراد وہ خاص پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو نبوت سے سرفراز فرمایا تھا۔

جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَن: (۵۲/۱۹) کوہ طور کے دہنی جانب سے مراد اس کا مشرقی دامن ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ مدین سے مصر جاتے ہوئے اس راستہ سے گزر رہے تھے جو کوہ طور کے جنوب سے جاتا ہے اور جنوب کی طرف سے اگر کوئی شخص طور کو دیکھے تو اس کے دائیں جانب مشرق اور بائیں جانب مغرب ہوگا، اس لیے حضرت موسیٰؑ کی نسبت سے طور کے مشرقی دامن کو "دہنی جانب" فرمایا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بجائے خود پہاڑ کا کوئی دایاں یا بایاں رخ نہیں ہوتا۔

طُوْرِ سِيْنِيْنَ: (۲/۹۵) اصل میں طور سینین فرمایا گیا ہے۔ سینین جزیرہ نمائے سینا کا دوسرا نام ہے۔ اس کو سینا یا سینا بھی کہتے ہیں اور سینین بھی۔ خود قرآن میں ایک جگہ طور سیناء کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اب چونکہ وہ علاقہ جس میں کوہ طور واقع ہے سینا ہی کے نام سے مشہور ہے اس لئے ہم نے ترجمہ میں اس کا یہی مشہور نام درج کیا ہے۔

طُوًی: (۱۶/۷۹) وادی مقدس طویٰ کے معنی بالعموم مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ "وہ مقدس وادی جس کا نام طویٰ تھا"۔ لیکن اس کے علاوہ اس کے دو معنی اور بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ "وہ وادی جو دو مرتبہ مقدس کی گئی" کیونکہ ایک دفعہ اسے اس وقت مقدس کیا گیا جب پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے وہاں حضرت موسیٰ کو مخاطب فرمایا اور دوسری دفعہ اسے تقدیس کا شرف اس وقت بخشا گیا جب حضرت موسیٰ مصر سے بنی اسرائیل کو نکال کر اس وادی میں لائے۔ دوسرے یہ کہ "رات کے وقت وادی مقدس میں پکارا"۔ عربی محاورہ ہے جاء بعد طویٰ یعنی فلاں شخص میرے پاس رات کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد آیا۔

(ظ)

الظّٰلِمِين: (۳۵/۲) ظالم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ "ظلم" دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے، جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے، وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے، اولاً خدا کا حق کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے، ثانیاً ان تمام چیزوں کے حقوق جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔ اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں اور وہ اشیاء جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں، ان سب کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے، مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات استعمال کیے تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے، مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے، انہی وجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گناہ گار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

یَظْلِم: (۱۹/۲۵) یہاں ظلم سے مراد حقیقت اور صداقت پر ظلم ہے، یعنی کفر و شرک سیاق و سباق خود ہی ظاہر کر رہا ہے کہ نبی کو نہ ماننے والے اور خدا کے بجائے دوسروں کو معبود بنا بیٹھنے والے اور آخرت کا انکار کرنے والے 'ظلم" کے مرتکب قرار دیے جا رہے ہیں۔

ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ: (۶/۳۹) تین پردوں سے مراد ہے پیٹ، رحم اور مشیمہ (وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔)

الظُّلُمٰتِ وَالنُّور: (۲/۲۵۷) تاریکیوں سے مراد جہالت کی تاریکیاں ہیں جن میں بھٹک کر انسان اپنی فلاح و سعادت کی راہ سے دور نکل جاتا ہے اور حقیقت کے خلاف چل کر اپنی تمام قوتوں اور کوششوں کو غلط راستوں میں صرف کرنے لگتا ہے۔ اور نور سے مراد علم حق ہے جس کی روشنی میں انسان اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنی زندگی کے مقصد کو صاف صاف دیکھ کر علی وجہ البصیرت ایک صحیح راہ عمل پر گامزن ہوتا ہے۔

الظُّلُمٰت: (۶/۱) روشنی کے مقابلہ میں تاریکیوں کو بصیغہ جمع بیان کیا گیا، کیونکہ تاریکی نام ہے عدم نور کا اور عدم نور کے بے شمار مدارج ہیں، اس لیے نور واحد ہے اور تاریکیاں بہت ہیں۔

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: (۲۲/۳۷) ظالم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنہوں نے

دوسروں پر ظلم کیا ہو، بلکہ قرآن کی اصطلاح میں ہر وہ شخص ظالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بغاوت و سرکشی اور نافرمانی کی راہ اختیار کی ہو۔

ظَلَمُوا: (۵۹/۵۱) ظلم سے مراد یہاں حقیقت اور صداقت پر ظلم کرنا اور خود اپنی فطرت پر ظلم کرنا ہے۔ سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ یہاں ظلم کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو خداوند عالم کے سوا دوسروں کی بندگی کر رہے ہیں۔ جو آخرت کے منکر ہیں اور اپنے آپ کو دنیا میں غیر ذمہ دار سمجھ رہے ہیں اور ان انبیاء کو جھٹلا رہے ہیں جنھوں نے ان کو حقیقت سے خبردار کرنے کی کوشش کی ہے۔

ظَلَّام: (۲۹/۵۰) اصل میں لفظ ظلام استعمال ہوا ہے جس کے معنی بہت بڑے ظالم کے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنے بندوں کے حق میں ظالم تو ہوں مگر بہت بڑا ظالم نہیں ہوں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں خالق اور رب ہو کر اپنی ہی پروردہ مخلوق پر ظلم کروں تو بہت بڑا ظالم ہوں گا۔ اس لیے میں سرے سے کوئی ظلم بھی اپنے بندوں پر نہیں کرتا۔ یہ جو سزائیں تم کو دے رہا ہوں یہ ٹھیک وہی سزا ہے جس کا مستحق تم نے اپنے آپ کو خود بنایا ہے۔ تمہارے استحقاق سے رتی بھر زیادہ سزا تمہیں نہیں دی جا رہی ہے، میری عدالت بے لاگ انصاف کی عدالت ہے، یہاں کوئی شخص کوئی ایسی سزا نہیں پا سکتا جس کا وہ فی الحقیقت مستحق نہ ہو اور جس کے لیے اس کا استحقاق بالکل یقینی شہادتوں سے ثابت نہ کر دیا گیا ہو۔

[ظلام کے معنی ہیں بہت بڑا ظلم کرنے والا۔ یہ لفظ جب نفی کے ساتھ بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ فلاں شخص مطلق ظلم کرنے والا نہیں ہے، بلکہ یہ ہو گا کہ وہ بڑا ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اور سننے والا اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ وہ کسی نہ کسی حد تک تو ضرور ظلم کر گزرتا ہے۔ اسی لیے تفہیم القرآن میں اس جملے کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ ''اللہ اپنے بندوں کے لیے ظالم نہیں ہے''۔ اور یہی ترجمہ دوسرے مترجمین نے بھی کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا ترجمہ یہ ہے: ''خدا ستم کنندہ نیست بر بندگان''۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ نہیں ظلم کرنے والا واسطے بندوں کے''۔ شاہ عبد القادر صاحبؒ کا ترجمہ ہے: ''اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر''۔ اور مولانا اشرف علی صاحبؒ اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں''۔ اس طرح ظلم کی نفی سے ظلام کی نفی آپ سے آپ ہو جاتی ہے اور کسی مبالغہ فی النفی کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ جو ظالم نہیں ہے وہ آخر بہت بڑا ظالم کیسے ہو جائے گا۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نہیں بلکہ دوسری متعدد آیات میں اپنے ظالم ہونے کی نفی کے بجائے ظلام ہونے کی نفی اس لیے کی ہے کہ خالق اگر اپنے بندوں کو بے قصور عذاب دے تو وہ معمولی ظالم نہیں بلکہ بہ بڑا ظالم ہو گا۔ پس یہ بات ارشاد فرما

کر وہ یہ حقیقت اپنے بندوں کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہے کہ جو خدا ان کا پیدا کرنے والا اور ان کی پرورش کرنے والا ہے وہ انہیں عذاب اسی صوت میں دیتا ہے جب وہ طغیان وسرکشی میں حد سے گزر جاتے ہیں اور اپنے کرتوتوں سے اپنے آپ کو عذاب کا مستحق بنا لیتے ہیں۔ ورنہ خالق اور رب اپنی مخلوق کے حق میں رحیم ہی ہو سکتا ہے، ظالم ہرگز نہیں ہو سکتا۔]

(رسائل ومسائل حصہ پنجم ص ۱۰۳)

لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ: (۱۳/۳۱) ظلم کے اصل معنی ہیں کسی کا حق مارنا اور انصاف کے خلاف کام کرنا۔ شرک اس وجہ سے ظلم عظیم ہے کہ آدمی ان ہستیوں کو اپنے خالق اور رازق اور منعم کے برابر لا کھڑا کرتا ہے جن کا نہ اسکے پیدا کرنے میں کوئی حصہ، نہ اس کو رزق پہنچانے میں کوئی دخل، اور نہ ان نعمتوں کے عطا کرنے میں کوئی شراکت جن سے آدمی اس دنیا میں متمتع ہو رہا ہے۔ یہ ایسی بے انصافی ہے جس سے بڑھ کر کسی بے انصافی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، پھر آدمی پر اس کے خالق کا یہ حق ہے کہ وہ صرف اسی کی بندگی و پرستش کرے، مگر وہ دوسروں کی بندگی بجالا کر اس کا حق مارتا ہے پھر اس بندگی غیر کے سلسلے میں آدمی جو عمل بھی کرتا ہے اس میں وہ اپنے ذہن وجسم سے لے کر زمین و آسمان تک کی بہت سی چیزوں کو استعمال کرتا ہے، حالاں کہ یہ ساری چیزیں اللہ وحدہ لاشریک کی پیدا کردہ ہیں اور ان میں سے کسی چیز کو بھی اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں استعمال کرنے کا اسے حق نہیں ہے۔ پھر آدمی پر خود اس کے اپنے نفس کا یہ حق ہے کہ وہ اسے ذلت اور عذاب میں مبتلا نہ کرے۔ مگر وہ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی بندگی کر کے اپنے آپ کو ذلیل بھی کرتا ہے اور مستحقِ عذاب بھی بناتا ہے۔ اس طرح مشرک کی پوری زندگی ایک ہر جہتی اور ہمہ وقتی ظلم بن جاتی ہے جس کا کوئی سانس بھی ظلم سے خالی نہیں رہتا۔

تَظٰهَرَا: (۴/۶۶) اصل الفاظ ہیں وان تظاهرا علیه۔ تظاہر کے معنی ہیں کسی کے مقابلہ میں باہم تعاون کرنا یا کسی کے خلاف ایکا کرنا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس فقرے کا ترجمہ کیا ہے: "اگر باہم متفق شوید بر رنجانیدن پیغمبر"۔ شاہ عبد القادر صاحب کا ترجمہ ہے: "اگر تم دونوں چڑھائی کرو گیاں اس پر۔" مولانا اشرف علی صاحب کا ترجمہ ہے: "اور اگر اسی طرح پیغمبر کے مقابلے میں تم دونوں کارروائیاں کرتی رہیں۔" اور مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے "اگر تم دونوں اسی طرح کی کارروائیاں اور مظاہرے کرتی رہیں۔"

تُظٰهِرُوْنَ: (۴/۳۳) "ظہار" عربی کی ایک خاص اصطلاح ہے قدیم زمانے میں عرب کے لوگ بیوی سے لڑتے ہوئے کبھی یہ کہہ بیٹھتے تھے کہ "تیری پیٹھ میرے لئے میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے۔" اور یہ بات جب کسی کے منہ سے نکل جاتی تھی تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب یہ عورت اس پر حرام ہو گئی ہے کیوں کہ وہ اسے ماں سے تشبیہ دے چکا ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیوی کو ماں کہنے یا ماں کے ساتھ تشبیہ دے دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔ ماں تو وہی ہے جس

نے آدمی کو جنا ہے۔ محض زبان سے کہہ دینا حقیقت کو نہیں بدل دیتا کہ جو بیوی تھی وہ تمہارے کہنے سے ماں بن جائے۔

يُظٰهِرُوْن: (۲/۵۸) ظہر عربی زبان میں استعارے کے طور پر سواری کے لئے بولا جاتا ہے، مثلاً سواری کے جانور کو ظہر کہتے ہیں کیونکہ اس کی پیٹھ پر آدمی سوار ہوتا ہے، چونکہ وہ لوگ بیوی کو اپنے اوپر حرام کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ تجھے ظہر بنانا میرے اوپر ایسا حرام ہے جیسے اپنی ماں کو ظہر بنانا۔ اس لیے یہ کلمات زبان سے نکالنا ان کی اصطلاح میں ''ظہار'' کہلاتا تھا۔ جاہلیت کے زمانہ میں اہل عرب کے ہاں یہ طلاق بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید قطع تعلق کا اعلان سمجھا جاتا تھا کیونکہ ان کے نزدیک اس کے معنی یہ تھے کہ شوہر اپنی بیوی سے نہ صرف ازدواجی رشتہ توڑ رہا ہے بلکہ اسے ماں کی طرح اپنے اوپر حرام قرار دے رہا ہے۔ اس بنا پر اہل عرب کے نزدیک طلاق کے بعد تو رجوع کی گنجائش ہو سکتی تھی مگر ظہار کے بعد رجوع کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا تھا۔

(ع)

عَادِ اِرَم: (۶/۸۹)عاد ارم سے مراد وہ قدیم قوم عاد ہے جسے قرآن مجید اور تاریخ عرب میں عاد اولیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ سورہ نجم میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿وَاَنَّہٗ اَھۡلَکَ عَادَا الۡاُوۡلیٰ﴾ (آیت ۵۰) ''اور یہ کہ اس نے قدیم قوم عاد کو ہلاک کیا''، یعنی اس قوم عاد کو جس کی طرف حضرت ہود بھیجے گئے تھے اور وہ جس پر عذاب نازل ہوا تھا۔ اس کے مقابلہ میں تاریخ عرب اس قوم کے ان لوگوں کو جو عذاب سے بچ کر بعد میں پھولے پھلے تھے عاد اخریٰ کے نام سے یاد کرتی ہے قدیم قوم عاد کو عاد ارم اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو ارم بن سام بن نوح علیہ السلام سے چلی تھی۔ اسی شاخ کی کئی دوسری ضمنی شاخیں تاریخ میں مشہور ہیں جن میں سے ایک ثمود ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور دوسرے آرامی (Aramaeans) ہیں جو ابتداءً شام کے شمالی علاقوں میں آباد تھے اور جن کی زبان آرامی (Aramaic) سامی زبانوں میں بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔

عاد کے لئے ذات العماد (اونچے ستونوں والے) کے الفاظ اس لیے استعمال کیے گئے ہیں کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں بناتے تھے اور دنیا میں اونچے ستونوں پر عمارتیں کھڑی کرنے کا طریقہ سب سے پہلے انہی نے شروع کیا تھا۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ان کی اس خصوصیت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ حضرت ہود نے ان سے فرمایا اَتَبۡنُوۡنَ بِکُلِّ رِیۡعٍ اٰیَۃً تَعۡبَثُوۡنَ وَتَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ۔ ''یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بناڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے'' (الشعراء، آیات:۱۲۸۔۱۲۹)

عَادَا الۡاُوۡلیٰ: (۵۰/۵۳)عاد اولیٰ سے مراد قدیم قوم عاد جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ یہ قوم جب حضرت ہود کو جھٹلانے کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہوئی تو صرف وہ لوگ باقی بچے جو ان پر ایمان لائے تھے۔ ان کی نسل کو تاریخ میں عاد اخریٰ یا عاد ثانیہ کہتے ہیں۔

عَاد: (۶۵/۷)یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہل عرب میں زبان زد عام تھے۔ بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا، ان کی شوکت و حشمت ضرب المثل تھی، پھر دنیا سے ان کا نام ونشان تک مٹ جانا بھی ضرب المثل ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی شہرت کی وجہ سے عربی زبان میں ہر قدیم چیز کے لئے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے، آثار قدیمہ کو عادیات کہتے ہیں، جس زمین کے مالک باقی نہ رہے ہوں اور جو آباد نہ ہونے کی وجہ سے افتادہ پڑی ہوئی ہو اسے عادی الارض کہا جاتا ہے،

قدیم عربی شاعری میں ہم کو بڑی کثرت سے اس قوم کا ذکر ملتا ہے، عرب کے ماہرین انساب بھی اپنے ملک کی معدوم شدہ قوموں میں سب سے پہلے اسی قوم کا نام لیتے ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی ﷺ کی خدمت میں بنی ذہل بن شیبان کے ایک صاحب آئے جو عاد کے علاقہ کے رہنے والے تھے اور انہوں نے وہ قصے حضور کو سنائے جو اس قوم کے متعلق قدیم زمانوں سے ان کے علاقہ کے لوگوں میں نقل ہوتے چلے آرہے تھے۔

قرآن کی رو سے اس قوم کا اصل مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہیں سے پھیل کر ان لوگوں نے یمن کے مغربی سواحل اور عمان وحضر موت سے عراق تک اپنی طاقت کا سکہ رواں کر دیا تھا، تاریخی حیثیت سے اس قوم کے آثار دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں، لیکن جنوبی عرب میں کہیں کہیں کچھ پرانے کھنڈر موجود ہیں جنھیں عاد کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ حضر موت میں ایک مقام پر حضرت ہود علیہ السلام کی قبر بھی مشہور ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ایک انگریزی بحری افسر (James R. Wellested) کو حصین غراب میں ایک پرانا کتبہ ملا تھا جس میں حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر موجود ہے اور عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی تحریر ہے جو شریعت ہود کے پیرو تھے۔

عَبَثاً: (۲۳/۱۱۵) اصل میں لفظ عبثا استعمال کیا گیا ہے، جس کا ایک مطلب تو ہے "کھیل کے طور پر" اور دوسرا مطلب ہے "کھیل کے لئے" پہلی صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ "کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمھیں یونہی بطور تفریح بنا دیا ہے، تمہاری تخلیق کی کوئی غرض و غایت نہیں ہے، محض ایک بے مقصد مخلوق بنا کر پھیلا دی گئی ہے۔" دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا: "کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ تم بس کھیل کود اور تفریح اور ایسی لاحاصل مصروفیتوں کے لیے پیدا کیے گئے ہو جن کا کبھی کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے۔"

العبادة: "عربی زبان میں عُبُودَة، عُبُودِيَّة اور عَبدِيَة کے اصل معنی خضوع اور تذلل کے ہیں، یعنی تابع ہو جانا، رام ہو جانا، کسی کے سامنے اس طرح سپر ڈال دینا کہ اس کے مقابلے میں کوئی مزاحمت یا انحراف وسرتابی نہ ہو، اور وہ منشاء کے مطابق جس طرح چاہے خدمت لے۔ اسی اعتبار سے اہلِ عرب اونٹ کو بعیر مُعَبَّدٌ کہتے ہیں جو سواری کے لیے پوری طرح رام ہو چکا ہو، اور راستے کو طریق مَعَبَّدٌ کہتے ہیں جو کثرت سے پامال ہو کر ہموار بن گیا ہو، پھر اسی اصل سے اس مادہ میں غلامی، اطاعت، پوجا، ملازمت اور قید یار کاوٹ کے مفہومات پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ عربی لغت کی سب سے بڑی کتاب "لسان العرب" میں اس کی جو تشریح کی گئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) اَلْعَبْد، المملوك خلاف الحر عبد وہ ہے جو کسی کی ملک ہو اور یہ لفظ حر (آزاد) کی ضد ہے۔ تعبد الرجل آدمی کو غلام بنا لیا یا اس کے ساتھ غلام جیسا معاملہ کیا۔ یہی معنی عبده، اعبده اور اعتبده کے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے ثلاثه انا خصمهم رجل اعتبد محررًا وفی روایة اعبد

محرراً تین آدمی ہیں جن کے خلاف قیامت کے دن میں مستغیث بنوں گا۔ منجملہ کے ایک وہ شخص ہے، جو کسی آزاد کو غلام بنائے یا غلام کو آزاد کرنے کے بعد پھر اس سے غلام کا سا معاملہ کرے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا تھا: ﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ﴾۔ (الشعراء۔ ۲۲) ''اور تیرا وہ احسان جس کا طعنہ تو مجھے دے رہا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا؟''

(۲) العِبَادة الطاعَةُ مَعَ الخُضُوع عبادت اس اطاعت کو کہتے ہیں جو پوری فرمانبرداری کے ساتھ ہو۔ عَبَد الطّاغوت ای اطاعه ''طاغوت کی عبادت کی یعنی اس کا فرمانبردار ہو گیا''۔ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ ای نطیع الطاعة الّتی نَخْضَعُ مَعَهَا ''ہم تیری اطاعت کرتے ہیں۔ یعنی ہم تیری اطاعت پوری فرماں برداری کے ساتھ کرتے ہیں''۔ ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ ای اَطِیْعُوْا رَبَّکُمْ اپنے رب کی عبادت کرو۔ یعنی اس کی اطاعت کرو، ﴿قَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ﴾ ای دائنون و کل من دان الملك فهو عابد له۔ وقال ابن الا نباری: فلان عابد وهو الخاضع لربه المسلم المنقاد لامره یعنی فرعون نے جو یہ کہا کہ موسیٰ اور ہارون کی قوم ہماری عابد ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری تابع فرمان ہے جو شخص کسی بادشاہ کا مطیع ہے، وہ اس کا عابد ہے اور ابن الانباری کہتا ہے کہ فلان عابد کے معنی ہیں ''وہ اپنے مالک کا فرماں بردار اور اس کے حکم کا مطیع ہے''۔

(۳) "عبده عبادة ومعبدًا ومعبدة تأله الهه"۔ ''اس کی عبادت کی، یعنی اس کو پوجا'' التعبد النسك ''تعبد سے مراد ہے کسی کا پرستار، پجاری بن جانا''۔ شاعر کہتا ہے اری المال عبد الباخلین معبدًا میں دیکھتا ہوں کہ بخیلوں کے ہاں روپیہ پجتا ہے''۔

(۴) عبده وعبدبه لزمه فلم یفارقه، عَبَدَه' اور عَبَدَ بِهٖ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور جدا نہ ہوا، اس کا دامن تھام لیا اور چھوڑا نہیں۔

(۵) ما عبدك عنی ای ما حبسك جب کوئی شخص کسی کے پاس آنے سے رک جائے تو وہ یوں کہے گا کہ ماعبد ک عنی یعنی کس چیز نے تجھے میرے پاس آنے سے روک دیا۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادہ عبد کا اساسی مفہوم کسی کی بالادستی و برتری تسلیم کر کے اس کے مقابلے میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جانا، سرتابی و مزاحمت چھوڑ دینا اور اس کے لیے رام ہو جانا ہے۔ یہی حقیقت بندگی اور غلامی کی ہے، لہٰذا اس لفظ سے اولین تصور جو ایک عرب کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، وہ بندگی و غلامی ہی کا تصور ہے، پھر چونکہ غلام کا اصلی کام اپنے آقا کی اطاعت و فرماں برداری ہے، اس لیے لازماً اس کے ساتھ ہی اطاعت کا تصور پیدا ہوتا ہے اور جب کہ ایک غلام اپنے آقا کی بندگی و اطاعت میں محض اپنے آپ کو سپرد ہی نہ کر چکا ہو، بلکہ اعتقاداً اس کی برتری کا قائل اور اس کی بزرگی کا معترف بھی ہو، اور اس کی مہربانیوں پر شکر و احسان مندی کے جذبے سے بھی سرشار ہو، تو وہ اس کی تعظیم و تکریم میں

مبالغہ کرتا ہے۔ مختلف طریقوں سے اعترافِ نعمت کا اظہار کرتا ہے۔ اور طرح طرح سے مراسمِ بندگی بجالاتا ہے، اسی کا نام پرستش ہے اور یہ تصورِ عبدیت کے مفہوم میں صرف اسی وقت شامل ہوتا ہے، جب کہ غلام کا محض سر ہی آقا کے سامنے جھکا ہوا نہ ہو، بلکہ اس کا دل بھی جھکا ہوا ہو۔ رہے باقی دو تصورات، تو وہ دراصل عبدیت کے ضمنی تصورات ہیں۔ اصلی اور بنیادی نہیں ہیں۔

لفظ عبادت کا استعمال قرآن میں

اس لغوی تحقیق کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب پاک میں یہ لفظ تمام تر پہلے تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں معنی اول و دوم ایک ساتھ مراد ہیں، کہیں صرف، معنی دوم اور کہیں صرف معنی سوم مراد لیے گئے ہیں اور کہیں تینوں معنی بیک وقت مقصود ہیں۔

پہلے اور دوسرے معنی کی مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

﴿ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی وَاَخَاهُ هٰرُوۡنَ بِاٰيٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ۝ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا وَكَانُوۡا قَوۡمًا عَالِيۡنَ ۝ فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ﴾ (المؤمنون. ۴۵۔۴۷)

"پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور صریح دلیل ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کی طرف بھیجا۔ مگر وہ تکبر سے پیش آئے، کیونکہ وہ بااقتدار لوگ تھے، انھوں نے کہا: کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔ اور آدمی وہ جن کی قوم ہماری عابد ہے"۔

﴿وَتِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَىَّ اَنۡ عَبَّدتَّ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ﴾ (الشعراء. ۲۲)

"(فرعون نے جب موسیٰ کو طعنہ دیا کہ ہم نے تجھے اپنے ہاں بچپن سے پالا ہے تو موسیٰ نے کہا) اور تیرا وہ احسان 'جس کا تو مجھے طعنہ دے رہا ہے' یہی تو ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عبد بنالیا۔"

دونوں آیتوں میں عبادت سے مراد غلامی اور اطاعت و فرماں برداری ہے۔ فرعون نے کہا کہ موسیٰ اور ہارونؑ کی قوم ہماری عابد ہے 'یعنی ہماری غلام اور ہمارے فرمان کی تابع ہے اور حضرت موسیٰ نے کہا کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عبد بنالیا ہے 'یعنی ان کو غلام بنالیا ہے اور ان سے مَن مانی خدمت لیتا ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِلّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ﴾ (البقرہ. ۱۷۲)

"اے ایمان لانے والو! اگر تم ہماری عبادت کرتے ہو 'تو ہم نے جو پاک چیزیں تمہیں بخشی ہیں 'انھیں کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو"۔

عبادت بمعنی غلامی واطاعت

اس آیت کا موقع و محل یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اپنے مذہبی پیشواؤں کے احکام اور اپنے آباؤاجداد کے اوہام کی پیروی میں کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق طرح طرح کی قیود کی پابندی کرتے تھے۔ جب ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم ہماری عبادت کرتے ہو، تو ان ساری پابندیوں کو ختم کر دو، اور جو کچھ ہم نے حلال کیا ہے اسے حلال سمجھ کر بے تکلف کھاؤ پیو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے پنڈتوں اور بزرگوں کے نہیں، بلکہ ہمارے بندے ہو' اور اگر تم نے واقعی ان کی اطاعت و فرماں برداری چھوڑ کر ہماری اطاعت وفرمانبرداری قبول کی ہے' تو اب تمہیں حلت و حرمت اور جواز کے معاملے میں' ان کے بنائے ہوئے ضابطوں کے بجائے ہمارے ضابطے کی پیروی کرنی ہوگی۔ لہٰذا یہاں بھی عبادت کا لفظ غلامی اور اطاعت ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

﴿قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ﴾ (المائدہ.۶۰)

''کہو' میں بتاؤں تمہیں کہ اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا انجام کن لوگوں کا ہے؟ وہ جن پر اللہ کی پھٹکار ہوئی ہے اور اس کا غضب ٹوٹا جن میں بہت سے لوگ بندر اور سور تک بنادیئے گئے۔ جنھوں نے طاغوت کی عبادت کی''۔

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (النحل.۳۶)

''ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر یہ تعلیم دینے کے لیے بھیجا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے باز رہو''۔

﴿وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ أَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَأَنَابُوْا إِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى﴾ (الزمر.۱۷)

''اور خوشخبری ہے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے طاغوت کی عبادت کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کیا''۔

تینوں آیتوں میں طاغوت کی عبادت سے مراد طاغوت کی غلامی اور اطاعت ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد ہر وہ ریاست واقتدار اور ہر وہ رہنمائی و پیشوائی ہے، جو خدا سے باغی ہو کر خدا کی زمین میں اپنا حکم چلائے اور اس کے بندوں کو زور و جبر سے یا تحریص واطماع سے یا گمراہ کن تعلیمات سے، اپنا تابع امر بنائے۔ ایسے ہر اقتدار ایسی ہر پیشوائی کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور اس کی بندگی اختیار کر کے اس کا حکم بجالانا طاغوت کی عبادت ہے۔

عبادت بمعنی اطاعت

اب ان آیات کو لیجیے جن میں عبادت کا لفظ صرف معنی دوم میں استعمال ہوا ہے۔

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾. (یٰس.۶۰)

”اے بنی آدم‘ کیا میں نے تم کو تاکید نہ کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرو‘ کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے“۔

ظاہر ہے کہ شیطان کی پرستش تو دنیا میں کوئی بھی نہیں کرتا، بلکہ ہر طرف سے اس پر لعنت اور پھٹکار ہی پڑتی ہے۔ لہٰذا بنی آدم پر جو فرد جرم اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز لگائی جائے گی وہ اس بات کی نہ ہو گی کہ انھوں نے شیطان کو پوجا، بلکہ اس بات کی کہ وہ شیطان کے کہنے پر چلے، اور اس کے احکام کی اطاعت کی، اور جس راستہ کی طرف وہ اشارہ کرتا گیا، اس پر دوڑے چلے گئے۔

﴿اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ٥ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ...... وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ٥ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ٥ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ٥ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ٥﴾. (الصافات.۲۲۔۳۰)

”(جب قیامت برپا ہو گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا) تمام ظالموں اور ان کے ساتھیوں کو اور ان معبودانِ غیر اللہ کو جن کی وہ عبادت کرتے تھے‘ جمع کرو اور انہیں جہنم کا راستہ دکھاؤ...... پھر وہ آپس میں ایک دوسرے سے رد و کد کرنے لگیں گے۔ عبادت کرنے والے کہیں گے‘ کہ تم وہی لوگ ہو جو خیر کی راہ سے ہمارے پاس آئے تھے۔ ان کے معبود جواب دیں گے کہ اصل میں تو خود تم ایمان لانے پر تیار نہ تھے۔ ہمارا کوئی زور تم پر نہ تھا۔ تم آپ ہی نافرمان لوگ تھے“۔

اس آیت میں عابدوں اور معبودوں کے درمیان جو سوال و جواب نقل کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں معبودوں سے مراد بت اور دیوتا نہیں ہیں جن کی پوجا کی جاتی تھی، بلکہ وہ پیشوا اور رہنما ہیں، جنھوں نے سجادوں اور تسبیحوں اور جبّوں اور کلیموں سے بندگانِ خدا کو دھوکا دے کر اپنا معتقد بنایا۔ جنھوں نے اصلاح اور خیر خواہی کے دعوے کر کے شر اور فساد پھیلائے۔ ایسے لوگوں کی اندھی تقلید اور ان کے احکام کی بے چوں و چرا اطاعت کرنے ہی کو یہاں عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾. (التوبہ.۳۱)

''انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا کے بجائے اپنا رب بنالیا، اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو ایک الہٰ کے سوا کسی کی عبادت کا حکم نہیں دیا گیا تھا''۔

یہاں علماء اور مشائخ کو رب بنا کر ان کی عبادت کرنے سے مراد ان کو امر و نہی کا مختار ماننا اور خدا و پیغمبر کی سند کے بغیر ان کے احکام کی اطاعت بجالانا ہے۔ اسی معنی کی تصریح روایات صحیحہ میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی ہے۔ جب آپ سے عرض کیا گیا کہ ہم نے علماء اور مشائخ کی پرستش کبھی نہیں کی تو آپ نے جواب دیا کہ جس چیز کو انھوں نے حلال ٹھیرایا، کیا تم نے اسے حلال نہیں سمجھ لیا؟ اور جسے انھوں نے حرام قرار دیا، کیا تم نے اسے حرام نہیں بنالیا؟

عبادت بمعنی پرستش

اب تیسرے معنی کی آیات لیجیے۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن کی رو سے عبادت بمعنی پرستش میں دو چیزیں شامل ہیں۔

ایک یہ کہ کسی کے لیے سجدہ و رکوع اور دست بستہ قیام اور طواف اور آستانہ بوسی اور نذر و نیاز اور قربانی وغیرہ کے وہ مراسم ادا کیے جائیں، جو بالعموم پرستش کی غرض سے ادا کیئے جاتے ہیں قطع نظر اس سے کہ اسے مستقل بالذات معبود سمجھا جائے، یا بڑے معبود کے ہاں تقرب اور سفارش کا ذریعہ سمجھ کر ایسا کیا جائے۔ یا بڑے معبود کے ماتحت خدائی کے انتظام میں شریک سمجھتے ہوئے یہ حرکت کی جائے۔

دوسرے یہ کہ کسی کو عالمِ اسباب پر ذی اقتدار خیال کر کے اپنی حاجتوں میں اس سے دعا مانگی جائے۔ اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں میں اس کو مدد کے لیے پکارا جائے اور خطرات و نقصانات سے بچنے کے لیے اس سے پناہ مانگی جائے۔

یہ دونوں قسم کے فعل قرآن کی رو سے یکساں پرستش کی تعریف میں آتے ہیں۔ مثالیں:۔

﴿قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ﴾ (المؤمن.٦٦)

''کہو، مجھے تو اس سے منع کر دیا گیا ہے کہ اپنے رب کی طرف سے صریح ہدایات پالینے کے بعد میں ان کی پرستش کروں جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو''۔

﴿وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ...... فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ﴾. (مریم.۴۸۔۴۹)

''(ابراہیم نے کہا) میں تم کو اور اللہ کے ماسوا جنھیں تم پکارتے ہو' ان سب کو چھوڑتا ہوں۔ اور اپنے رب کو پکارتا ہوں...... پس جب وہ ان سے اور اللہ کے ماسوا جن کی وہ عبادت کرتے تھے، ان سب سے الگ ہو گیا تو ہم نے اسے اسحاق جیسا بیٹا دیا''۔

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ○ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ﴾. (احقاف. ۵-٦)

''اور اس سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہو گا، جو اللہ کو چھوڑ کر انھیں پکارے جو قیامت تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتے۔ جنھیں خبر تک نہیں کہ ان کو پکارا جا رہا ہے اور جو کہ روز حشر میں (جب کہ لوگ جمع کیے جائیں گے) اپنے ان پکارنے والوں کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کا انکار کریں گے (یعنی صاف کہیں گے کہ نہ ہم نے ان سے کہا کہ ہماری عبادت کرو اور نہ ہمیں اس کی خبر ہوئی کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔)

تینوں آیتوں میں قرآن نے خود ہی تصریح کر دی ہے کہ یہاں عبادت سے مراد دعا مانگنا اور مدد کے لیے پکارنا ہے۔

﴿بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ﴾. (سبا. ۴۱)

''بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے اور ان میں اکثر ان پر ایمان لائے ہوئے تھے''۔

یہاں جنوں کی عبادت اور ان پر ایمان لانے سے جو کچھ مراد ہے اس کی تشریح سورۂ جن کی یہ آیت کرتی ہے:۔

﴿وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ﴾. (الجن. ٦)

''اور یہ کہ انسانوں میں سے بعض اشخاص جنوں میں سے بعض اشخاص کی پناہ ڈھونڈتے تھے''۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنوں کی عبادت سے مراد ان کی پناہ ڈھونڈنا اور خطرات و نقصان کے مقابلے میں ان سے حفاظت طلب کرنا ہے اور ان پر ایمان لانے سے مراد ان کے متعلق یہ اعتماد رکھنا ہے کہ وہ پناہ دینے اور حفاظت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِيْ لَنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ﴾. (الفرقان. ۱۷، ۱۸)

''جس روز اللہ ان کو اور ان کے معبودوں کو جمع کرے گا، جن کی یہ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں تو وہ ان سے پوچھے گا کہ میرے ان بندوں کو تم نے بہکایا تھا یا یہ خود راہِ راست سے بہک گئے۔ وہ عرض کریں گے ''سبحان اللہ! ہم کو کب زیبا تھا کہ حضور کو چھوڑ کر ہم کسی کو ولی و رفیق بنائیں''۔

یہاں اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معبودوں سے مراد اولیاء انبیاء اور صلحاء ہیں، اور ان کی عبادت سے مراد ان کو بندگی کی صفات سے بالاتر اور خدا کی صفات سے متصف سمجھنا ان کو غیبی امداد اور مشکل و فریاد رسی پر قادر خیال کرنا اور ان کے لیے تعظیم کے وہ مراسم ادا کرنا

ہے، جو پرستش کی حد تک پہنچے ہوئے ہوں؛

﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ٥ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ﴾ (سبا. ۴۰-۴۱)

"جس روز اللہ ان سب کو اکٹھا کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا: کیا وہ تم ہو جن کی یہ لوگ عبادت کرتے تھے؟ تو وہ کہیں گے، سبحان اللہ! ہمیں ان سے کیا تعلق، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے"۔

یہاں فرشتوں کی عبادت سے مراد ان کی پرستش ہے، (یہی فرشتے دوسری مشرک قوموں میں دیوتا (Gods) قرار دیئے گئے تھے۔) جو ان کے استھان اور ہیکل اور خیالی مجسمے بنا کر کی جاتی تھی، اور اس پوجا سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ ان کو خوش کر کے ان کی نظر عنایت اپنے حال پر مبذول کرائی جائے، اور اپنے دنیوی معاملات میں ان سے مدد حاصل کی جائے۔

﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَايَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (یونس. ۱۸)

"وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں"۔

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۔ مَانَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (الزمر. ۳)

"جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی بنا رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں"۔

یہاں بھی عبادت سے مراد پرستش ہے اور غرض کی بھی تشریح کر دی گئی ہے جس کے لیے پرستش کی جاتی ہے۔

عبادت بمعنی بندگی واطاعت و پرستش

اوپر کی مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں عبادت کا لفظ کہیں غلامی واطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، کہیں مجرد اطاعت کے معنی میں، اور کہیں پرستش کے معنی میں۔ اب قبل اس کے کہ ہم وہ مثالیں پیش کریں جن میں یہ لفظ عبادت کے ان تینوں مفہومات کا جامع ہے۔ ایک مقدمہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

اوپر جتنی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ان سب میں اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کا ذکر ہے۔ جہاں عبادت سے مراد غلامی واطاعت ہے وہاں معبود یا شیطان ہے یا وہ باغی انسان ہیں جنھوں نے طاغوت بن کر خدا کے بندوں سے خدا کی بجائے اپنی بندگی واطاعت کرائی، یا وہ رہنما اور پیشوا ہیں

جنھوں نے کتاب اللہ سے بے نیاز ہو کر اپنے خود ساختہ طریقوں پر لوگوں کو چلایا اور جہاں عبادت سے مراد پرستش ہے وہاں معبود یا تو اولیاء' انبیاء اور صلحاء ہیں جنھیں ان کی تعلیم وہدایت کے خلاف معبود بنایا گیا، یا فرشتے اور جن ہیں جن کو محض غلط فہمی کی بنا پر فوق الطبعی ربوبیت میں شریک سمجھ لیا گیا، یا خیالی طاقتوں کے بت اور تماثیل ہیں، جو محض شیطانی اغواء سے مرکز پرستش بن گئے۔ قرآن ان تمام اقسام کے معبودوں کو باطل اور ان کی عبادت کو غلط ٹھیراتا ہے' خواہ ان کی غلامی کی گئی ہو' یا اطاعت یا پرستش۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارے یہ سب معبود' جن کی تم عبادت کرتے رہے ہو، اللہ کے بندے اور غلام ہیں، نہ انھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ان کی عبادت کی جائے اور نہ ان کی عبادت سے بجز نامرادی اور ذلت ورسوائی کے تم کو کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں ان کا اور ساری کائنات کا مالک اللہ ہی ہے اسی کے ہاتھ میں تمام اختیارات ہیں۔ لہٰذا عبادت کا مستحق اکیلے اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ...... وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَايَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ۝﴾ (الاعراف. ۱۹۴۔اور ۱۹۷)

''اللہ کو چھوڑ کر جنھیں تم پکارتے ہو، وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم خود بندے ہو۔ انھیں پکار کر دیکھ لو' اگر تمہارا عقیدہ ان کے بارے میں صحیح ہے تو وہ تمہاری پکار کا جواب دیں (جواب دینے سے مراد جواب میں پکارنا نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد جوابی کارروائی کرنا ہے جیسا کہ اس سے پہلے ہم اشارہ کر چکے ہیں۔)...... اللہ کے سوا جنھیں تم پکارتے ہو وہ نہ تمہاری کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد پر قادر ہیں''۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَايَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ۝ يَعْلَمُ مَابَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَاخَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ﴾. (انبیاء. ۲۶۔۲۸)

''یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔ جنھیں یہ اس کی اولاد کہتے ہیں، وہ دراصل اس کے بندے ہیں جن کو عزت دی گئی ہے، ان کی اتنی مجال نہیں کہ وہ سبقت کر کے اللہ کے حضور میں کچھ عرض کر سکیں، بلکہ جیسا وہ حکم دیتا ہے اسی کے مطابق وہ عمل کرتے ہیں، اسے بھی اللہ جانتا ہے''۔

''اور جو کچھ ان سے پوشیدہ ہے' اس کی بھی اللہ کو خبر ہے وہ اللہ کے حضور میں کسی کی سفارش نہیں کر سکتے، بجز اس کے جس کی سفارش خود اللہ ہی قبول کرنا چاہے اور ان کا حال یہ ہے کہ اللہ کے خوف سے سہمے رہتے ہیں'' (یہاں ان معزز بندوں سے مراد فرشتے ہیں۔)

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا. (زخرف. ۱۹)

"ان لوگوں نے فرشتوں کو جو دراصل رحمٰن کے بندے ہیں۔ دیویاں بنا رکھا ہے"۔

﴿وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ﴾. (صافات. ۱۵۸)

"انھوں نے جنوں کے اور خدا کے درمیان نسبی تعلق فرض کر لیا، حالانکہ جن خود بھی جانتے ہیں کہ ایک روز انھیں حساب کے لیے اس کے حضور میں پیش ہونا ہے"۔

﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا٥﴾ (النساء. ۱۷۲)

"نہ مسیح نے اس کو کبھی اپنے لیے عار سمجھا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں نے 'اور جو کوئی اس کی بندگی و غلامی میں عار سمجھے اور تکبر کرے (وہ بھاگ کر جا کہاں سکتا ہے) ایسے سب لوگوں کو اللہ اپنے حضور میں کھینچ بلائے گا"۔

﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ٥ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ٥﴾ (الرحمن. ۵،۶)

"سورج اور چاند سب گردش میں لگے ہیں، اور تارے اور درخت خدا کے آگے سرِ اطاعت جھکائے ہوئے ہیں"۔

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ (بنی اسرائیل. ۴۴)

"ساتوں آسمانوں اور زمین اور جس قدر موجودات آسمان و زمین میں ہیں۔ سب کے سب اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں، کوئی چیز ایسی نہیں جو حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو"۔

﴿وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ﴾ (الروم. ۲۶)

"آسمان و زمین کی کل موجودات اس کی ملک ہے، اور ساری چیزیں اس کے فرمان کی تابع ہیں"۔

﴿مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا﴾. (هود. ۵۶)

"کوئی جاندار ایسا نہیں جو اللہ کے قبضۂ قدرت میں جکڑا ہوا نہ ہو"۔

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا٥ لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا٥ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا٥﴾ (مریم. ۹۳-۹۵)

"زمین اور آسمانوں کے باشندوں میں سے کوئی ایسا نہیں جو رحمٰن کے سامنے غلام کی حیثیت سے پیش ہونے والا نہ ہو، اس نے سب کا شمار کر رکھا ہے اور قیامت کے روز سب اس کے حضور فرداً فرداً پیش ہوں گے"۔

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (آل عمران.۲٦)

”کہو! خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے ملک دے! اور جس سے چاہے چھین لے' جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے“۔

اس طرح ان سب کو 'جن کی عبادت کسی شکل میں کی گئی ہے' اللہ کا غلام اور بے اختیار ثابت کر دینے کے بعد قرآن تمام جن وانس سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہر مفہوم کے لحاظ سے عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیے۔ غلامی ہو تو اس کی، اطاعت ہو تو اس کی، پرستش ہو تو اس کی، ان میں سے کسی نوع کی عبادت کا شائبہ تک بھی غیر اللہ کے لیے نہ ہو۔

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾. (النحل.۳٦)

ہم نے ہر قوم میں ایک رسول یہی پیغام دے کر بھیجا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے پرہیز کرو“۔

﴿وَالَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْا اِلَی اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰی﴾ (الزمر.۱۷)

”خوشخبری ہے ان کے لیے جنھوں نے طاغوت کی عبادت سے پرہیز کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا“۔

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ٥ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ﴾ (یٰس.٦۰۔٦۱)

”اے بنی آدم! کیا میں نے تم کو تاکید نہ کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور میری عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے“۔

﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... وَمَآ اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ (التوبه.۳۱)

”انھوں نے اللہ کی بجائے اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنالیا...... حالانکہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ ایک الٰہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں“۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ (البقره.۱۷۲)

”اے ایمان لانے والو! اگر تم نے واقعی ہماری عبادت اختیار کی ہے، تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں، انھیں بے تکلف کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو“۔

ان آیات میں اللہ کے لیے اس عبادت کو مخصوص کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو بندگی و غلامی اور اطاعت و فرمانبرداری کے معنیٰ میں ہے، اور اس کے لیے صاف قرینہ موجود ہے کہ طاغوت اور شیطان اور احبار و رہبان اور آباؤ اجداد کی اطاعت و بندگی سے پرہیز کر کے اللہ کی اطاعت

وبندگی اختیار کرنے کی ہدایت کی جارہی ہے۔

﴿قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾. (المؤمن.٦٦)

''کہو مجھے اس سے منع کیا گیا ہے کہ میں اپنے رب کی طرف سے واضح ہدایت پالینے کے بعد ان کی عبادت کروں، جنھیں تم اللہ کے بجائے پکارتے ہو، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کے آگے سرتسلیم خم کردوں''۔

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ﴾ (المؤمن٦٠)

''اور تمہارے رب نے فرمایا ہے مجھے پکارو، میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا اور جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں، وہ یقیناً جہنم میں جھونکے جائیں گے''۔

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا یَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ﴾ (فاطر. ۱۳، ۱۴)

''وہی اللہ تمہارا رب ہے، بادشاہی اسی کی ہے، اس کے سوا تم جن کو پکارتے ہو، ان کے اختیار میں ذرہ برابر کچھ نہیں، تم انہیں پکارو، تو وہ تمہاری پکار سن نہیں سکتے۔ اور سن بھی لیں، تو جواب نہیں دے سکتے، اور قیامت کے روز وہ تمہارے اس شرک کا انکار کریں گے''۔

﴿قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا. وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾. (المائدہ.٧٦)

''کہو کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہو، جو نہ تمہیں نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں نہ نفع پہنچانے کی، سب کچھ سننے اور جاننے والا تو اللہ ہی ہے''۔

ان آیات میں اس عبادت کو اللہ کے لیے مختص کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، جو پرستش کے معنیٰ میں ہے اور اس کے لیے بھی صاف قرینہ موجود ہے کہ عبادت کو دعا کے مترادف کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے اور ماقبل ومابعد کی آیات میں ان معبودوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ جنھیں فوق الطبیعی ربوبیت میں اللہ کا شریک قرار دیا جاتا تھا۔

اب کسی صاحب بصیرت آدمی کے لیے یہ سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں کہ جہاں جہاں قرآن میں اللہ کی عبادت کا ذکر ہے اور آس پاس کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے، جو لفظ عبادت کو اس کے مختلف مفہومات میں سے کسی ایک مفہوم کے لیے خاص کرتا ہو، ایسے مقامات میں عبادت سے مراد غلامی، اطاعت اور پرستش، تینوں مفہوم ہوں گے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات کو دیکھیے:۔

﴿اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِیْ﴾. (طٰہٰ. ۱۴)
''میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ نہیں، لہٰذا میری ہی عبادت کر''۔
﴿ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْہُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ﴾. (انعام. ۱۰۲)
''وہی اللہ تمہارا رب ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو، اور وہ ہر شئے کی خبر گیری کا متکفل ہے''۔
﴿قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ اَعْبُدُ اللّٰہَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (یونس. ۱۰۴)
''کہو' کہ لوگو! اگر تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہے کہ میرا دین کیا ہے، تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا بلکہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں، جو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے' اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں شامل ہو جاؤں''۔
﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ﴾ (یوسف. ۴۰)
''اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو، ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی دلیلِ معبودیت نازل نہیں کی ہے۔ اقتدار صرف اللہ کے لیے خاص ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، یہی سیدھا طریقہ ہے''۔
﴿وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْہِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ فَاعْبُدْہُ وَتَوَکَّلْ عَلَیْہِ﴾ (ہود. ۱۲۳)
''آسمان اور زمین کی جس قدر حقیقتیں بندوں سے پوشیدہ ہیں، ان کا علم اللہ ہی کو ہے اور سارے معاملات اسی کی سرکار میں پیش ہوتے ہیں۔ لہٰذا تو اسی کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ رکھ''۔
﴿لَہٗ مَا بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِکَ وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا ہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا فَاعْبُدْہُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ﴾. (مریم. ۶۴-۶۵)
''جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہم سے پوشیدہ ہے، اور جو کچھ ان دونوں حالتوں کے درمیان ہے، سب کا مالک وہی ہے، اور تیرا رب بھولنے والا نہیں، وہ مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو زمین اور آسمانوں کے درمیان ہیں۔ لہٰذا تو اسی کی عبادت کر اور اسی پر ثابت قدم رہ''۔

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صٰلِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾.
(کھف۔۱۱۰)

''پس جو اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو وہ نیک عمل کرے، اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کی عبادت شریک نہ کرے''۔

کوئی وجہ نہیں کہ ان آیات اور ایسی ہی دوسری تمام آیات میں عبادت کے لفظ کو محض پرستش، بندگی واطاعت کے لیے مخصوص ٹھیرالیا جائے اس طرح کی آیات میں دراصل قرآن اپنی پوری دعوت کو پیش کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ قرآن کی دعوت یہی ہے کہ بندگی، اطاعت' پرستش جو کچھ بھی ہو اللہ کی ہو، لہٰذا ان مقامات پر عبادت کے معنی کو کسی ایک مفہوم میں محدود کرنا، حقیقت میں قرآن کی دعوت کو محدود کرنا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کی دعوت کا ایک محدود تصور لے کر ایمان لائیں گے، وہ اس کی ناقص و ناتمام پیروی کریں گے۔ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

عَابِدُون: (۲۳/۴۷) اصل الفاظ ہیں ''جن کی قوم ہماری عابد ہے'' عربی زبان میں کسی کا مطیع ہونا اور اس کا عبادت گزار ہونا دونوں تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں جو کسی کی بندگی واطاعت کرتا ہے وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے اس سے بڑی اہم روشنی پڑتی ہے لفظ عبادت کے معنی پر اور انبیاء علیہم السلام کی اس دعوت پر کہ صرف اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے سوا ہر ایک کی عبادت چھوڑ دینے کی تلقین جو وہ کرتے تھے اس کا پورا مفہوم کیا تھا۔ عبادت ان کے نزدیک صرف پوجا نہ تھی۔ ان کی دعوت یہ نہیں تھی کہ صرف پوجا اللہ کی کرو، باقی بندگی واطاعت جس کی چاہو کرتے رہو بلکہ وہ انسان کو اللہ کا پرستار بھی بنانا چاہتے تھے اور مطیع فرمان بھی اور ان دونوں معنوں کے لحاظ سے دوسروں کی عبادات کو غلط ٹھیراتے تھے۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ: (۲/۳۹) عبادت کا مادہ عبد ہے اور یہ لفظ آزاد کے مقابلے میں غلام اور مملوک کے لیے عربی زبان میں مستعمل ہوتا ہے اسی معنی کے لحاظ سے ''عبادت'' میں دو مفہوم پیدا ہوئے ہیں۔ ایک پوجا اور پرستش، جیسا کہ عربی زبان کی مشہور و مستند لغت ''لسان العرب'' میں ہے، عبد الله،تأله له. والتعبد ،التنسک۔ دوسرے عاجزانہ اطاعت اور برضا و رغبت فرمانبرداری، جیسا کہ لسان العرب میں ہے، العبادة، الطاعة، ومعنى العبادة فى اللغة الطاعة مع الخضوع۔ وكل من دان لملك فهو عابد له (وقومهما لنا عابدون)۔ والعابد، الخاضع لربه المستسلم المنقاد لامره۔ عبد الطاغوت، اطاعه يعنى الشيطان فيما سول له واغراه۔ اياك نعبد، اى نطيع الطاعة التى يخضع معها۔ اعبدوا ربكم، اطيعوا ربكم۔ پس لغت کی ان مستند تشریحات کے مطابق مطالبہ صرف اللہ تعالیٰ کی پوجا اور پرستش ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت اور اس کے قانون شرعی کی برضا و رغبت پیروی اور

اس کے امر و نہی کی دل و جان سے فرمانبر داری کا بھی ہے۔

مَآ اَعْبُدُ: (۱۰۹/ ۳) اصل الفاظ ہیں ما اعبد۔ عربی زبان میں ما کا لفظ عموماً بے جان یا بے عقل چیزوں کیلئے استعمال ہوتا ہے اور ذی عقل ہستیوں کے لئے من کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں من اعبد کہنے کے بجائے ما اعبد کیوں کہا گیا ہے؟ اس کے چار جواب عام طور پر مفسرین نے دیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں ما بمعنی من ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں ما بمعنی الذی (یعنی جو یا جس) ہے۔ تیسرے یہ کہ دونوں فقروں میں ما مصدر کے معنی میں ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ عبادت نہیں کرتا جو تم کرتے ہو، یعنی مشرکانہ عبادت اور تم وہ عبادت نہیں کرتے جو میں کرتا ہوں، یعنی موحدانہ عبادت، چوتھے یہ کہ پہلے فقرے میں چونکہ ما تعبدون فرمایا گیا ہے اس لئے دوسرے فقرے میں کلام کی مناسبت برقرار رکھتے ہوئے ما اعبد فرمایا گیا ہے لیکن دونوں جگہ صرف لفظ کی یکسانی ہے معنی کی یکسانی نہیں ہے اور اس کی مثالیں قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ملتی ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ آیت ۱۹۴ میں فرمایا گیا ہے۔ ﴿فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ﴾ ''جو تم پر زیادتی کرے اس پر تم ویسی ہی زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر کی ہے'' ظاہر ہے کہ زیادتی کا ویسا ہی جواب جیسی زیادتی کی گئی ہو، زیادتی کی تعریف میں نہیں آتا، مگر محض کلام کی یکسانی کے لیے جواباً زیادتی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورہ توبہ آیت ۶۷ میں ارشاد ہوا ہے۔ نسوا اللہ فنسیھم ''وہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ ان کو بھول گیا'' حالانکہ اللہ بھولتا نہیں ہے اور مقصود کلام یہ ہے کہ اللہ نے ان کو نظر انداز فرمادیا۔ لیکن ان کے نسیان کے جواب میں اللہ کے لئے نسیان کا لفظ محض کلام کی یکسانی برقرار رکھنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

یہ چاروں تاویلات اگرچہ ایک لحاظ سے درست ہیں اور عربی زبان میں یہ سب معنی لینے کی گنجائش ہے لیکن ان میں سے کسی سے بھی وہ اصل مدعا واضح نہیں ہوتا جس کیلئے من اعبد کہنے کے بجائے ما اعبد کہا گیا ہے دراصل عربی زبان میں کسی شخص کیلئے جب من کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس کی ذات کے متعلق کچھ کہنا یا پوچھنا ہوتا ہے اور جب ما کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس کی صفت کے بارے میں استفسار یا اظہار خیال ہوتا ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے اردو زبان میں جب ہم کسی شخص کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کون ہیں تو مقصد اس شخص کی ذات سے تعارف حاصل کرنا ہوتا ہے مگر جب ہم کسی شخص کے متعلق پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کیا ہیں تو اس سے یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ مثلاً وہ فوج کا آدمی ہے تو فوج میں اس کا منصب کیا ہے اور کسی درسگاہ سے تعلق رکھتا ہے تو اس میں ریڈر ہے؟ لیکچرر ہے؟ پروفیسر ہے؟ کس علم یا فن کا استاد ہے؟ کیا ڈگریاں رکھتا ہے؟ وغیرہ پس اگر اس آیت میں یہ کہا جاتا کہ لاانتم عابدون من اعبد تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ جن صفات کے معبود کی عبادت

میں کرتا ہوں ان صفات کے معبود کی عبادت کرنے والے تم نہیں ہو۔ اور یہی وہ اصل بات ہے جس کی بنا پر نبی ﷺ کا دین منکرین خدا کے سوا تمام اقسام کے کفار کے دین سے قطعی طور پر الگ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپ کا خدا ان سب کے خدا سے بالکل مختلف ہے۔

نَعۡبُدُ: (۱/۴) عبادت کا لفظ بھی عربی زبان میں تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) پوجا اور پرستش (۲) اطاعت اور فرمانبرداری۔ (۳) بندگی اور غلامی۔ اس مقام پر تینوں معنی بیک وقت مراد ہیں۔ یعنی ہم تیرے پرستار بھی ہیں، مطیع فرمان بھی اور بندہ و غلام بھی۔ اور بات اتنی ہی نہیں ہے کہ ہم تیرے ساتھ یہ تعلق رکھتے ہیں بلکہ واقعی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ تعلق صرف تیرے ہی ساتھ ہے۔ ان تینوں معنوں میں سے کسی معنی میں بھی کوئی دوسرا ہمارا معبود نہیں ہے۔

عَبۡقَرِیٍّ: (۵۵/۷۶) اصل میں لفظ عبقری استعمال ہوا ہے۔ عرب جاہلیت کے افسانوں میں جنوں کے دار السلطنت کا نام عبقر تھا جسے ہم اردو میں پرستان کہتے ہیں۔ اسی کی نسبت سے عرب کے لوگ ہر نفیس و نادر چیز کو عبقری کہتے تھے، گویا وہ پرستان کی چیز ہے جس کا مقابلہ اس دنیا کی عام چیزیں نہیں کر سکتیں۔ حتیٰ کہ ان کے محاورے میں ایسے آدمی کو بھی عبقری کہا جاتا تھا جو غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ہو، جس سے عجیب و غریب کارنامے صادر ہوں۔ انگریزی میں لفظ (Genius) بھی اسی معنی میں بولا جاتا ہے اور وہ بھی Genii سے ماخوذ ہے جو جن کا ہم معنی ہے۔ اسی لیے یہاں اہل عرب کو جنت کے سروسامان کو غیر معمولی نفاست و خوبی کا تصور دلانے کے لئے عبقری کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

عُتُلٍّ: (۶۸/۱۳) اصل میں لفظ عتل استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو خوب ہٹا کٹا اور بہت کھانے پینے والا ہو۔ اور اس کے ساتھ نہایت بد خلق، جھگڑالو اور سفاک ہو۔

عِتِیًّا: (۱۹/۶۹) یعنی ہر باغی گروہ کا لیڈر۔

عَجَبًا: (۷۲/۱) اصل الفاظ ہیں قرآنا عجبا ۔ قرآن کے معنی ہیں ”پڑھی جانے والی چیز“ اور یہ لفظ غالباً جنوں نے اسی معنی میں استعمال کیا ہو گا کیونکہ وہ پہلی مرتبہ اس کلام سے متعارف ہوئے تھے اور شاید اس وقت ان کو یہ معلوم نہ ہو گا کہ جو چیز وہ سن رہے ہیں اس کا نام قرآن ہے۔ عجب مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہ لفظ عربی زبان میں بہت زیادہ حیرت انگیز چیز کے لیے بولا جاتا ہے۔ پس جنوں کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایسا کلام سن کر آئے ہیں جو اپنی زبان اور اپنے مضامین کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔

عَجَلٍ: (۲۱/۳۷) اصل میں ﴿خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ﴾ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا لفظی ترجمہ ہے ”انسان جلد بازی سے بنایا گیا ہے یا پیدا کیا گیا ہے۔“ لیکن یہ لفظی معنی اصل مقصود کلام نہیں ہیں جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں فلاں شخص عقل کا پتلا ہے اور فلاں شخص

حرفوں کا بنا ہوا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں کہتے ہیں کہ وہ فلاں چیز سے پیدا کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز اس کی سرشت میں ہے۔ یہی بات جس کو یہاں خلق الانسان من عجل کہہ کر ادا کیا گیا ہے، دوسرے جگہ و کان الانسان عجولا، "انسان جلد باز واقع ہوا ہے۔" (بنی اسرائیل آیت ۱۱) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

عِجلِ سَمِین: (۵۱/۲۶) سورہ ہود میں عجل حنیذ (بھنے ہوئے بچھڑے) کے الفاظ ہیں۔ یہاں بتایا گیا کہ آپ نے خوب چھانٹ کر موٹا تازہ بچھڑا بھنوایا تھا۔

عَدَسِهَا: (۲/۶۱) نرسک نوع از غلّہ، ہندی مسور (صُراح)۔ نرسک (منتہی الارب)

(رسائل ومسائل حصہ پنجم ص ۹۵)

العٰدِیٰت: (۱۰۰/۱) آیت کے الفاظ میں یہ تصریح نہیں ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں بلکہ صرف والعادیات (قسم ہے دوڑنے والوں کی) فرمایا گیا ہے۔ اسی لئے مفسرین کے درمیان اس باب میں اختلاف ہوا ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد کیا ہے۔ صحابہ و تابعین کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ اس سے مراد گھوڑے ہیں اور ایک دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ اس سے مراد اونٹ ہیں لیکن چونکہ دوڑتے ہوئے وہ خاص قسم کی آواز جسے ضبح کہتے ہیں، گھوڑوں ہی کی شدت تنفس سے نکلتی ہے اور بعد کی آیات بھی جن میں چنگاریاں جھاڑنے اور صبح سویرے کسی بستی پر چھاپہ مارنے اور وہاں گرد اڑانے کا ذکر آیا ہے، گھوڑوں ہی پر راست آتی ہیں، اس لئے اکثر محققین نے اس سے مراد گھوڑے ہی لیے ہیں۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ "دونوں اقوال میں سے یہ قول ہی قابل ترجیح ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں کیونکہ اونٹ ضبح نہیں کرتا، گھوڑا ہی ضبح کیا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان دوڑنے والوں کی قسم جو دوڑتے ہوئے ضبح کرتے ہیں"۔ امام رازی کہتے ہیں کہ "ان آیات کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مراد گھوڑے ہیں کیونکہ ضبح کی آواز گھوڑے کے سوا کسی سے نہیں نکلتی اور آگ جھاڑنے کا فعل بھی پتھروں پر سموں کی ٹاپ پڑنے کے سوا کسی اور طرح کے دوڑنے سے نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح صبح سویرے چھاپہ مارنا بھی دوسرے جانوروں کی بہ نسبت گھوڑوں ہی کے ذریعہ سے سہل ہوتا ہے۔

العَذَاب: (۲۳/۶۴) عذاب سے مراد یہاں غالباً آخرت کا عذاب نہیں ہے بلکہ دنیا کا عذاب ہے جو اسی زندگی میں ظالموں کو دیکھنا پڑے۔

العَذَاب الاَکبر، العَذَابِ الاَدنیٰ: (۳۲/۲۱) "عذاب اکبر" سے مراد آخرت کا عذاب ہے جو کفر و فسق کی پاداش میں دیا جائے گا۔ اس کے مقابلہ میں "عذاب ادنیٰ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ تکلیفیں ہیں جو اسی دنیا میں انسان کو پہنچتی ہیں۔ مثلاً افراد کی زندگی میں سخت بیماریاں، اپنے عزیز ترین لوگوں کی موت، المناک حادثے، نقصانات، ناکامیاں

وغیرہ۔اور اجتماعی زندگی میں طوفان، زلزلے، سیلاب، وبائیں، قحط۔ فسادات۔ لڑائیاں اور دوسری بہت سی بلائیں جو ہزاروں، لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ان آفات کے نازل کرنے کی مصلحت یہ بیان کی گئی ہے کہ عذاب اکبر میں مبتلا ہونے سے پہلے یہ لوگ ہوش میں آجائیں اور اس طرز فکر و عمل کو چھوڑ دیں جس کی پاداش میں آخر کار انہیں وہ بڑا عذاب بھگتنا پڑے گا۔

الاَعْرَاب: (۹/۹۰) بدوی عربوں سے مراد مدینے کے اطراف میں رہنے والے دیہاتی اور صحرائی ہیں جنہیں عام طور پر بدو کہا جاتا ہے۔

عُرُبًا: (۵۶/۳۷) اصل میں لفظ عوبا استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں عورت کی بہترین نسوانی خوبیوں کے لیے بولا جاتا ہے، اس سے مراد ایسی عورت ہے جو طرحدار ہو، خوش اطوار ہو، خوش گفتار ہو، نسوانی جذبات سے لبریز ہو، اپنے شوہر کو دل وجان سے چاہتی ہو اور اس کا شوہر بھی اس کا عاشق ہو۔

اَلْمَعَارِج: (۷۰/۳) اصل میں لفظ ذی المعارج استعمال ہوا ہے۔ معارج، معراج کی جمع ہے جس کے معنی زینے والی سیڑھی، یا ایسی چیز کے ہیں جس کے ذریعے سے اوپر چڑھا جائے، اللہ تعالیٰ کو معارج والا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات بہت بالا و برتر ہے اور اس کے حضور باریاب ہونے کے لیے فرشتوں کو پے درپے بلندیوں سے گزرنا ہوتا ہے، جیسا کہ بعد والی سورہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

عَرْضُهَا: (۵۷/۲۱) اصل الفاظ ہیں ﴿عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾۔ بعض مفسرین نے عرض کو چوڑائی کے معنی میں لیا ہے لیکن دراصل یہاں یہ لفظ وسعت و پہنائی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں لفظ عرض صرف چوڑائی کے معنی ہی کے لئے نہیں بولا جاتا جو طول کا مدمقابل ہے۔ بلکہ اسے مجرد وسعت کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ ایک دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: فذو دعاء عریض، "انسان پھر لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے"۔ (حم السجدہ ۵۱)۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اس ارشاد سے مقصد جنت کا رقبہ بتانا نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت کا تصور دلانا ہے۔ یہاں اس کی وسعت آسمان و زمین جیسی بتائی گئی ہے اور سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے ﴿سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (آیت ۱۳۳)۔ "دوڑو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت ساری کائنات ہے جو مہیا کی گئی ہے متقی لوگوں کے لئے"۔ ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے کچھ ایسا تصور ذہن میں آتا ہے کہ جنت میں ایک انسان کو جو باغ اور محلات ملیں گے وہ تو صرف اس کے قیام کے لئے ہوں گے، مگر درحقیقت پوری کائنات اس کی سیر گاہ ہو گی۔ کہیں وہ بند نہ ہو گا۔ وہاں اس کا حال اس دنیا کی طرح نہ ہو گا کہ چاند جیسے قریب

ترین سیارے تک پہنچنے کے لئے بھی وہ برسوں پاپڑ بیلتا رہا اور اس ذرا سے سفر کی مشکلات کو رفع کرنے میں اسے بے تحاشا وسائل صرف کرنے پڑے۔ وہاں ساری کائنات اس کے لیے کھلی ہو گی جو کچھ چاہے گا اپنی جگہ سے بیٹھے بیٹھے دیکھ لے گا اور جہاں چاہے گا بے تکلف جا سکے گا۔

مُعْرِضُون: (۳/۲۳) معرضون کا ترجمہ ہم نے ''دور رہتے ہیں'' کیا ہے مگر اس سے بات پوری طرح ادا نہیں ہوتی۔ آیت کا پورا مطلب یہ ہے کہ وہ لغویات کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ان کی طرف رخ نہیں کرتے۔ ان میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ جہاں ایسی باتیں ہو رہی ہوں یا ایسے کام ہو رہے ہیں وہاں جانے سے پرہیز کرتے ہیں، ان میں حصہ لینے سے اجتناب کرتے ہیں اور اگر کہیں ان سے سابقہ پیش آ ہی جائے تو ٹل جاتے ہیں، کترا کر نکل جاتے ہیں، یا بدرجہ آخر بے تعلق ہو رہتے ہیں، اسی بات کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ (الفرقان آیت ۷۲) یعنی جب کسی ایسی جگہ سے ان کا گزر ہوتا ہے جہاں لغو باتیں ہو رہی ہوں، یا لغو کام ہو رہے ہوں وہاں سے مہذب طریقے پر گزر جاتے ہیں۔

المَعْرُوف: (۲/۱۷۸) ''معروف'' کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے اس سے مراد وہ صحیح طریقہ کار ہے جس سے بالعموم انسان واقف ہوتے ہیں جس کے متعلق ہر وہ شخص جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو۔ یہ بول اٹھے کہ بے شک حق اور انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریق عمل ہے، رواج عام (Common Law) کو بھی اسلامی اصطلاح میں ''عرف'' اور ''معروف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ ایسے تمام معاملات میں معتبر ہے جن کے بارے میں شریعت نے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔

سَیْلَ الْعَرِمِ: (۳۴/۱۶) اصل میں لفظ سیل العرم استعمال کیا گیا ہے۔ عرم جنوبی عرب کی زبان کے لفظ عرمن سے ماخوذ ہے جس کے معنی ''بند'' کے ہیں۔ یمن کے کھنڈروں میں جو قدیم کتبات موجودہ زمانے میں دستیاب ہوئے ہیں ان میں یہ لفظ اس معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ۵۴۲ یا ۵۴۳ء کا ایک کتبہ جو یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے سد مآرب کی مرمت کرانے کے بعد نصب کرایا تھا اس میں وہ اس لفظ کو بار بار بند کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا سیل العرم سے مراد وہ سیلاب ہے جو کسی بند کے ٹوٹنے سے آئے۔

عُزَیْر: (۹/۳۰) عزیر سے مراد عزرا (Ezra) ہیں جن کو یہودی اپنے دین کا مجدد مانتے ہیں۔ ان کا زمانہ ۴۵۰ قبل مسیح کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جو دور ابتلاء بنی اسرائیل پر آیا اس میں نہ صرف یہ کہ توراۃ دنیا سے گم ہو گئی تھی بلکہ بابل کی اسیری نے اسرائیلی نسلوں کو اپنی شریعت، اپنی روایات اور اپنی قومی زبان، عبرانی تک سے نا آشنا کر دیا تھا۔ آخر کار انہی عزیر یا عزرا نے بائبل کے پرانے عہد نامے کو مرتب کیا اور شریعت کی تجدید کی۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل ان کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور یہ تعظیم اس حد

تک بڑھ گئی کہ بعض یہودی گروہوں نے ان کو ابن اللہ تک بنا دیا۔ یہاں قرآن مجید کے ارشاد کا مقصود یہ نہیں ہے کہ تمام یہودیوں نے بالاتفاق عزرا کاہن کو خدا کا بیٹا بنایا ہے بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا کے متعلق یہودیوں کے اعتقادات میں جو خرابی رونما ہوئی وہ اس حد تک ترقی کر گئی کہ عزرا کو خدا کا بیٹا قرار دینے والے بھی ان میں پیدا ہوئے۔

عِزاً: (۱۹/۸۱) اصل میں لفظ عِزاً استعمال ہوا ہے، یعنی وہ ان کے لیے سببِ عزت ہوں۔ مگر عزت سے مراد عربی زبان میں کسی شخص کا ایسا طاقت ور اور زبردست ہونا ہے کہ اس پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے اور ایک شخص کا دوسرے شخص کے لیے سببِ عزت بننا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس کی حمایت پر ہو جس کی وجہ سے اس کا کوئی مخالف اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔

العِزَّة: (۱۳۹/۴) ''عزت'' کا مفہوم عربی زبان میں اردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے، اردو میں عزت محض احترام اور قدر و منزلت کے معنی میں آتا ہے۔ مگر عربی میں عزت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے، دوسرے الفاظ میں لفظ عزت ''ناقابل ہتک حرمت'' کا ہم معنی ہے۔

العَزِیز: (۵۹/۲۳) اصل میں لفظ العزیز استعمال ہوا ہے جس سے مراد ایسی زبردست ہستی جس کے مقابلہ میں کوئی سر نہ اٹھا سکتا ہو جس کے فیصلوں کی مزاحمت کرنا کسی کے بس میں نہ ہو جس کے آگے سب بے بس اور بے ضرر ہوں۔

اَعِزَّةٍ علَى الکٰفِرِینَ: (۵/۵۴) ''کفار پر سخت'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن آدمی اپنے ایمان کی پختگی، دینداری کے خلوص، اصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمان کی فراست کی وجہ سے مخالفین اسلام کے مقابلہ میں پتھر کی چٹان کے مانند ہو کہ کسی طرح اپنے مقام سے ہٹایا نہ جا سکے، وہ اسے کبھی موم کی ناک اور نرم چارہ نہ پائیں، انہیں جب بھی اس سے سابقہ پیش آئے ان پر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کا بندہ مر سکتا ہے مگر کسی قیمت پر بک نہیں سکتا اور کسی دباؤ سے دب نہیں سکتا۔

العُزّٰی: (۵۳/۱۹) عزیٰ عزت سے ہے اور اس کے معنی عزت والی کے ہیں۔ یہ قریش کی خاص دیوی تھی اور اس کا استھان مکہ اور طائف کے درمیان وادی نخلہ میں حراض کے مقام پر واقع تھا (نخلہ کی جائے وقوع کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحقاف، حاشیہ ۳۳) بنی ہاشم کے حلیف قبیلہ بنی شیبان کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ قریش اور دوسرے قبائل کے لوگ اس کی زیارت کرتے اور اس پر نذریں چڑھاتے اور اس کے لیے قربانیاں کرتے تھے، کعبہ کی طرح اس کی طرف بھی ہدی کے جانور لے جائے جاتے اور تمام بتوں سے بڑھ کر اس کی عزت کی جاتی تھی، ابن ہشام کی روایت ہے کہ ابو احیحہ جب مرنے لگا تو ابولہب اس کی عیادت کے لئے گیا، دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔ ابولہب نے کہا کیوں رو رہے ہو ابو احیحہ؟ کیا موت سے ڈرتے ہو؟

حالانکہ وہ سب ہی کو آنی ہے۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں موت سے ڈر کر نہیں روتا بلکہ مجھے یہ غم کھائے جارہا ہے کہ میرے بعد عزیٰ کی پوجا کیسے ہوگی۔ ابو لہب بولا اس کی پوجا نہ تمہاری زندگی میں تمہاری خاطر ہوتی تھی اور نہ تمہارے بعد اسے چھوڑا جائے گا۔ ابو احیحہ نے کہا اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے بعد کوئی میری جگہ سنبھالنے والا ہے۔

يَعْصِرُون: (۱۲/ ۴۹) متن میں لفظ ''یعصرون'' استعمال ہوا ہے جس کے لفظی معنی ''نچوڑنے'' کے ہیں۔ اس سے مقصود یہاں سرسبزی و شادابی کی وہ کیفیت بیان کرنا ہے جو قحط کے بعد باران رحمت اور دریائے نیل کے چڑھاؤ سے رونما ہونے والی تھی۔ جب زمین سیراب ہوتی ہے تو تیل دینے والے بیج اور رس دینے والے پھل اور میوے خوب پیدا ہوتے ہیں اور مویشی بھی چارہ اچھا ملنے کی وجہ سے خوب دودھ دینے لگتے ہیں۔

العَصر: (۱۰۳/۱) زمانے کا لفظ گزرے ہوئے زمانے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور گزرتے ہوئے زمانے کے لئے بھی جس میں حال درحقیقت کسی لمبی مدت کا نام نہیں ہے۔ ہر آن گزر کر ماضی بنتی چلی جارہی ہے اور ہر آن آ کر مستقبل کو حال اور جا کر حال کو ماضی بنا رہی ہے۔ یہاں چونکہ مطلقاً زمانے کی قسم کھائی گئی ہے، اس لئے دونوں طرح کے زمانے اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی ان صفات سے خالی تھے وہ بالآخر خسارے میں پڑ کر رہے اور گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب سمجھنے سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے وہ دراصل وہ وقت ہے جو ایک ایک شخص اور ایک ایک قوم کو دنیا میں کام کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اس کی مثال اس وقت کی سی ہے جو امتحان گاہ میں طالب علم کو پرچے حل کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ یہ وقت جس تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہا ہے اس کا اندازہ تھوڑی دیر کیلئے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے سے آپ کو ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک سیکنڈ بھی وقت کی بہت بڑی مقدار ہے۔ اسی ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا راستہ طے کر لیتی ہے اور خدا کی خدائی میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوں خواہ وہ ابھی تک ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔ تاہم اگر وقت کے گزرنے کی رفتار وہی سمجھ لی جائے جو گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کے چلنے سے ہم کو نظر آتی ہے اور اس بات پر غور کیا جائے کہ ہم جو کچھ بھی اچھا یا برا فعل کرتے ہیں اور جن کاموں میں بھی ہم مشغول رہتے ہیں سب کچھ اس محدود مدت عمر ہی میں وقوع پذیر ہوتا ہے جو دنیا میں ہم کو کام کرنے کے لئے دی گئی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا اصل سرمایہ تو یہی وقت ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔ امام رازی نے کسی بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے سورہ عصر کا مطلب ایک برف فروش سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ رحم کرو اس شخص پر جس کا

سرمایہ گھلا جارہا ہے، رحم کرو اس شخص پر جس کا سرمایہ گھلا جارہا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر میں نے کہا یہ وَ الْعَصْرِ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ کا مطلب۔ عمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہ برف کے گھلنے کی طرح تیزی سے گزر رہی ہے۔ اس کو اگر ضائع کیا جائے یا غلط کاموں میں صرف کرڈالا جائے تو یہی انسان کا خسارہ ہے۔ ''پس گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اس سورہ میں کہی گئی ہے، اسکے معنی یہ ہیں کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ ان چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مہلت عمر کو صرف کر رہا ہے وہ سب کے سب خسارے کے سودے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو ان چاروں صفات سے متصف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہم اس طالب علم سے جو امتحان کے مقررہ وقت کو اپنا پرچہ حل کرنے کے بجائے کسی اور کام میں گزار رہا ہو، کمرے کے اندر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف اشارہ کر کے کہیں کہ یہ گزرتا ہوا وقت بتا رہا ہے کہ تم اپنا نقصان کر رہے ہو، نفع میں صرف وہ طالب علم ہے جو اس وقت کا ہر لحہ اپنا پرچہ حل کرنے میں صرف کر رہا ہے۔

كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ: (۱۰۵/۵) اصل الفاظ ہیں **کعصف ماکول**۔ **عصف** کا لفظ سورہ رحمان آیت ۱۲ میں آیا ہے **ذو العصف والریحان** ''اور غلہ بھوسے اور دانے والا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ عصف کے معنی اس چھلکے کے ہیں جو غلے کے دانوں پر ہوتا ہے اور جسے کسان دانے نکال کر پھینک دیتے ہیں، پھر جانور اسے کھاتے بھی ہیں اور کچھ ان کے چبانے کے دوران میں گرتا بھی جاتا ہے اور کچھ ان کے پاؤں تلے روندا بھی جاتا ہے۔

العَقِيْم: (۵۱/۴۱) اس ہوا کے لئے لفظ عقیم استعمال ہوا ہے جو بانجھ عورت کے لئے بولا جاتا ہے اور لغت میں اس کے اصل معنی یابس (خشک) کے ہیں۔ اگر اسے لغوی معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایسی سخت گرم و خشک ہوا تھی کہ جس چیز پر سے وہ گزر گئی اسے سکھا کر رکھ دیا۔ اور اگر اسے محاورے کے مفہوم میں لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بانجھ عورت کی طرح وہ ایسی ہوا تھی جو اپنے اندر کوئی نفع نہ رکھتی تھی۔ نہ خوشگوار تھی نہ بارش لانے والی نہ درختوں کو بار آور کرنے والی اور نہ ان فائدوں میں سے کوئی فائدہ اس میں تھا جن کے لیے ہوا کا چلنا مطلوب ہوتا ہے۔ دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ یہ صرف بے خیر اور خشک ہی نہ تھی بلکہ نہایت شدید آندھی کی شکل میں آئی تھی جس نے لوگوں کو اٹھا اٹھا کر پٹخ دیا اور یہ مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک چلتی رہی۔ یہاں تک کہ قوم عاد کے پورے علاقے کو اس نے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

عَقِيْم: (۲۲/۵۵) اصل میں لفظ عقیم استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ بانجھ ہے۔ دن کو بانجھ کہنے کے دو معانی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایسا منحوس دن ہو جس میں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو، ہر کوشش الٹی پڑے اور ہر امید مایوسی میں تبدیل ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ ایسا دن ہو جس

کے بعد رات دیکھنی نصیب نہ ہو۔ دونوں صورتوں میں مراد وہ دن جس میں کسی قوم کی بربادی کا فیصلہ ہو جائے۔ مثلاً جس روز قوم نوح پر طوفان آیا۔ وہ اس کے لیے بانجھ دن تھا۔ اسی طرح عاد، ثمود، قوم لوط، اہل مدین اور دوسری سب تباہ شدہ قوموں کے حق میں عذاب الٰہی کے نزول کا دن بانجھ ہی ثابت ہوا کیونکہ اس امروز کا کوئی فردا پھر وہ نہ دیکھ سکے اور کوئی چارہ گری ان کے لیے ممکن نہ ہوئی جس سے وہ اپنی قسمت کی بگڑی بنا سکتے۔

عَاکِفُون: (۲/۱۸۷) معتکف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی رمضان کے آخری دس دن مسجد میں رہے اور یہ دن اللہ کے ذکر کے لئے مختص کر دے۔ اس اعتکاف کی حالت میں آدمی اپنی انسانی حاجات کے لیے مسجد سے باہر جا سکتا ہے مگر لازم ہے کہ وہ اپنے آپکو شہوانی لذتوں سے روکے رکھے۔

عَلَق: (۹۶/۲) کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے اسکی تخلیق کی ابتدا کر کے اسے پورا انسان بنایا۔ علق جمع ہے علقہ کی جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی حالت جو استقرار حمل کے بعد پہلے چند دنوں میں رونما ہوتی ہے، پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

عِلْماً: (۲۸/۱۴) علم سے مراد دینی اور دنیوی علوم دونوں ہیں۔

عِلْماً: (۱۲/۲۲) "علم" سے مراد وہ خاص علم حقیقت ہے جو انبیاء کو وحی کے ذریعہ براہ راست دیا جاتا ہے۔

عَلِیْم: (۵۹/۲۲) علیم ہے یعنی وہ جانتا ہے کہ کس نے فی الحقیقت اسی کی راہ میں گھربار چھوڑا ہے اور وہ کس انعام کا مستحق ہے۔

عَلَا فِی الْاَرْض: (۲۸/۴) علا اصل میں لفظ علا فی الارض استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے زمین میں سر اٹھایا، باغیانہ روش اختیار کی، اپنی اصل حیثیت۔ یعنی بندگی کے مقام سے اٹھ کر خود مختاری اور خداوندی کا روپ دھار لیا۔ ماتحت بن کر رہنے کے بجائے بالادست بن بیٹھا اور جبار و متکبر بن کر ظلم ڈھانے لگا۔

عَلَیْهُ اللّٰه: (۴۸/۱۰) اس مقام پر ایک لطیف نکتہ نگاہ میں رہنا چاہیے کہ عربی زبان کے عام قاعدے کی رو سے یہاں عهد علیهِ الله َ پڑھا جانا چاہئے تھا لیکن اس عام قاعدے سے ہٹ کر اس جگہ علیه ُ الله َ پڑھا جاتا ہے، علامہ آلوسی نے اس غیر معمولی اعراب کے دو وجوہ بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ اس خاص موقع پر اس ذات کی بزرگی اور جلالت شان کا اظہار مقصود ہے۔ جس کے ساتھ یہ عہد استوار کیا جا رہا تھا اس لئے یہاں علیہ کے بجائے علیہُ ہی زیادہ مناسب ہے۔ دوسرے یہ کہ علیہ میں "ہ" دراصل هُوَ کی قائم مقام ہے اور اس کا اصلی اعراب پیش ہی تھا نہ

کہ زیر۔ لہذا یہاں اس کے اصلی اعراب کو باقی رکھنا وفائے عہد کے مضمون سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ: (۹/۱۰۴) في عمد ممددة کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جہنم کے دروازوں کو بند کر کے ان پر اونچے اونچے ستون گاڑ دئے جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ مجرم اونچے اونچے ستونوں سے بندھے ہوئے ہوں گے۔ تیسرا مطلب ابن عباس نے یہ بیان کیا ہے کہ اس آگ کے شعلے لمبے ستونوں کی شکل میں اٹھ رہے ہوں گے۔

عِمرَان: (۳۳/۳) عمران حضرت موسیٰ اور ہارون کے والد کا نام تھا، جسے بائبل میں ''عمرام'' لکھا ہے۔

العٰمِلِينَ: (۶۰/۹) یعنی وہ لوگ جو صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے اور ان کا حساب کتاب لکھنے اور انہیں تقسیم کرنے میں حکومت کی طرف سے استعمال کیے جائیں، ایسے لوگ خواہ فقیر و مسکین نہ ہوں، ان کی تنخواہیں بہر حال صدقات ہی کی مد سے دی جائیں گی۔ یہ الفاظ اور اسی سورہ کی آیت ۱۰۳ کے الفاظ ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ اس امر کی دلالت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان (یعنی بنوہاشم) پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا، چنانچہ آپ نے خود صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام ہمیشہ بلا معاوضہ کیا اور دوسرے بنی ہاشم کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ اگر وہ اس خدمت کو بلا معاوضہ انجام دیں تو جائز ہے لیکن معاوضہ لے کر اس شعبے کی کوئی خدمت کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ آپ کے خاندان کے لوگ اگر صاحب نصاب ہوں تو زکوٰۃ دینا ان پر فرض ہے لیکن اگر وہ غریب محتاج یا قرض دار یا مسافر ہوں تو زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ خود بنی ہاشم کی زکوٰۃ بھی بنی ہاشم لے سکتے ہیں یا نہیں۔ امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ لے سکتے ہیں لیکن اکثر فقہاء اس کو بھی جائز نہیں رکھتے۔

عَهْدُ اللّٰه: (۱۵۲/۶) ''اللہ کے عہد'' سے مراد وہ عہد ہے جو انسان اپنے خدا سے کرے اور وہ بھی جو خدا کا نام لے کر بندوں سے کرے، اور وہ بھی جو انسان اور خدا، اور انسان اور انسان کے درمیان اسی وقت آپ سے آپ بندھ جاتا ہے جس وقت ایک شخص خدا کی زمین میں ایک انسانی سوسائیٹی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔

پہلے دونوں عہد شعوری وارادی ہیں، اور تیسرا عہد ایک فطری عہد (Natural Contract) ہے جس کے باندھنے میں اگرچہ انسان کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے لیکن واجب الاحترام ہونے میں یہ پہلے دونوں عہدوں سے کسی طرح کم نہیں ہے، کسی شخص کا خدا کے بخشے ہوئے وجود سے، اس کی عطا کی ہوئی جسمانی و نفسانی قوتوں سے، اس کے دیے ہوئے جسمانی آلات سے،

اور اس کی پیدا کی ہوئی زمین اور رزق اور ذرائع سے فائدہ اٹھانا، اور ان مواقع زندگی سے متمتع ہونا جو قوانین قدرت کی بدولت فراہم ہوتے ہیں، خود بخود فطرۃً خدا کے کچھ حقوق اس پر عائد کر دیتا ہے اور اسی طرح آدمی کا ایک ماں کے پیٹ میں اس کے خون سے پرورش پانا، ایک باپ کی محنتوں سے بسے ہوئے گھر میں پیدا ہونا اور ایک اجتماعی زندگی کے بے شمار مختلف اداروں سے مختلف صورتوں میں متمتع ہونا، علیٰ قدر مراتب اس کے ذمہ بہت سے افراد اور اجتماعی اداروں کے حقوق بھی عائد کر دیتا ہے، انسان کا خدا سے اور انسان کا سوسائٹی سے یہ عہد کسی کاغذ پر نہیں لکھا گیا، مگر اس کے رونگٹے رونگٹے پر ثبت ہے، انسان نے اسے شعور وارادہ کے ساتھ نہیں باندھا مگر اس کا پور اوجود اس عہد کا رہین منت ہے، اسی عہد کی طرف سورہ بقرہ آیت ۲۷ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فاسق وہ ہیں جو "اللہ کے عہد کو اس کی استواری کے بعد توڑتے ہیں اور جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں"۔ اور اسی کا ذکر آگے سورہ اعراف میں آیت ۱۷۲ میں آتا ہے کہ اللہ نے ازل میں آدم کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو نکال کر ان سے شہادت طلب کی کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اور انہوں نے اقرار کیا تھا کہ ہاں، ہم گواہ ہیں۔

عَھْدَ اللّٰہ: (۲/۲۷) بادشاہ اپنے ملازموں اور رعایا کے نام جو فرمان یا ہدایات جاری کرتا ہے ان کو عربی محاورے میں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ ان کی تعمیل رعایا پر واجب ہوتی ہے۔ یہاں عہد کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کا وہ مستقل فرمان ہے جس کی رو سے تمام نوع انسانی صرف اسی کی بندگی، اطاعت اور پرستش کرنے پر مامور ہے۔

مَعَاد: (۲۸/۸۵) اصل الفاظ ہیں ﴿لَرَآدُّکَ اِلیٰ مَعَاد﴾۔ تمہیں ایک معاد کی طرف پھیرنے والا ہے۔" معاد کے لغوی معنی ہیں وہ مقام جس کی طرف آخر کار آدمی کو پلٹنا ہو۔ اور اسے نکرہ استعمال کرنے سے اس میں خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مقام بڑی شان و عظمت کا مقام ہے۔

عَوْرَات: (۲۴/۵۸) اصل میں لفظ عورات استعمال ہوا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ "یہ تین وقت تمہارے لیے عورات ہیں۔" عورت اردو میں صنف اناث کے لیے بولا جاتا ہے

مگر عربی میں اس کے معنی خلل اور خطرے کی جگہ کے ہیں، اور اس چیز کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس کا کھل جانا آدمی کے لیے باعث شرم ہو یا جس کا ظاہر ہو جانا اس کو ناگوار ہو، نیز اس معنی میں بھی مستعمل ہے کہ کوئی چیز غیر محفوظ ہو۔ یہ سب معنی باہم قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔

یَعُوْق: (۷۱/۲۳) یعوق یمن کے علاقہ ہمدان میں قبیلہ ہمدان کی شاخ خیوان کا معبود تھا اور اس کا بت گھوڑے کی شکل کا تھا۔

(غ)

التَّغَابُن: (۹/۶۴) اصل میں لفظ یوم التغابن استعمال ہوا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ اردو زبان تو کیا کسی دوسری زبان کے بھی ایک لفظ، بلکہ ایک فقرے میں اس کا مفہوم ادا نہیں کیا جا سکتا۔ خود قرآن مجید میں بھی قیامت کے جتنے نام آئے ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ پر معنی نام یہی ہے۔ اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے تھوڑی سی تشریح ناگزیر ہے۔

تغابن غبن سے ہے جس کا تلفظ غَبْن بھی ہے اور غَبَن بھی، غَبْن زیادہ تر خرید و فروخت اور لین دین کے معاملہ میں بولا جاتا ہے اور غَبَن رائے کے معاملہ میں لیکن کبھی کبھی اس کے بر عکس بھی استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں اس کے متعدد معنی بیان کیے ہیں: غبنوا خبر الناقة ''ان لوگوں کو پتہ نہیں چلا کہ ان کی اونٹنی کہاں گئی۔'' غبن فلانا فی البیع ''اس نے فلاں شخص کو خرید و فروخت میں دھوکا دیا''۔ غبن فلانا ''اس نے فلاں شخص کو گھاٹا دے دیا''۔ غبنت من حقی عند فلان، ''فلاں شخص سے اپنا حق وصول کرنے میں مجھ سے بھول ہو گئی''۔ غبین ''وہ شخص جس میں ذہانت کی کمی ہو اور جس کی رائے کمزور ہو''۔ مغبون ''وہ شخص جو دھوکا کھا جائے'' ''الغبن، الغفلة، النسیان، فوت الحظ، ان یبخس صاحبك فی معاملة بینك وبینه لضرب من الاخفاء''۔ (غبن کے معنی ہیں غفلت، بھول، اپنے حصے سے محروم رہ جانا، ایک شخص کا کسی غیر محسوس طریقے سے کاروبار یا باہمی معاملہ میں دوسرے کو نقصان دینا'۔ امام حسن بصریؒ نے دیکھا کہ ایک شخص دوسرے کو بیع میں دھوکا دے رہا ہے تو فرمایا ھذا یغبن عقلك ''یہ شخص تجھے بے وقوف بنا رہا ہے''۔)

اس سے جب لفظ تغابن بنایا جائے تو اس میں دو یا زائد آدمیوں کے درمیان غبن واقع ہونے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، تغابن القوم کے معنی ہیں بعض لوگوں کا بعض لوگوں کے ساتھ غبن کا معاملہ کرنا، یا ایک شخص کا دوسرے کو نقصان پہنچانا اور دوسرے کا اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا جانا، یا ایک کا حصہ دوسرے کو مل جانا اور اس کا اپنے حصے سے محروم رہ جانا۔ یا تجارت میں ایک فریق کا خسارہ اٹھانا اور دوسرے فریق کا نفع اٹھا لے جانا۔ یا کچھ لوگوں کا کچھ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں غافل یا ضعیف الرائے ثابت ہونا۔

اب اس بات پر غور کیجئے کہ آیت میں قیامت کے متعلق فرمایا گیا ہے ﴿ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ ''وہ دن ہوگا تغابن کا''۔ ان الفاظ سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ دنیا میں تو شب و روز تغابن ہوتا ہی رہتا ہے لیکن یہ تغابن ظاہری اور نظر کا فریب ہے، اصلی اور حقیقی تغابن نہیں ہے۔ اصل تغابن قیامت کے روز ہوگا وہاں جا کر یہ پتہ چلے گا کہ اصل میں خسارہ کس نے

اٹھایااور کون نفع کما لے گیا، اصل میں کس کا حصہ کسے مل گیااور کون اپنے حصے سے محروم رہ گیا، اصل میں دھوکا کس نے کھایااور کون ہوشیار نکلا۔ اصل میں کس نے اپنا تمام سرمایۂ حیات ایک غلط کاروبار میں کھپا کر اپنا دیوالیہ نکال دیا، اور کس نے اپنی قوتوں اور قابلیتوں اور مساعی اور اموال اور اوقات کو نفع کے سودے پر لگا کر وہ سارے فائدے لوٹ لئے جو پہلے شخص کو بھی حاصل ہو سکتے تھے۔ اگر وہ دنیا کی حقیقت سمجھنے میں دھوکا نہ کھاتا۔

غُثَآء: (۲۳/۴۱) اصل میں لفظ غثاء استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں وہ کوڑا کرکٹ جو سیلاب کے ساتھ بہتا ہوا آتا ہے اور پھر کناروں پر لگ لگ کر سڑتا رہتا ہے۔

الغَرُوْرُ: (۳۱/۳۳) الغرور (دھوکے باز) سے مراد شیطان بھی ہو سکتا ہے، کوئی انسان کا کوئی گروہ بھی ہو سکتا ہے، انسان کا اپنا نفس بھی ہو سکتا ہے اور کوئی دوسری چیز بھی ہو سکتی ہے۔ کسی شخص خاص یا شئے خاص کا تعین کیے بغیر اس وسیع المعنی لفظ کو اس کی مطلق صورت میں رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے لیے فریب خوردگی کے بنیادی اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ جس شخص نے خاص طور پر جس ذریعہ سے بھی وہ اصل فریب کھایا ہو جس کے اثر سے اس کی زندگی کا رخ صحیح سمت سے غلط سمت مڑ گیا وہی اس کے لئے الغرور ہے۔

الغُرْفَة: (۲۵/۷۵) اصل میں لفظ غرفہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی بلند و بالا عمارت کے ہیں۔ اس کا ترجمہ عام طور پر ''بالا خانہ'' کیا جاتا ہے جس سے آدمی کے ذہن میں ایک دو منزلہ کوٹھے کی سی تصویر آجاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان جو بڑی سے بڑی اور اونچی سے اونچی عمارتیں بناتا ہے، حتیٰ کہ ہندوستان کا روضہ تاج اور امریکہ کے ''فلک شگاف'' (Sky-scrapers) تک جنت کے ان محلات کی محض ایک بھونڈی سی نقل ہیں جن کا ایک دھندلا سا نقشہ اولاد آدم کے لاشعور میں محفوظ چلا آتا ہے۔

الغٰرِمِیْنَ: (۹/۶۰) یعنی ایسے قرض دار جو اگر اپنے مال سے اپنا پورا قرض چکادیں تو ان کے پاس قدر نصاب سے کم مال بچ سکتا ہو۔ وہ خواہ کمانے والے ہوں یا بے روزگار اور خواہ عرف عام میں فقیر سمجھے جاتے ہوں یا غنی، دونوں صورتوں میں ان کی اعانت زکوٰۃ کی مد سے کی جاسکتی ہے۔ مگر متعدد فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جس شخص نے بداعمالیوں اور فضول خرچیوں میں اپنا مال اڑا کر اپنے آپ کو قرضداری میں مبتلا کیا ہو اس کی مدد نہ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کرلے۔

غَسَقِ الَّیْلِ: (۱۷/۷۸) غسق اللیل بعض کے نزدیک ''رات کا پوری طرح تاریک ہوجانا ہے'' اور بعض اس سے نصف شب مراد لیتے ہیں۔ اگر پہلا قول تسلیم کیا جائے تو اس سے عشاء کا وقت مراد ہوگا اور اگر دوسرا قول صحیح مانا جائے تو پھر یہ اشارہ عشاء کے آخر وقت کی طرف ہے

غَاسِق: (۱۱۳/۳) غاسق کے لغوی معنی تاریک کے ہیں چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ نماز قائم کرو زوال آفتاب کے وقت

سے رات کے اندھیرے تک (بنی اسرائیل ۷۸)

غَسَّاقٌ: (۳۸/۵۷) اصل میں لفظ غساق استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی اہل لغت نے بیان کیے ہیں۔ ایک معنی جسم سے نکلنے والی رطوبت کے ہیں جو پیپ، لہو، کچ، لہو وغیرہ کی شکل میں ہو اور اس میں آنسو بھی شامل ہیں۔ دوسرے معنی انتہائی سرد چیز کے ہیں، اور تیسرے معنی انتہائی بدبودار اور متعفن چیز کے ہیں لیکن اس عام لفظ کا استعمال پہلے ہی معنی میں ہوتا ہے۔ اگرچہ باقی دونوں معنی بھی لغت کے اعتبار سے درست ہیں۔

الغَاشِيَة: (۸۸/۱) مراد ہے قیامت، یعنی وہ آفت جو سارے جہان پر چھا جائے گی۔ اس مقام پر یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں بحیثیت مجموعی پورے عالم آخرت کا ذکر ہو رہا ہے جو نظام عالم کے درہم برہم ہونے سے شروع ہو کر تمام انسانوں کے دوبارہ اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت سے جزاو سزا پانے تک تمام مراحل پر حاوی ہے۔

فَاغْفِرْ لِيْ: (۲۸/۱۶) مغفرت کے معنی درگزر کرنے اور معاف کردینے کے بھی ہیں اور ستر پوشی کرنے کے بھی۔ حضرت موسیٰؑ کی دعا کا مطلب یہ تھا کہ میرے اس گناہ کو (جسے تو جانتا ہے کہ میں نے عمداً نہیں کیا ہے) معاف فرمادے اور اس کا پردہ بھی ڈھانک دے تاکہ دشمنوں کو اس کا پتہ نہ چلے۔

مَغْفِرَة: (۲۲/۵۰) ''مغفرت'' سے مراد ہے خطاؤں اور کمزوریوں اور لغزشوں سے چشم پوشی و درگزر۔

الغَافِلَات: (۲۴/۲۳) اصل میں لفظ غافلات استعمال ہوا ہے جس سے مراد ہیں وہ سیدھی سادھی شریف عورتیں جو چھل بٹے نہیں جانتیں، جن کے ذہن پاک ہیں، جنہیں کچھ خبر نہیں کہ بدچلنی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے، جن کے حاشیہ خیال میں بھی یہ اندیشہ نہیں گزرتا کہ کبھی کوئی ان پر بھی الزام لگا بیٹھے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا ان سات کبیرہ گناہوں میں سے ہے جو ''موبقات'' (تباہ کن) ہیں۔ اور طبرانی میں حضرت حذیفہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ قذف المحصنة یهدم عمل مئة سنة۔ ایک پاک دامن عورت پر تہمت لگانا سو برس کے اعمال کو غارت کردینے کے لئے کافی ہے۔

يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ: (۵/۶۴) عربی محاورے کے مطابق کسی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بخیل ہے، عطا اور بخشش سے اس کا ہاتھ رکا ہوا ہے، پس یہودیوں کے اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ بخیل ہے۔ چونکہ صدیوں سے یہودی قوم ذلت و نکبت کی حالت میں مبتلا تھی اور اس کی گذشتہ عظمت محض ایک افسانہ پارینہ بن کر رہ گئی تھی، جس کے پھر واپس آنے کا کوئی امکان انہیں نظر نہ آتا تھا، اس لیے بالعموم اپنے قومی مصائب پر ماتم کرتے ہوئے اس قوم کے نادان لوگ یہ بے ہودہ

فقرہ کہا کرتے تھے کہ معاذ اللہ خدا تو بخیل ہو گیا ہے، اس کے خزانے کا منہ بند ہے، ہمیں دینے کے لیے اب اس کے پاس آفات اور مصائب کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ یہ بات کچھ یہودیوں تک ہی محدود نہیں، دوسری قوموں کے جہلاء کا بھی یہی حال ہے کہ جب ان پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو خدا کی طرف رجوع کرنے کے بجائے وہ جل جل کر اس قسم کی گستاخانہ باتیں کیا کرتے ہیں۔

اَلْغَنِیُّ: (۱۵/۳۵) "غنی" سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے، ہر ایک سے مستغنی اور بے نیاز ہے، کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔

اَلْغَیْب: (۲/۳) "غیب" سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جو انسان کے حواس سے پوشیدہ ہیں اور کبھی براہ راست عام انسانوں کے تجربہ و مشاہدہ میں نہیں آتیں، مثلاً خدا کی ذات و صفات، ملائکہ، وحی، جنت، دوزخ وغیرہ۔

اَلْغَیْب: (۶۵/۲۷) غیب کے معنی مخفی، پوشیدہ اور مستور کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو معلوم نہ ہو، جس تک ذرائع معلومات کی رسائی نہ ہو۔

لَا یَغْتَبْ بَعْضُکُم بَعْضًا: (۴۹/۱۲) غیبت کی تعریف یہ ہے کہ "آدمی کسی شخص کے پیٹھ پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہے جو اگر اسے معلوم ہو تو اس کو ناگوار گزرے"۔ یہ تعریف خود رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت جسے مسلم، ابوداؤد، نسائی اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے۔ اس میں حضورؐ نے غیبت کی یہ تعریف بیان فرمائی ہے:

ذکرك اخاك بما یکرہ، قیل افرأیت ان کان فی اخی ما اقول؟ قال ان کان فیه ما تقول فقد اغتبته و ان لم یکن فیه ما تقول فقد بهته۔

غیبت یہ ہے کہ "تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرے جو اسے ناگوار ہو"۔ عرض کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ بات پائی جاتی ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو اس صورت میں آپ کا کیا خیال ہے؟ فرمایا اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہو تو تو نے اس کی غیبت کی، اور اگر اس میں وہ موجود نہ ہو تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔

ایک دوسری روایت جو امام مالک نے موطا میں حضرت مطلب نے عبداللہ سے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ان رجلا سال رسول اللہ ﷺ ما الغیبة؟ فقال ان تذکر من المرء ما یکرہ ان یسمع. قال یا رسول اللہ و ان کان حقا؟ قال اذا قلت باطلا فذلك البهتان "ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا غیبت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ کہ تو کسی شخص کا ذکر اس طرح کرے کہ وہ سنے تو اسے ناگوار ہو، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ اگرچہ میری بات حق ہو؟ آپ نے جواب دیا تیری بات باطل ہو تو یہی چیز پھر بہتان ہے"۔

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے خلاف اس کے پیچھے جھوٹا الزام لگانا بہتان ہے اور اس کے واقعی عیوب بیان کرنا غیبت۔

(ف)

الفَاتِحَة: ''فاتحہ''اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی مضمون یا کتاب کا کسی شے کا افتتاح ہو، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہ نام ''دیباچہ''اور آغاز کلام کا ہم معنی ہے۔

الفَتْح: (۱۱۰/۱) فتح سے مراد کسی ایک معرکے میں فتح نہیں بلکہ وہ فیصلہ کن فتح ہے جس کے بعد ملک میں کوئی طاقت اسلام سے ٹکر لینے کے قابل باقی نہ رہے اور یہ امر واضح ہو جائے کہ اب عرب میں اسی دین کو غالب ہو کر رہنا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد فتح مکہ لیا ہے۔ لیکن فتح مکہ ۸ھ میں ہوئی ہے اور اس سورہ کا نزول ۱۰ھ کے آخر میں ہوا ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت سراء بنت نبہان کی ان روایات سے معلوم ہوتا ہے جو ہم نے دیباچے میں نقل کی ہیں۔ علاوہ بریں حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول بھی اس تفسیر کے خلاف پڑتا ہے کہ یہ قرآن مجید کی سب سے آخری سورہ ہے کیوں کہ اگر فتح سے مراد فتح مکہ ہو تو پوری سورہ توبہ اسکے بعد نازل ہوئی تھی پھر یہ سورہ آخری سورہ کیسے ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ فتح مکہ اس لحاظ سے فیصلہ کن تھی کہ اس نے مشرکین عرب کی ہمتیں پست کر دی تھیں، مگر اس کے بعد بھی ان میں کافی دم خم باقی تھا۔ طائف اور حنین کے معرکے اس کے بعد ہی پیش آئے اور عرب پر اسلام کا غلبہ مکمل ہونے میں تقریباً دو سال صرف ہوئے۔

الفِتْنَة: (۱۹۱/۲) یہاں فتنے کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جس میں انگریزی کا لفظ (Persecution) استعمال ہوتا ہے، یعنی کسی گروہ یا شخص کو محض اس بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بنانا کہ اس نے رائج الوقت خیالات و نظریات کی جگہ کچھ دوسرے خیالات و نظریات کو حق پا کر قبول کر لیا ہے اور وہ تنقید و تبلیغ کے ذریعے سے سوسائٹی کے موجود الوقت نظام میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔

فِتْنَتَكُمْ: (۵۱/۱۴) فتنے کا لفظ یہاں دو معنی دے رہا ہے۔ ایک معنی یہ ہیں کہ اپنے اس عذاب کا مزہ چکھو۔ دوسرے معنی یہ کہ اپنے اس فتنے کا مزہ چکھو جو تم نے دنیا میں برپا کر رکھا تھا۔ عربی زبان میں اس لفظ کے ان دونوں مفہوموں کی یکساں گنجائش ہے۔

فِتْنَة: (۱۹۳/۲) یہاں فتنہ کا لفظ اوپر کے معنی سے ذرا مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے، سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر ''فتنے'' سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لیے ہو اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔

الفَجر: (۱۷/۷۸) فجر کے لغوی معنی ہیں ''پو پھٹنا'' یعنی وہ وقت جب اول اول سپیدہ صبح رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتا ہے۔

الفَجُو: (۱/۸۹) فجر پو پھٹنے کو کہتے ہیں یعنی وہ وقت جب رات کی تاریکی میں سے دن کی ابتدائی روشنی مشرق کی طرف ایک سفید دھاری کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

الفَحُشَآء: (۱۶/۹۰) پہلی چیز فحشاء ہے جس کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، فحش ہے مثلاً بخل، زنا، برہنگی و عریانی، عمل قوم لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے، مثلاً جھوٹا پروپگنڈا، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور علم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا، اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور نازوادا کی نمائش کرنا وغیرہ۔

فَخُور: (۱۸/۳۱) فخور اس کو کہتے ہیں جو اپنی بڑائی کا دوسروں پر اظہار کرے۔ آدمی کی چال میں اکڑ اور اتراہٹ اور تبختر کی شان لازماً اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے دماغ میں تکبر کی ہوا بھر جاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو اپنی بڑائی محسوس کرائے۔

الفِردَوس: (۱۱/۲۳) فردوس، جنت کے لیے معروف ترین لفظ ہے جو قریب قریب تمام انسانی زبانوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے، سنسکرت میں پردیشا، قدیم کلدانی زبان میں پردیسا، قدیم ایرانی (ژند) میں پیر دائزا، عبرانی میں پردیس، ارمنی میں پردیز، سریانی میں فردیسو، یونانی میں پاراداٸسوس، لاطینی میں پاراڈائس، اور عربی میں فردوس۔ یہ لفظ ان سب زبانوں میں ایک ایسے باغ کے لئے بولا جاتا ہے جس کے گرد حصار کھنچا ہوا ہو، وسیع ہو، آدمی کی قیام گاہ سے متصل ہو اور اس میں ہر قسم کے پھل خصوصاً انگور پائے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض زبانوں میں تو منتخب پالتو پرندوں اور جانوروں کا بھی پایا جانا اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ قرآن سے پہلے عرب کے کلام جاہلیت میں بھی لفظ فردوس مستعمل تھا اور قرآن میں اس کا اطلاق متعدد باغوں کے مجموعے پر کیا گیا ہے، جیسا کہ سورہ کہف میں ارشاد ہوا ﴿كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾، (ان کی میزبانی کے لئے فردوس کے باغ ہیں۔) اس سے جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ فردوس ایک بڑی جگہ ہے جس میں بکثرت باغ اور چمن اور گلشن پائے جاتے ہیں۔

فَرْشًا: (۶/۱۴۲) اصل میں لفظ فرش استعمال ہوا ہے، جانوروں کو فرش کہنا یا تو اس رعایت سے ہے کہ وہ چھوٹے قد کے ہیں اور زمین سے لگے ہوئے چلتے ہیں، یا اس روایت سے کہ وہ ذبح کے لیے زمین پر لٹائے جاتے ہیں، یا اس رعایت سے کہ ان کی کھالوں اور ان کے بالوں سے فرش بنائے جاتے ہیں۔

فِرعَون: (۷ر۱۰۴) لفظ فرعون کے معنی ہیں ''سورج دیوتا کی اولاد''۔ قدیم اہل مصر سورج کو جوان کا مہادیو یا رب اعلیٰ تھا، رع کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا، اہل مصر کے اعتقاد کی رو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ رع کا جسمانی مظہر اور اس کا ارضی نمائندہ ہو، اسی لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں بر سر اقتدار آتا تھا، اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا، اور ہر فرماں روا جو تخت نشین ہوتا۔ ''فرعون'' کا لقب اختیار کر کے باشندگان ملک کو یقین دلاتا کہ تمہارا رب اعلیٰ یا مہادیو میں ہوں۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے قصے کے سلسلہ میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک وہ جس کے زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی، دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے اور جو بالآخر غرق ہوا۔ موجودہ زمانے کے محققین کا عام میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون رعمیسس دوم تھا جس کا زمانہ حکومت ۱۲۹۲ سے ۱۲۲۵ قبل مسیح تک رہا۔ اور دوسرا فرعون جس کا یہاں ان آیات میں ذکر ہو رہا ہے، منفتہ یا منفتاح تھا جو اپنے باپ رعمیسس دوم کی زندگی ہی میں شریک حکومت ہو چکا تھا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا مالک ہوا۔ یہ قیاس بظاہر اس لحاظ سے مشتبہ معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ کی تاریخ وفات ۱۲۷۲ قبل مسیح ہے۔ لیکن بہر حال یہ تاریخی قیاسات ہی ہیں، اسرائیلی اور عیسوی جنتریوں کے تطابق سے بالکل صحیح تاریخوں کا حساب لگانا مشکل ہے۔

الفُرقَان: (۲۵ر۱) یعنی قرآن مجید۔ فرقان مصدر ہے مادہ ف ر ق ہے جس کے معنی ہیں دو چیزوں کو الگ الگ کرنا یا ایک ہی چیز کے اجزاء کا الگ الگ ہونا۔ قرآن مجید کے لیے اس لفظ کا استعمال یا تو فارق کے معنی میں ہوا ہے یا مفروق کے معنی میں، یا پھر اس سے مقصود مبالغہ ہے، یعنی فرق کرنے کے معاملے میں اس کا کمال اتنا بڑھا ہوا ہے کہ گویا وہ خود ہی فرق ہے۔ اگر اسے پہلے اور تیسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا صحیح ترجمہ کسوٹی، اور فیصلہ کن چیز، اور معیار فیصلہ کے ہوں گے اور اگر دوسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب الگ الگ اجزاء پر مشتمل اور الگ الگ اوقات میں آنے والے اجزاء پر مشتمل چیز کے ہوں گے۔ قرآن مجید کو ان دونوں ہی اعتبارات سے ''الفرقان'' کہا گیا ہے۔

اِستَفزِز: (۱۷ر۶۴) اصل میں لفظ ''استفزاز'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی استخفاف کے ہیں۔ یعنی کسی کو ہلکا اور کمزور پا کر اسے بہالے جانا، یا اس کے قدم پھسلا دینا۔

فَسَادًا: (۲۸ر۸۳) فساد سے مراد انسانی زندگی کے نظام کا وہ بگاڑ ہے جو حق سے تجاوز کرنے کے نتیجے میں لازماً رونما ہوتا ہے۔ خدا کی بندگی اور اس کے قوانین کی اطاعت سے نکل کر آدمی جو کچھ بھی کرتا ہے وہ سراسر فساد ہی فساد ہے۔ اسی کا ایک جزو وہ فساد بھی ہے جو حرام

طریقوں سے دولت سمیٹنے اور حرام راستوں میں خرچ کرنے سے برپا ہوتا ہے۔

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ: (۷/۵۶) "زمین میں فساد برپا نہ کرو" یعنی زمین کے انتظام کو خراب نہ کرو، انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اس حقیقت پر بھی متنبہ کرتا ہے کہ زمین کے انتظام میں اصل چیز فساد نہیں ہے جس پر صلاح عارض ہوئی ہو بلکہ اصل چیز صلاح ہے جس پر فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی سے عارض ہوتا رہا ہے، بالفاظ دیگر یہاں انسان کی زندگی کی ابتدا جہالت و وحشت اور شرک وبغاوت اور اخلاقی بدنظمی سے نہیں ہوئی ہے جس کو دور کرنے کے لیے بعد میں بتدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی الحقیقت انسانی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے اور بعد میں اس درست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں، اسی فساد کو مٹانے اور نظام حیات کو از سر نو درست کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے اور انہوں نے ہر زمانے میں انسان کو یہ دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس صلاح پر قائم کیا گیا تھا اس میں فساد برپا کرنے سے باز آجاؤ۔

اس معاملہ میں قرآن کا نقطۂ نظر ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے جنہوں نے ارتقاء کا ایک غلط تصور لے کر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بنی اور بنتی جا رہی ہے، اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر بسایا تھا اور ایک صالح نظام سے اس کی زندگی کی ابتدا کی تھی، پھر انسان خود شیطانی رہنمائی قبول کر کے بار بار تاریکی میں جاتا رہا اور اس صالح نظام کو بگاڑتا رہا اور خدا بار بار اپنے پیغمبر کو اس غرض کے لئے بھیجتا رہا کہ اسے تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دیں۔

اَلْفَاسِقِیْن: (۲/۲۶) نافرمان، اطاعت کی حد سے نکل جانے والا۔

فَاسِق: خدا اور بندے کے تعلق اور انسان اور انسان کے تعلق کو کاٹنے یا بگاڑنے کا لازمی نتیجہ فساد ہے اور جو اس فساد کو برپا کرتا ہے وہی فاسق ہے۔

فَضَّلَ: (۴/۳۴) یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے جیسا کہ ایک عام اردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لے گا، بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنی میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں، اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوام ہونے کی

اہلیت رکھتا ہے اور عورت فطرۃً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت و خبر گیری کے تحت رہنا چاہیے۔

فُطُور: (۶۷/۳) اصل میں لفظ فطور استعمال ہوا ہے جس کے معنی دراڑ، شگاف، رخنہ، پھٹا ہوا ہونا، ٹوٹا پھوٹا ہونا، مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات کی بندش ایسی چست ہے اور زمین کے ایک ذرے سے لے کر عظیم الشان کہکشانوں تک ہر چیز ایسی مربوط ہے کہ کہیں نظم کائنات کا تسلسل نہیں ٹوٹتا، تم خواہ کتنی ہی جستجو کرلو، تمہیں اس میں کسی جگہ کوئی رخنہ نہیں مل سکتا۔

الفُقَرَآء: (۹/۶۰) فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی معیشت کے لیے دوسرے کی مدد کا محتاج ہو، یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لئے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاج اعانت ہو گئے ہوں، یا کسی عارضی سبب سے سر دست مدد کے محتاج ہوں اور اگر انہیں سہارا مل جائے تو آگے چل کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہوں۔ مثلاً یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بے روزگار لوگ اور وہ لوگ جو وقتی حوادث کے شکار ہو گئے ہوں۔

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّين: (۹/۱۲۲) تفقہ فی الدین کے معنی ہیں دین کو سمجھنا، اس کے نظام میں بصیرت حاصل کرنا، اس کے مزاج اور اس کی روح سے آشنا ہونا اور اس قابل ہو جانا کہ فکر و عمل کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان یہ جان سکے کہ کونسا طریق فکر اور کونسا طرز عمل روح دین کے مطابق ہے لیکن آگے چل کر جو قانونی علم اصطلاحاً فقہ کے نام سے موسوم ہوا اور جو رفتہ رفتہ اسلامی زندگی کی محض صورت (بمقابلہ روح) کا تفصیلی علم بن کر رہ گیا، لوگوں نے اشتراک لفظی کی بنا پر سمجھ لیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جس کا حاصل کرنا حکم الٰہی کے مطابق تعلیم کا منتہائے مقصود ہے، حالانکہ وہ کل مقصود نہیں بلکہ محض ایک جزو مقصود تھا، اس عظیم الشان غلط فہمی سے جو نقصانات دین اور پیروان دین کو پہنچے ان کا جائزہ لینے کے لیے تو ایک کتاب کی وسعت درکار ہے، مگر یہاں ہم اس پر متنبہ کرنے کے لیے مختصراً اتنا اشارہ کیے دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو جس چیز نے روح دین سے خالی کر کے محض جسم دین اور شکل دین کی تشریح پر مرتکز کر دیا۔ اور بالآخر جس چیز کی بدولت مسلمانوں کی زندگی میں ایک نری بے جان ظاہر داری، دین داری کی آخری منزل بن کر رہ گئی وہ بڑی حد تک یہی غلط فہمی ہے۔

فَوَاكِهُ: (۳۷/۴۲) اسی بنا پر جنت کے ان کھانوں کے لیے "فواکہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں تغذیہ کے بجائے تلذذ کا پہلو نمایاں ہے۔

اَفْلَحَ: (۲۳/۱) فلاح کے معنی ہیں کامیابی و خوشحالی۔ یہ لفظ خسران کی ضد ہے جو ٹوٹے اور گھاٹے اور نامرادی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ افلح الرجل کے معنی ہیں فلاں شخص کامیاب ہوا۔ اپنی مراد کو پہنچا، آسودہ و خوشحال ہو گیا: اس کی کوشش بارآور ہوئی۔ اس کی حالت اچھی ہو گئی۔

یُفلِحُ: (۱۰/۱۷) بعض نادان لوگ ''فلاح'' کو طویل عمر، یا دنیوی خوشحالی یا دنیوی فروغ کے معنی میں لے لیتے ہیں اور پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کر کے جیتا رہے یا دنیا میں پھلے پھولے یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو، اسے نبی برحق مان لینا چاہیے کیونکہ اس نے فلاح پائی، اگر وہ نبی برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعویٰ کرتے ہی مار ڈالا جاتا، یا بھوکوں مار دیا جاتا اور دنیا میں اس کی بات چلنے ہی نہ پاتی لیکن یہ احمقانہ استدلال صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاح ''فلاح'' کا مفہوم جانتا ہو نہ اس قانون امہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لیے مقرر فرمایا ہے اور نہ یہی سمجھتا ہو کہ اس سلسلہ بیان میں یہ فقرہ کس معنی میں آیا ہے۔

اول تو یہ بات کہ ''مجرم فلاح نہیں پا سکتے'' اس سیاق میں اس حیثیت سے فرمائی ہی نہیں گئی ہے کہ یہ کسی کے دعوائے نبوت کو پرکھنے کا معیار ہے جس سے عام لوگ جانچ کر خود فیصلہ کرلیں کہ جو مدعیٔ نبوت ''فلاح'' پا رہا ہو اس کے دعوے کو مانیں اور جو فلاح نہ پا رہا ہو اس کا انکار کر دیں۔ بلکہ یہاں تو یہ بات اس معنی میں کہی گئی ہے کہ میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی، اس لئے میں خود تو یہ جرم نہیں کر سکتا کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کروں البتہ تمہارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم سچے نبی کو جھٹلانے کا جرم کر رہے ہو اس لئے تمہیں فلاح نصیب نہیں ہو گی۔

پھر فلاح کا لفظ بھی قرآن میں دنیوی فلاح کے محدود معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ اس سے مراد وہ پائیدار کامیابی ہے جو کسی خسران پر منتج ہونے والی نہ ہو، قطع نظر اس سے کہ دنیوی زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں اس کے اندر کامیابی کا کوئی پہلو ہو یا نہ ہو، ہو سکتا ہے کہ ایک داعی ضلالت دنیا میں مزے سے جیے، خوب پھولے پھلے اور اس کی گمراہی کو بڑا فروغ نصیب ہو مگر یہ قرآن کی اصطلاح میں فلاح نہیں عین خسران ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک داعی حق دنیا میں سخت مصیبتوں سے دوچار ہو، شدت آلام سے نڈھال ہو کر یا ظالموں کی دست درازیوں کا شکار ہو کر دنیا سے جلدی رخصت ہو جائے اور کوئی اسے مان کر نہ دے۔ مگر یہ قرآن کی زبان میں خسران نہیں عین فلاح ہے۔

فَالِقُ: (۶/۹۵) یعنی زمین کی تہوں میں بیج کو پھاڑ کر اس سے درخت نکالنے والا۔

فَلَک: (۲۱/۳۳) فلک، جو فارسی کے چرخ اور گردوں کا ٹھیک ہم معنی ہے، عربی زبان میں آسمان کے معروف ناموں میں سے ہے۔ ''سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں'' سے دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سب تارے ایک ہی فلک میں نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کا فلک الگ ہے۔ دوسرے یہ کہ فلک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں یہ تارے کھونٹیوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں اور وہ خود انہیں لیے ہوئے گھوم رہا ہو، بلکہ وہ کوئی سیال شے ہے یا فضا اور خلا

کی سی نوعیت کی چیز ہے جس میں ان تاروں کی حرکت تیرنے کے فعل سے مشابہت رکھتی ہے۔
(مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، یٰسین، حاشیہ ۳۷)۔

فَلَکِ: (۳۶/۴۰) فلک کا لفظ عربی زبان میں سیاروں کے مدار (Orbit) کے لیے استعمال ہوا ہے۔

تَفٰوُت: (۶۷/۳) اصل میں تفاوت کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں عدم تناسب۔ ایک چیز کا دوسری چیز سے میل نہ کھانا۔ انمل بے جوڑ ہونا، پس اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات میں تم کہیں بد نظمی، بے ترتیبی اور بے ربطی نہ پاؤگے۔ اللہ کی پیدا کردہ اس دنیا میں کوئی چیز انمل بے جوڑ نہیں ہے۔ اس کے تمام اجزاء باہم مربوط ہیں اور ان میں کمال درجے کا تناسب پایا جاتا ہے۔

فُوم: سیر مثل ثوم، ونخود، وگندم (صُراح)۔ سیر و گندم و نخود و ہر دانہ کہ ازاں نان پزند و ہر گرہ سیر و پیاز (منتہی الارب) سیر کے معنی فارسی زبان میں لہسن کے ہیں۔

(رسائل ومسائل حصہ پنجم ص ۹۵)

(ق)

قَاب قَوسَین: (۹/۵۳)عام طور پر مفسرین نے قاب قوسین کے معنی "بقدر دو قوس" ہی بیان کیے ہیں،۔ لیکن حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے قوس کو زراع (ہاتھ) کے معنی میں لیا ہے اور کان قاب قوسین کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ دونوں کے درمیان صرف دو ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

قِیْلِه: (۸۸/۴۳) یہ ایک پیچیدہ بحث ہے جس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پورا سلسلۂ کلام نگاہ میں رہے۔ آیت ۸۵ تا ۸۹ تک کی عبارت یہ ہے:

﴿وَتَبٰرَکَ الَّذِی لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ. وَلَا یَمْلِکُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ. وَلَئِنْ سَاَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ. وَقِیْلِهٖ یٰا رَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ. فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ.﴾

تفہیم القرآن میں ان آیات کی ترجمانی اس طرح کی گئی ہے: "بہت بالا و برتر ہے وہ جس کے قبضے میں زمین اور آسمانوں اور ہر اس چیز کی بادشاہی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اور وہی قیامت کی گھڑی کا علم رکھتا ہے، اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔ اس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ کسی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، الا یہ کہ کوئی علم کی بنا پر حق کی شہادت دے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر کہاں سے یہ دھوکا کھا رہے ہیں، قسم ہے رسول کے اس قول کی کہ اے رب یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے۔ اچھا، اے نبیؐ، ان سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ سلام ہے تمہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔"

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا ترجمہ یہ ہے: "وبسیار با برکت است آنکہ اور ابادشاہی آمانہاوزمین

المَقْبُوحِین: (۴۲/۲۸) اصل الفاظ ہیں قیامت کے روز وہ "مقبوحین" میں سے ہوں گے۔ اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ وہ مردود و مطرود ہوں گے۔ اللہ کی رحمت سے بالکل محروم کر دیے جائیں گے۔ ان کی بری گت بنائی جائے گی اور ان کے چہرے بگاڑ دیے جائیں گے۔

قَتْلَ اَوْلَادِهِم: (۱۳۷/۶) قتل اولاد کی تین صورتیں اہل عرب میں رائج تھیں اور قرآن میں تینوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

(۱) لڑکیوں کا قتل، اس خیال سے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے، یا قبائلی لڑائیوں میں وہ دشمن

کے ہاتھ نہ پڑیں یا کسی دوسرے سبب سے وہ ان کے لیے سبب عار نہ بنیں۔

(۲) بچوں کا قتل، اس خیال سے کہ ان کی پرورش کا بار نہ اٹھایا جاسکے گا اور ذرائع معاش کی کمی کے سبب سے وہ ناقابل برداشت بوجھ بن جائیں گے۔

(۳) بچوں کو اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لیے بھینٹ چڑھانا۔

اِقْتَحَمَ: (۱۱/۹۰) اصل الفاظ ہیں فلا اقتحم العقبة ۔اقتحام کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی سخت اور مشقت طلب کام میں ڈالنا اور عقبہ کو اس دشوار گذار راستے کو کہتے ہیں جو بلندی پر جانے کے لیے پہاڑوں میں سے گزرتا ہے پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو راستے جو ہم نے اسے دکھائے ان میں سے ایک بلندی کی طرف جاتا ہے مگر مشقت طلب اور دشوار گزار ہے۔اس میں آدمی کو اپنے نفس اور اسکی خواہشوں سے اور شیطان کی ترغیبات سے لڑ کر چلنا پڑتا ہے۔اور دوسرا آسان راستہ ہے جو کھڈوں میں اترتا ہے مگر اس سے پستی کی طرف جانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ بس اپنے نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دینا کافی ہے، پھر آدمی خود نشیب کی طرف لڑھکتا چلا جاتا ہے۔اب یہ آدمی جس کو ہم نے دونوں راستے دکھادیے تھے، اس نے ان میں سے پستی کی جانب جانے والے راستے کو اختیار کرلیا اور اس مشقت طلب راستے کو چھوڑ دیا جو بلندی کی طرف جانے والا ہے۔

قِثَّاء: (۶۱/۲) خیار (صراح)۔ خیار ترہ کہ از خیار دراز باشد (یعنی ککڑی) وخیار (یعنی کھیرا) (منتہی الارب)۔اس کا ترجمہ واقعی مجھ سے چھوٹ گیا ہے آئندہ اس کا اضافہ کردوں گا۔

(رسائل ومسائل حصہ پنجم ص۹۵)

قَدْحًا: (۲/۱۰۰) اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی بستی پر انہیں چھاپہ مارنا ہوتا تو رات کے اندھیرے میں چل کر جاتے تاکہ دشمن خبردار نہ ہوسکے، اور صبح سویرے اچانک اس پر ٹوٹ پڑتے تھے تاکہ صبح کی روشنی میں ہر چیز نظر آسکے، اور دن اتنا زیادہ روشن بھی نہ ہو کہ دشمن دور سے ان کو آتا دیکھ لے اور مقابلہ کے لئے تیار ہوجائے۔

القَدْر: (۹۷/۱) قدر کے معنی بعض مفسرین نے تقدیر کے لئے ہیں، یعنی یہ وہ رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لئے فرشتوں کے سپرد کردیتا ہے۔اس کی تائید سورہ دخان کی یہ آیت کرتی ہے۔﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾ ''اس رات میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ صادر کیا جاتا ہے'' (آیت ۵)۔ بخلاف اس کے امام زہری کہتے ہیں کہ قدر کے معنی عظمت وشرف کے ہیں، یعنی وہ بڑی عظمت والی رات ہے۔اس معنی کی تائید اسی سورہ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ ''شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے''۔

القُدُّوسُ: (۲۳/۵۹) اصل میں لفظ قدوس استعمال ہوا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے۔اس کا مادہ قدس ہے۔قدس کے معنی ہیں تمام بری صفات سے پاکیزہ اور منزہ ہونا اور قدوس کا مطلب یہ

ہے کہ وہ اس سے بدرجہا بالا و برتر ہے کہ اس کی ذات میں کوئی عیب، یا نقص، یا کوئی قبیح صفت پائی جائے۔ بلکہ وہ ایک پاکیزہ ترین ہستی ہے جس کے بارے میں کسی برائی کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ قدوسیت درحقیقت حاکمیت کے اولین لوازم میں سے ہے۔ انسان کی عقل اور فطرت یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ حاکمیت کی حامل کوئی ایسی ہستی ہو جو شریر اور بدخلق اور بدنیت ہو۔ جس میں قبیح صفات پائی جاتی ہوں۔ جس کے اقتدار سے اس کے محکوموں کو بھلائی نصیب ہونے کے بجائے برائی کا خطرہ لاحق ہو۔ اسی بنا پر انسان جہاں بھی حاکمیت کو مرکز قرار دے دیتا ہے وہاں قدوسیت نہیں بھی ہوتی تو اسے موجود فرض کرلیتا ہے، کیونکہ قدوسیت کے بغیر اقتدارِ مطلق ناقابلِ تصور ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا درحقیقت کوئی مقتدر اعلیٰ بھی قدوس نہیں ہے اور نہیں ہوسکتا۔ شخصی بادشاہی ہو یا جمہور کی حاکمیت، یا اشتراکی نظام کی فرمانرائی، یا انسانی حکومیت کی کوئی دوسری صورت، بہرحال اس کے حق میں قدوسیت کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔

بَیْتُ الْمَقْدِس: (۲/۱۴۴) بیت المقدس مدینے سے عین شمال میں ہے اور کعبہ بالکل جنوب میں۔

قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ: (۵/۸۲) اصل الفاظ ہیں ما قدمت و اخرت۔ ان الفاظ کے کئی مفہوم ہوسکتے ہیں اور وہ سب ہی یہاں مراد ہیں:

(۱) جو اچھا یا برا عمل آدمی نے کرکے آگے بھیج دیا وہ ماقدمت ہے اور جس کے کرنے سے وہ باز رہا وہ مااخرت۔ اس لحاظ سے یہ الفاظ تقریباً انگریزی زبان کے الفاظ Commission اور Omission کے ہم معنی ہیں۔

(۲) جو کچھ پہلے کیا وہ ماقدمت ہے اور جو کچھ بعد میں کیا وہ مااخرت، یعنی آدمی کا پورا نامہ اعمال ترتیب وار اور تاریخ وار اس کے سامنے آجائے گا۔

(۳) جو اچھے اور برے اعمال آدمی نے اپنی زندگی میں کیے وہ ماقدمت ہیں اور ان اعمال کے جو آثار و نتائج وہ انسانی معاشرے میں اپنے پیچھے چھوڑ گیا وہ مااخرت۔

یَقْذِفُ بِالْحَقِّ: (۴۸/۳۴) اصل الفاظ ہیں یقذف بالحق۔ اسکے ایک معنی یہ ہیں کہ یہ وحی کے ذریعہ سے وہ علم حق میرے اوپر القا کرتا ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ حق کو غالب کررہا ہے، باطل کے سر پر حق کی ضرب لگا رہا ہے۔

قرآنا: (۲/۱۲) قرآن مصدر ہے قرا یقرا سے، اس کے اصل معنی ہیں "پڑھنا" مصدر کو کسی چیز کے لیے جب نام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس شے کے اندر معنی مصدری بدرجہ کمال پایا جاتا ہے، مثلاً جب کسی شخص کو ہم بہادر کہنے کے بجائے "بہادری" کہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے اندر شجاعت ایسی کمال درجہ کی پائی جاتی ہے

کہ گویا وہ اور شجاعت ایک چیز ہیں۔ پس اس کتاب کا نام "قرآن" رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عام و خاص سب کے پڑھنے کے لیے ہے اور بکثرت پڑھی جانے والی چیز ہے۔

القُربیٰ: (۴۲، ۲۳) اصل الفاظ ہیں ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی﴾ یعنی میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا مگر قربیٰ کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔ اس لفظ "قربیٰ" کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے۔

ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنی میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی اہل قریش) کم از کم اس رشتہ داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تل گئے ہو"۔ یہ حضرت عبد اللہ بن عباس کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے حوالہ سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور ابن سعد وغیرھم نے نقل کیا ہے۔ اور یہی تفسیر مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سدی، ابو مالک، عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم، ضحاک، عطاء بن دینار اور دوسرے اکابر مفسرین نے بھی بیان کی ہے۔

دوسرا گروہ "قربیٰ" کو قرب اور تقرب کے معنی میں لیتا ہے اور آیت کا سبب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر اللہ کے قرب کی چاہت پیدا ہو جائے یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ بس یہی میرا اجر ہے۔ یہ تفسیر حضرت حسن بصری سے منقول ہے اور ایک قول قتادہ سے بھی اس کی تائید میں نقل ہوا ہے بلکہ طبرانی کی ایک روایت میں ابن عباس کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہی مضمون ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا. (الفرقان۔۵۷) "ان سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے"۔

تیسرا گروہ "قربیٰ" کو اقارب (رشتہ داروں) کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبت کرو"۔ پھر اس گروہ کے بعض اقارب سے تمام بنی عبد المطلب مراد لیتے ہیں، اور بعض اسے صرف حضرت علی و فاطمہ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر سعید بن جبیر اور عمرو بن شعیب سے منقول ہے اور بعض روایات میں یہی تفسیر ابن عباس اور حضرت علی بن حسین (زین العابدین) کی طرف منسوب کی گئی ہے لیکن متعدد وجوہ سے یہ تفسیر کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اول تو جس وقت مکہ معظمہ میں سورہ شوریٰ نازل ہوئی ہے اس وقت حضرت علی و فاطمہ کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اولاد کا کیا سوال۔ اور بنی عبد المطلب میں سب کے سب

نبی ﷺ کا ساتھ نہیں دے رہے تھے بلکہ ان میں سے بعض کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھی تھے، اور ابو لہب کی عداوت کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسرے نبی ﷺ کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمطلب ہی نہ تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ آپ کے والد ماجد اور آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ کے واسطے سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپ کی رشتہ داریاں تھیں۔ اور ان سب گھرانوں میں آپ کے بہترین صحابی تھے اور بدترین دشمن بھی۔ آخر حضور کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ سب اقربا میں سے آپ صرف بنی عبدالمطلب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس مطالبہ محبت کو انہی کے لئے مخصوص رکھتے۔ تیسری بات جو ان سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے، اس مقام سے اس کار عظیم پر یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحب ذوق سلیم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہو گی اور نبی نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہو گی۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصے آئے ہیں ان میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی اٹھ کر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے (یونس ۷۲۔ ہود ۲۹۔ ۵۱۔ الشعراء ۱۰۹۔ ۱۲۷۔ ۱۴۵۔ ۱۶۴۔ ۱۸۰۔) سورہ یٰسین میں نبی کی صداقت جانچنے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے (آیت ۲۱) خود نبی ﷺ کی زبان سے قرآن پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں (الانعام ۹۰۔ یوسف ۱۰۴۔ المومنون ۷۲۔ الفرقان ۵۷، سبا ۴۷، ص ۸۶۔ الطور ۴۰۔ القلم ۴۶)۔ اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع رہ جاتا ہے کہ میں ان کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں اس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ پھر یہاں بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تقریر کے مخاطب اہل ایمان نہیں بلکہ کفار ہیں۔ اوپر سے ساری تقریر انہی سے خطاب کرتے ہوئے ہوتی چلی آ رہی ہے اور آگے بھی روئے سخن انہی کی طرف ہے۔ اس سلسلہ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا آخر سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اجر تو ان لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اس کام کی کوئی قدر ہو جو کسی شخص نے ان کے لئے انجام دیا ہو۔ کفار حضورؐ کے اس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپ ان سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمہاری انجام دی ہے اس پر تم میرے تمام رشتہ داروں سے محبت کرنا۔ وہ تو الٹا اسے جرم سمجھ رہے تھے اور اس کی بنا پر آپ کی جان کے درپے تھے۔

قَرْنَ: (۳۳/۳۳) اصل میں لفظ قرن استعمال ہوا ہے بعض اہل لغت نے اس کو قرار سے ماخوذ بتایا ہے اور بعض نے ''وقار'' سے اگر اس کو قرار سے لیا جائے تو معنی ہوں گے ''قرار پکڑو''، ''ٹک جاؤ''۔ اور اگر وقار سے لیا جائے تو مطلب ہو گا ''سکون سے رہو''، ''چین سے بیٹھو''

دونوں صورتوں میں آیت کا منشا یہ ہے کہ عورت کا اصل دائرہ عمل اس کا گھر ہے، اس کو اسی دائرے میں رہ کر اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں اور گھر سے باہر صرف بضرورت ہی نکلنا چاہیے۔

قَرۡضًا حَسَنًا: (۲/۲۴۵) ''قرض حسن'' کا لفظی ترجمہ ''اچھا قرض'' ہے اور اس سے مراد ایسا قرض ہے جو خالص نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے، اس طرح جو مال راہ خدا میں خرچ کیا جائے اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا، البتہ شرط یہ ہے کہ وہ قرض حسن یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے بلکہ محض اللہ کی خاطر ان کاموں میں صرف کیا جائے، جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

القَارِعَة: (۶۹/۴) اصل لفظ القارعة ہے۔ قرع عربی زبان میں ٹھوکنے، کوٹنے، کھڑ کھڑا دینے، اور ایک چیز کو دوسری چیز پر مار دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قیامت کے لئے یہ دوسرا لفظ اس کی ہولناکی کا تصور دلانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

القَارِعَةُ: (۱۰۱/۱) اصل میں قارعة استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے ''ٹھونکنے والی''۔ قرع کے معنی کسی چیز کو کسی چیز پر زور سے مارنے کے ہیں جس سے سخت آواز نکلے۔ اس لغوی معنی کی مناسبت سے قارعہ کا لفظ ہولناک حادثے اور بڑی بھاری آفت کے لئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں قرعتهم القارعة ۔ یعنی فلاں قبیلے یا قوم کے لوگوں پر سخت آفت آ گئی ہے۔ قرآن مجید میں بھی ایک جگہ یہ لفظ کسی قوم پر بڑی مصیبت نازل ہونے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سورہ رعد میں ہے ﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ﴾ ۔ ''جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی رہتی ہے' (آیت ۳۱) لیکن یہاں القارعة کا لفظ قیامت کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور سورہ الحاقہ میں بھی قیامت کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے (آیت ۴) اس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں قیامت کے پہلے مرحلے سے لے کر عذاب وثواب کے آخری مرحلے تک پورے عالم آخرت کا یکجا ذکر ہو رہا ہے۔

القُرُوۡن: (۱۰/۱۳) اصل میں لفظ قرون استعمال ہوا ہے جس سے مراد عام طور پر تو عربی زبان میں ایک ''عہد کے لوگ'' ہوتے ہیں لیکن قرآن مجید میں جس انداز سے مختلف مواقع پر اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''قرن'' سے مراد وہ قوم ہے جو اپنے دور میں برسر عروج اور کلی یا جزئی طور پر امامت عالم پر سرفراز رہی ہو، ایسی قوم کی ہلاکت لازماً یہ معنی نہیں رکھتی کہ اس کی نسل کو بالکل غارت ہی کر دیا جائے۔ بلکہ اس کا مقام عروج وامامت سے گرا دیا جانا، اس کی تہذیب وتمدن کا تباہ ہو جانا، اس کے تشخص کا مٹ جانا اور اس کے اجزاء کا پارہ پارہ ہو کر دوسری قوموں میں گم ہو جانا، یہ بھی ہلاکت ہی کی ایک صورت ہے۔

قَارُون: (۷۶/۲۸) قارون، جس کا نام بائبل اور تلمود میں قورح (Korah) بیان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا۔ بائبل کی کتاب خروج (باب ٦۔ آیت ۱۸۔۲۱) میں جو نسب نامہ درج ہے اس کی رو سے حضرت موسیٰ اور قارون کے والد باہم سگے بھائی تھے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ شخص بنی اسرائیل میں سے ہونے کے باوجود فرعون کے ساتھ جاملا تھا اور اس کا مقرب بن کر اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں فرعون کے بعد مخالفت کے جو دو سب سے بڑے سرغنے تھے ان میں سے ایک ہی قارون تھا۔

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِیْنٍ. اِلٰی فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ﴾۔ (المؤمن، آیت ۲۳، ۲۴)

"ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل کے ساتھ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف بھیجا، مگر انہوں نے کہا کہ یہ ایک جادو گر ہے سخت جھوٹا"۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قارون اپنی قوم سے باغی ہو کر اس دشمن طاقت کا پٹھو بن گیا تھا جو بنی اسرائیل کو جڑ بنیاد سے ختم کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔ اور اس قومی غداری کی بدولت اس نے فرعونی سلطنت میں یہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا کہ حضرت موسیٰ فرعون کے علاوہ مصر کی جن دو بڑی ہستیوں کی طرف بھیجے گئے تھے وہ دو ہی تھیں، ایک فرعون کا وزیر ہامان، اور دوسرا یہ اسرائیلی سیٹھ۔ باقی سب اعیان سلطنت اور درباری ان سے کم تر درجے میں تھے جن کا خاص طور پر نام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ قارون کی یہی پوزیشن سورہ عنکبوت کی آیت ۳۹ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

القَرْيَة: (۱۶۳/۷) محققین کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام ایلہ یا ایلات یا ایلوت تھا جہاں اب اسرائیل کی یہودی ریاست نے اسی نام کی ایک بندر گاہ بنائی ہے اور جس کے قریب ہی اردن کی مشہور بندر گاہ واقع ہے۔ اس کی جائے وقوع بحر قلزم کی اس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ عروج میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا۔ حضرت سلیمان نے اپنے بحر قلزم کے جنگی و تجارتی بیڑے کا صدر مقام اسی شہر کو بنایا تھا۔

جس واقعہ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اس کے متعلق یہودیوں کی کتب مقدسہ میں کوئی ذکر ہمیں نہیں ملتا اور ان کی تاریخیں بھی اس باب میں خاموش ہیں، مگر قرآن مجید میں جس انداز سے اس وقعہ کو یہاں اور سورہ بقرہ میں بیان کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے دور میں بنی اسرائیل بالعموم اس واقعہ سے خوب واقف تھے اور یہ حقیقت ہے کہ مدینہ کے یہودیوں نے، جو نبی ﷺ کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، قرآن کے اس بیان پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا۔

القُرَى الَّتِي بٰرَكْنَا فِيهَا: (۱۸/۳۴) "برکت والی بستیوں" سے مراد شام و فلسطین کا

علاقہ ہے جسے قرآن مجید میں عموماً اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الاعراف، آیت ۱۳۷، بنی اسرائیل، آیت ۱، الانبیاء آیات ۷۱ و ۸۱)

قریٰ ظاہرۃ: ''نمایاں بستیوں'' سے مراد ہیں ایسی بستیاں جو شاہراہ عام پر واقع ہوں، گوشوں میں چھپی ہوئی نہ ہوں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بستیاں بہت زیادہ فاصلے پر نہ تھیں بلکہ متصل تھیں۔ ایک بستی کے آثار ختم ہونے کے بعد دوسری بستی کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔

هٰذِهِ الْقَرْيَة: (۲/۵۸) یہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی ہے کہ اس بستی سے مراد کونسی بستی ہے جس سلسلہ واقعات میں یہ ذکر ہو رہا ہے وہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ بنی اسرائیل ابھی جزیرہ نمائے سینا ہی میں تھے۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ یہ اسی جزیرہ نما کا کوئی شہر ہو گا۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد شطیم ہو جو یریحو کے بالمقابل دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر آباد تھا، بائیبل کا بیان ہے کہ اس شہر کو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کی زندگی کے اخیر زمانے میں فتح کیا اور وہاں بڑی بدکاریاں کیں جن کے نتیجے میں خدا نے ان پر یہ وبا بھیجی اور ۲۴ ہزار آدمی ہلاک کر دیے گئے۔ (گنتی، باب ۲۵، آیت ۱-۸)

الْمُقْتَسِمِين: (۱۵/۹۰) اس گروہ سے مراد یہود ہیں ان کو مقتسمین اس معنی میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے دین کو تقسیم کر ڈالا، اس کی بعض باتوں کو مانا اور بعض کو نہ مانا، اور اس میں طرح طرح کی کمی و بیشی کے بیسیوں فرقے بنا لیے۔)

الْقَصَص: (۱۲/۳) زمخشری کہتے ہیں کہ القصص مصدر بھی ہو سکتا ہے اِقتِصاص (قصہ بیان کرنے) کے معنی میں۔ اور فعل بمعنی مفعول بھی ہو سکتا ہے، جیسے الخَبَر سے مراد وہ بات ہے جس کی خبر دی گئی ہو۔ اور جائز ہے کہ مفعول کو مصدر کے نام سے موسوم کیا جائے جیسے مخلوق کا نام خَلْق۔ اب اگر القصص کو مصدر کے معنی میں لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ نحن نقص علیك احسن الاقتصاص (ہم بیان کرتے ہیں تم سے بہترین بیان کرنا)۔ اور اگر القصص سے مقصوص (بیان کی ہوئی چیز) مراد ہو تو اس کے معنی ہوں گے نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ مَا يُقَصُّ مِنَ الْاَحَادِيْثِ (ہم بیان کرتے ہیں تم سے وہ چیز جو بہتر ہے ان باتوں میں سے جو بیان کی جاتی ہیں)۔

یہی بات امام رازی نے بھی کہی ہے اور اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اگر قصص کو اقتصاص کے معنی میں مصدر مانا جائے تو لفظ احسن جس خوبی کے لیے استعمال ہوا ہے وہ حسنِ بیان کی طرف راجع ہو گی نہ کہ قصے کی طرف، یعنی اس کا مطلب ہو گا بہترین طریقے سے بیان کرنا، نہ کہ بہترین قصہ۔ اور اگر قصص کو مقصوص (بیان کردہ بات) کے معنی میں لیا جائے تو یہ خوبی اس قصے کی ہو گی جو بیان کیا گیا ہے۔

علامہ آلوسی نے قصص کو مصدر اور اقتصاص کا ہم معنی قرار دیتے ہوئے ایک نکتے کا اور

اضافہ کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس جملے میں اَحْسَنَ الْقَصَصِ، نَقُصُّ کا مفعول نہیں ہے بلکہ اس کا مفعول محذوف ہے، اور وہ ہے اس صورت کا مضمون۔ اسی بنا پر ہم نے اس محذوف مقدر کو ''واقعات اور حقائق'' کے الفاظ کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

(رسائل ومسائل حصہ پنجم ص ۹۷۔۹۸)

مکاناً قصیاً: (۱۹/ ۲۲) دور کے مقام سے مراد بیت لحم ہے۔

القِصَاص: (۲/ ۱۷۸) قصاص یعنی خون کا بدلہ، یہ کہ آدمی کے ساتھ وہی کیا جائے جو اس نے دوسرے آدمی کے ساتھ کیا، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاتل نے جس طریقے سے مقتول کو قتل کیا ہو اسی طریقے سے اس کو قتل کیا جائے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جان لینے کا جو فعل اس نے مقتول کے ساتھ کیا وہی اس کے ساتھ کیا جائے۔

قَطِرَان: (۱۴/ ۵۰) بعض مترجمین و مفسرین نے قطران کے معنی گندھک اور بعض نے پگھلے ہوئے تانبے کے بیان کیے ہیں، مگر در حقیقت عربی میں قطران کا لفظ زفت، قیر، رال اور تارکول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

لَا مَقْطُوعَةٍ: (۵۶/ ۳۳) اصل الفاظ ہیں ﴿لَا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوعَةٍ﴾، لا مقطوعہ سے مراد یہ ہے کہ یہ پھل نہ موسمی ہوں گے کہ موسم گزر جانے کے بعد نہ مل سکیں، نہ ان کی پیداوار کا سلسلہ کبھی منقطع ہوگا کہ کسی باغ کے سارے پھل اگر توڑ لیے جائیں تو ایک مدت تک وہ بے ثمر رہ جائے بلکہ ہر پھل وہاں ہر موسم میں ملے گا اور خواہ کتنا ہی کھایا جائے، لگاتار پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

ثُمَّ لْيَقْطَعْ: (۲۲/ ۱۵) یہ بات قطعاً غلط ہے کہ عربی زبان میں لفظ قطع کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔ لغت کی کسی کتاب سے اس کا ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس میں قاطعۃ امرا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قطع کا لفظ امر کے ساتھ تو بے شک عربی محاورے میں کسی معاملے کا فیصلہ کرنے کے معنی دیتا ہے، لیکن محض قطع سے یہ مفہوم ہرگز نہیں نکلتا۔ یہ ایسی ہی تاویل ہے جیسے بعض لوگوں نے دیکھا کہ ضرب فی الارض کے معنی زمین میں چلنے اور سفر کرنے کے ہیں تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ محض لفظ ضرب کے معنی بھی یہی ہیں، اور فقلنا اضرب بعصاک الحجر کا مطلب یہ لے لیا کہ ہم نے موسیٰ سے کہا اپنا عصا لے کر چٹان پر چڑھ جا۔

سورۂ حج میں یہ لفظ جس آیت میں وارد ہوا ہے وہ ایک سلسلۂ تبیان کا حصہ ہے جو رکوع ۲ کے آغاز سے چلا آ رہا ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ لوگوں میں سے کوئی تو ایسا ہے جو حق و باطل کی سرحد پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اگر اسے فائدہ ہوا تو مطمئن ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی آفت آ گئی تو الٹا پھر جاتا ہے اور ایک ایک آستانے پر ماتھا رگڑنے لگتا ہے جہاں کسی کے پاس بھی نفع یا نقصان پہنچانے کے اختیارات نہیں ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ ایمان لاتے اور نیک عمل کرتے

ہیں، اللہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ در حقیقت یہ اختیار اللہ ہی کا ہے کہ کچھ چاہے کرے۔

اس کے بعد فرمایا گیا: ﴿مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَن لَّن يَّنصُرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ﴾. تفہیم القرآن میں اس کی ترجمانی اس طرح کی گئی ہے: ”جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کوئی مدد نہ کرے گا اسے چاہیے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے، پھر دیکھ لے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے“۔ اس میں گمان کرنے والے شخص سے مراد وہی شخص لیا گیا ہے جو کنارے پر رہ کر خدا کی عبادت کرتا ہے، اور اسی کا یہ گمان قرار دیا گیا ہے کہ اللہ اس کی کوئی مدد نہ کرے گا۔ اس کے بعد آگے کے مضمون کا یہ مطلب خود واضح ہو جاتا ہے کہ آستانوں بر جانا تو ردکنار، اگر ہو سکے تو آسمان تک پہنچ کر اس میں شگاف ڈال کے بھی دیکھ لے، کیا خدا کی جو تقدیر اسے ناگوار ہے اسے وہ بدل سکتا ہے؟

اب یہ بھی دیکھ لیجیے کہ اکابر علماء کے ترجموں میں سے کسی میں بھی **ثم لیقطع** کا وہ مفہوم نہیں لیا گیا ہے جو آپ لے رہے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا ترجمہ یہ ہے: ”بس باید کہ بیاویزد رسنے بجانب بالا، باز باید کہ خفہ شود پس در نگرد آیا دور می کند ایں تدبیر او چیزے را کہ بخشم آوردہ“۔

شاہ رفیع الدین صاحبؒ: ”پس چاہیے کہ کھینچ لے جاوے ایک رسی طرف آسمان کے، پھر چاہیے کہ کاٹ ڈالے، پھر دیکھے کیا لے جائے گا مگر اس کا اس چیز کو کہ غصے میں لاتی ہے اسے“۔

مولانا اشرف علی صاحبؒ: ”تو اس کو چاہیے کہ ایک رسی آسمان تک تان لے، پھر (اس کے ذریعہ سے آسمان پر پہنچ کر اگر ہو سکے) اس وحی کو موقوف کرا دے۔ تو پھر اب غور کرنا چاہیے آیا اس کی یہ تدبیر اس کی ناگواری کی چیز کو (یعنی وحی کو) موقوف کر سکتی ہے“۔

مفسرین کے جو اقوال امام رازیؒ اور علامہ آلوسیؒ نے نقل کیے ہیں وہ بھی دیکھ لیجیے:

۱۔ مسلمانوں میں سے ایک گروہ مشرکین کے خلاف اپنی شدت غیظ کی بنا پر اللہ کی طرف سے اپنے رسول اور اپنے دین کی مدد آنے میں دیر لگتی دیکھ کر سخت بے چین ہو رہا تھا۔ اس پر فرمایا گیا کہ جو شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ اپنے رسولؐ کی مدد نہ کرے گا، وہ بڑی سر بڑی کوشش کر کے دیکھ لے، حتی کہ آسمان تک کسی رسی کے ذریعے سے قطع مسافت کر سکتا ہو تو وہ بھی کر دیکھے، کیا اس کی یہ تدبیر خدا کی طرف سے نصرت آنے میں اس تاخیر کو رفع کر سکتی ہے جس پر غیظ میں مبتلا ہے۔

۲۔ کفار یہ سمجھتے تھے کہ اللہ اپنے رسولؐ کی مدد نہ کرے گا اس لیے ان سے یہ کہا گیا کہ کسی رسی کے ذریعہ سے آسمان تک قطع مسافت کر سکتے ہو تو وہ بھی کر کے دیکھ لو، کیا تم رسولؐ

کے یہ اللہ کی مدد آنے کو روک سکتے ہو جس پر تم جل بھن رہے ہو۔

۳۔ یہ مطلب بھی اس آیت کا لیا گیا ہے کہ اگر بن پڑے تو آسمان تک پہنچ کر رسولؐ پر وحی آنے کا سلسلہ منقطع کرنے کی کوشش کر دیکھو جس کا آنا تمہیں سخت ناگوار ہے۔

۴۔ بعض مفسرین نے سماء سے مراد مکان کی چھت لی ہے، اور آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ جو شخص دنیا اور آخرت میں اللہ سے مدد کی امید نہیں رکھتا اسے چاہیے کہ اپنے گھر کی چھت سے رسی لٹکا کر پھانسی لے لے اور دیکھے کہ آیا اس طریقے سے اس کا وہ غیظ دور ہو سکتا ہے جو اللہ سے مدد نہ ملنے پر اسے لاحق ہے۔ اس قول کے قائلین قطع سے مراد سانس کی آمد و رفت کے راستے منقطع کر دینا لیتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مفسرین میں سے کسی نے بھی قطع سے مراد فیصلہ کرنا نہیں لیا ہے بلکہ سب اسے حقیقی یا مجازی طور پر کاٹنے ہی کی معنی میں لیتے ہیں۔

(رسائل و مسائل حصہ پنجم ص ۱۰۴۔۱۰۷)

قِطْمِیْر: (۳۵/ ۱۳) اصل لفظ میں قطمیر استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ پتلی سی جھلی ہے جو کھجور کی گٹھلی پر ہوتی ہے لیکن اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ مشرکین کے معبود کسی حقیر سے حقیر چیز کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اسی لئے ہم نے لفظی ترجمہ چھوڑ کر مرادی ترجمہ کیا ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ: (۲۴/ ۶۰) اصل میں لفظ قواعد من النساء کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی "عورتوں میں سے جو بیٹھ چکی ہوں" یا "بیٹھی ہوئی عورتیں" اس سے مراد سنِ یاس، یعنی عورت کا اس عمر کو پہنچ جانا جس میں وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہے، اس کی اپنی خواہشات بھی مر چکی ہوں اور اس کو دیکھ کر مردوں میں بھی کوئی صنفی جذبہ پیدا نہ ہو سکتا ہو۔

قُمَّلَ: (۷/ ۱۳۳) اصل میں لفظ قمل استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی۔ جوں، چھوٹی مکھی، چھوٹی ٹڈی، مچھر، سرسری وغیرہ، غالباً یہ جامع لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ بیک وقت جوؤں اور مچھروں نے آدمیوں پر اور سرسریوں (گھن کے کیڑوں) نے غلہ کے ذخیروں پر حملہ کیا ہو گا۔

اَقْنٰی: (۵۳/ ۴۸) اصل لفظ اقنی استعمال ہوا ہے جس کے مختلف معنی اہل لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ابن عباس نے اس کے معنی ارضی (راضی کر دیا) بتائے ہیں۔ عکرمہ نے ابن عباس سے اس کے معنی قنع (مطمئن کر دیا) نقل کیے ہیں۔ امام رازی کہتے ہیں کہ آدمی کی حاجت سے زیادہ جو کچھ بھی اس کو دیا جائے وہ اقناء ہے۔ ابو عبیدہ اور دوسرے متعدد اہل لغت کا قول ہے کہ اقنی قنیۃ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں باقی اور محفوظ رہنے والا مال، جیسے مکان، اراضی، باغات، مواشی وغیرہ۔ ان سب سے الگ مفہوم ابن زید بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اقنی یہاں افقر (فقیر کر دیا) کے معنی میں ہے اور

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس نے جس کو چاہا غنی کیا اور جسے چاہا فقیر کر دیا۔

القَهَّار: (۱۳/۱۶) اصل میں لفظ ''قہار'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں ''وہ ہستی جو اپنے زور سے سب پر حکم چلائے اور سب کو مغلوب کر کے رکھے'' یہ بات کہ ''اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے''، مشرکین کی اپنی تسلیم کردہ حقیقت ہے جس سے انہیں کبھی انکار نہ تھا، اور یہ بات کہ ''وہ یکتا اور قہار ہے'' اس تسلیم شدہ حقیقت کا لازمی نتیجہ ہے جس سے انکار کرنا، پہلی حقیقت کو مان لینے کے بعد کسی صاحب عقل کے لیے ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ جو ہر چیز کا خالق ہے وہ لامحالہ یکتا و یگانہ ہے کیونکہ دوسری جو چیز بھی ہے وہ اسی کی مخلوق ہے پھر بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی مخلوق اپنے خالق کی ذات یا صفات یا اختیارات یا حقوق میں اس کی شریک ہو، اسی طرح وہ لامحالہ قہار بھی ہے کیونکہ مخلوق کا اپنے خالق سے مغلوب ہو کر رہنا عین تصور مخلوقیت میں شامل ہے، غلبہ کامل اگر خالق کو حاصل نہ ہو تو وہ خلق ہی کیسے کر سکتا ہے، پس جو شخص اللہ کو خالق مانتا ہو اس کے لیے ان دو خالص عقلی و منطقی نتیجوں سے انکار کرنا ممکن نہیں رہتا اور اس کے بعد یہ بات سراسر غیر معقول ٹھیرتی ہے کہ کوئی شخص خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی بندگی کرے اور غالب کو چھوڑ کر مغلوب کو مشکل کشائی کے لیے پکارے۔

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ: (۲/۳) اقامت صلوٰۃ ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نماز کا نظام باقاعدہ قائم کیا جائے۔ اگر کسی بستی میں ایک ایک شخص انفرادی طور پر نماز کا پابند ہو لیکن جماعت کیساتھ فرض ادا کرنے کا نظم نہ ہو تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں نماز قائم کی جا رہی ہے۔

قَومِ نُوح: (۷/۵۹) قرآن کے اشارات اور بائیبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوح کی قوم اس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں، بابل کے آثار قدیمہ میں بائبل سے قدیم جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، ان میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں بیان ہوا ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے گرد و نواح میں بتائی گئی ہے، پھر یہ روایات کردستان اور آرمینیہ میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسل چلی آ رہی ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھیری تھی۔ موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے آس پاس، آرمینیہ کی سرحد پر کوہ اراط کے نواح میں نوح علیہ السلام کے مختلف آثار کی نشاندہی اب بھی کی جاتی ہے اور شہر نخچوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اس شہر کی بنا حضرت نوح نے ڈالی تھی۔

حضرت نوحؑ کے اس قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم

لٹریچر میں بھی ملتی ہیں اور اس کے علاوہ برما، ملایا، جزائر شرق الہند، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے جب کہ پوری نسل آدم کسی ایک خطہ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشان دہی کرتی ہیں، اگرچہ مرور ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انہوں نے فراموش کردیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھادیا۔

یہاں اور دوسرے مقامات پر حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا جو حال قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی، نہ اس سے ناواقف تھی، نہ اسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا۔ بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئی تھی، شرک کی گمراہی تھی، یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو خدائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دے لیا تھا، پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں رونما ہو گئیں، جو خود ساختہ معبود خدائی میں شریک ٹھیرا لیے گئے تھے ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو تمام مذہبی سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا اور اس نے انسانوں میں اونچ نیچ کی تقسیم پیدا کردی، اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کردیں، حضرت نوح علیہ السلام نے اس حالت کو بدلنے کے لئے ایک زمانہ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھانس رکھا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی، آخر کار حضرت نوح علیہ السلام نے خدا سے دعا کی کہ ان کافروں میں سے ایک کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ، کیوں کہ اگر تو نے ان میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا بدکار اور نمک حرام ہی پیدا ہو گا۔

اَقِمْ وَجْهَكَ: (۱۰/۱۰۵) اقم وجھک کے لفظی معنی ہیں ''اپنا چہرہ جمادے'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ تیرا رخ ایک ہی طرف قائم ہو، ڈگمگاتا اور ہلتا ڈلتا نہ ہو، کبھی پیچھے اور کبھی آگے اور کبھی دائیں اور کبھی بائیں نہ مڑتا رہے، بالکل ناک کی سیدھ اسی راستے پر نظر جمائے ہوئے چل جو تجھے دکھادیا گیا ہے۔

اَقْوَمُ قِيْلًا: (۷۳/۶) اصل میں اقوم قیلا ارشاد ہوا ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''قول کو زیادہ راست اور درست بناتا ہے۔'' لیکن مدعا یہ ہے کہ اس وقت انسان قرآن کو زیادہ سکون و اطمینان اور توجہ کے ساتھ سمجھ کر پڑھ سکتا ہے۔ ابن عباس اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ اجدر ان یفقه فی القرآن۔ یعنی ''وہ اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ آدمی

قرآن میں غور و خوض کرے۔'' (ابوداؤد)

قَوَّامُون: (۴/۳۴) قوام یا قیم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔

المُقْوِیْن: (۵۶/۷۳) اصل میں لفظ مقوین استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے مختلف معنی اہل لغت نے بیان کیے ہیں۔ بعض اسے صحرا میں اترے ہوئے مسافروں کے معنی میں لیتے ہیں۔ بعض اس کے معنی بھوکے آدمی کے لیتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو آگ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، خواہ وہ کھانا پکانے کا فائدہ ہو یا روشنی کا یا تپش کا۔

(ک)

کُبِتَ: (۵/۵۸) اصل میں لفظ کبت استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں رسوا کرنا، ہلاک کرنا، لعنت کرنا، راندہ درگاہ کر دینا، دھکے دے کر نکال دینا، تذلیل کرنا۔

مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ: (۶۷/۲۳) تفہیم القرآن میں مستکبرین بہ کی ضمیر آیات سنانے والے رسول کی طرف پھیری گئی ہے، اور اس کے ساتھ استکبار کرنے (یعنی گھمنڈ کرنے) میں عدم اعتناء کو مقدر مان کر اس کا مفہوم "خاطر میں نہ لانے" سے ادا کیا گیا ہے۔ سمر کو عربی محاورے کے مطابق راتوں کی افسانہ گوئی اور گپ بازی کے معنی میں لیا گیا ہے جو ہر قبیلے کی چوپال میں ہوا کرتی تھی۔ اور تجرون کو ہذیان اور بدگوئی کے معنی میں لیا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے دونوں صاحبزادوں اور مولانا اشرف علی صاحبؒ نے بہ کی ضمیر قرآن یا اس کے سنانے والے رسول کی طرف پھیری ہے۔ آگے کے مضمون میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور مولانا اشرف علی صاحبؒ نے سامراً کا مفہوم بافسانہ مشغول شدن، افسانہ گوئی کرنے اور قرآن کا مشغلہ بنانے سے ادا کیا ہے، اور صرف شاہ عبد القادر صاحبؒ نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامر (کہانی سنانے والا) قرار دیتے تھے۔ تھجرون کو شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شاہ عبد القادر صاحبؒ نے ترک کرنے اور چھوڑ دینے کے معنی میں، اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور مولانا اشرف علی صاحبؒ نے بیہودہ بکواس کے معنی میں لیا ہے۔ اب دیکھیے کہ اکابر مفسرین ان آیتوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

ابن جریر کہتے ہیں کہ سمر سے مراد رات کے وقت افسانہ گوئی کرنا ہے، اور تھجرون کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ لوگ قرآن یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے رخی کرتے اور آپ کو چھوڑ دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہذیان بکتے تھے۔ اس کے بعد صحابہ و تابعین کے اقوال نقل کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے تھجرون کا مطلب اللہ کے ذکر اور حق کو چھوڑ دینا بیان کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر کے نزدیک سامراً تھجرون کی تفسیر "راتوں کے افسانہ گوئی اور خلاف حق باتوں میں انہماک" ہے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ تھجرون سے مراد قرآن کے بارے میں بدگوئی ہے۔ اور ابن زید کے نزدیک یہ لفظ ہذیان کے معنی میں ہے۔

زمخشری ﴿مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سَامِرًا تَهْجُرُوْنَ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

(ا) "بہ کی ضمیر کا مرجع آیاتی بمعنی کتابی بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں قرآن سے استکبار کرنے کا مطلب یا تو یہ ہوگا کہ وہ تکبر کرتے ہوئے اس کی تکذیب کرتے ہیں، یا پھر اس کے معنی یہ ہوں

رکے کہ قرآن سن کر ان پر غرور اور سرکشی کا دورہ پڑ جاتا ہے اور اس لحاظ سے وہ قرآن کے ساتھ استکبار کے مرتکب ہوتے ہیں۔

(۲) بہ کا تعلق سامراً سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنی راتوں کی مجلسوں میں قرآن کا ذکر کرتے ہوئے اس پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ کفار قریش کا معمول یہ تھا کہ وہ راتوں کو بیت اللہ کے اردگرد مجلسیں جما کر بیٹھ جاتے تھے اور اپنا وقت زیادہ تر قرآن کے خلاف باتیں چھانٹنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب و شتم کرنے میں صرف کرتے تھے۔

(۳) بہ کا تعلق تھجرون سے بھی ہو سکتا ہے جو اگر ھجر سے مشتق ہو تو اس کے معنی فحش گوئی کے ہیں، اور ھجر سے مشتق ہو تو اس کے معنی ہذیان بکنے کے ہیں"۔

امام رازی اور بضاوی کی تفسیر زمخشری اور ابن جریر کی تفسیر سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

آلوسی کہتے ہیں کہ مستکبرین بہ میں (ب) یا تو تعدیہ کے لیے ہے تاکہ استکبار میں ضمناً تکذیب کا مفہوم شامل ہو جائے، یا سببیت کے لیے ہے، کیونکہ کفار کے اندر استکبار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے سبب سے ظاہر ہوا تھا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع قرآن ہو جس بر لفظ آیات دلالت کرتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا تعلق سامراً سے ہو اور معنی یہ ہو کہ وہ اپنی راتوں کی گفتگوؤں میں قرآن کے خلاف طعن کرتے تھے۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ تھجرون ہجر سے مشتق ہے جس کے معنی چھوڑ دینے اور تعلق توڑ دینے کے ہیں، اور یہ حال کے طور پر یہاں لایا گیا ہے اس معنی میں کہ وہ حق کو، یا قرآن کو، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑتے ہوئے ایسا کرتے ہیں۔ نیز ہجر کے معنی ہذیان کے بھی ہیں اور اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ وہ قرآن یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہذیان بکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تھجرون اہجر سے ہو جس کے معنی کلام قبیح کے ہیں۔

(رسائل و مسائل حصہ پنجم ص ۱۰۰۔۱۰۲)

اِسْتَكْبَرُوْا: (۱۷/۷) تکبر سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے حق کے آگے سر جھکا دینے اور خدا کے رسول کی نصیحت قبول کر لینے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بھلا آدمی کسی بگڑے ہوئے شخص کو نصیحت کرے اور وہ جواب میں سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہو اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جائے تو یہ تکبر کے ساتھ کلام نصیحت کو رد کرنا ہو گا۔

الْمُتَكَبِّرُ: (۲۳/۵۹) اصل میں لفظ المتکبر استعمال ہوا ہے جس کے دو مفہوم ہیں۔ ایک وہ جو فی الحقیقت بڑا نہ ہو مگر خواہ مخواہ بڑا بنے۔ دوسرے وہ جو حقیقت میں بڑا ہو اور بڑا ہو کر ہی رہے۔ انسان ہو یا شیطان، یا کوئی اور مخلوق، چونکہ بڑائی فی الواقع اس کے لیے نہیں ہے، اس لیے اس کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں پر اپنی بڑائی جتانا ایک جھوٹا ادعا اور بدترین عیب ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ حقیقت میں بڑا ہے اور بڑائی فی الواقع اسی کے لئے ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے مقابلے میں حقیر و ذلیل ہے۔ اس لیے اس کا بڑا ہونا اور بڑا ہی ہو کر رہنا کوئی ادعا اور تصنع

نہیں بلکہ ایک امر واقعی ہے، ایک بری صفت نہیں بلکہ ایک خوبی ہے جو اس کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی۔

یَتَكَبَّرُوْنَ: (۱۴۶/۷) "بڑا بننا" یا "تکبر کرنا" قرآن مجید اس معنی میں استعمال کرتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے بالاتر سمجھنے لگے اور خدا کے احکام کی کچھ پروانہ کرے، اور ایسا طرز عمل اختیار کرے گویا کہ وہ نہ خدا کا بندہ ہے اور خدا اس کا رب ہے، اس خودسری کی کوئی حقیقت ایک پندار غلط کے سوا نہیں ہے۔ کیونکہ خدا کی زمین میں رہتے ہوئے ایک بندے کو کسی طرح یہ حق نہیں پہنچتا کہ غیر بندہ بن کر رہے، اسی لیے فرمایا کہ "وہ بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔"

كُبْكِبُوا: (۹۴/۲۶) اصل میں کبکبوا فرمایا گیا ہے جس میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ ایک کے اوپر ایک دھکیل دیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ قعر جہنم تک لڑھکتے چلے جائیں گے۔

كِتٰبٌ: (۱/۱۱) کتاب کا ترجمہ یہاں انداز بیان کی مناسبت سے "فرمان" کیا گیا ہے، عربی زبان میں یہ لفظ کتاب اور نوشتے ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ حکم اور فرمان شاہی کے معنی میں بھی آتا ہے اور خود قرآن میں متعدد مواقع پر یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

الكِتَاب: (۴/۱۷) کتاب سے مراد یہاں توراۃ نہیں ہے بلکہ صحف آسمانی مجموعہ ہے جس کے لیے قرآن میں اصطلاح کے طور پر لفظ "الکتاب" کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔

الكِتَاب: (۳۳/۲۴) مکاتبت: مکاتبت کے لفظی معنی تو ہیں "لکھا پڑھی" مگر اصطلاح میں یہ لفظ اس معنی میں بولا جاتا ہے کہ کوئی غلام یا لونڈی اپنی آزادی کے لیے اپنے آقا کو ایک معاوضہ ادا کرنے کی پیش کش کرے اور جب آقا اسے قبول کرے تو دونوں کے درمیان شرائط کی لکھا پڑھی ہو جائے۔

كِتَاب اللّٰه: (۲۳/۳) اس مقام پر خدا کی کتاب سے مراد تورات و انجیل ہے۔

كِتٰبٌ مَّكْنُوْن: (۷۸/۵۶) اس سے مراد ہے لوح محفوظ۔ اس کے لئے "کتاب مکنون" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ایسا نوشتہ جو چھپا کر رکھا گیا ہے، یعنی جس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ اس محفوظ نوشتے میں قرآن کے ثبت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ پر نازل کیے جانے سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس نوشتۂ تقدیر میں ثبت ہو چکا ہے جس کے اندر کسی ردو بدل کا امکان نہیں ہے کیونکہ وہ ہر مخلوق کی دست رس سے بالاتر ہے۔

التَّكَاثُرُ: (۱/۱۰۲) تکاثر کثرت سے ہے، اور اس کے تین معنی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرے، دوسرے یہ کہ لوگ کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اس بات پر فخر جتائیں کہ انہیں دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔

الکَوْثَرَ: (۱۰۸/۱) کوثر کا لفظ یہاں جس طرح استعمال کیا گیا ہے اس کا پورا مفہوم ہماری زبان تو در کنار، شاید دنیا کی کسی زبان میں بھی ایک لفظ سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کثرت سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے لغوی معنی تو بے انتہا کثرت کے ہیں مگر جس موقع پر اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اس میں محض کثرت کا نہیں بلکہ خیر اور بھلائی اور نعمتوں کی کثرت اور ایسی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے جو افراط اور فراوانی کی حد کو پہنچی ہوئی ہو اور اس سے مراد کسی ایک خیر یا بھلائی یا نعمت کی نہیں بلکہ بے شمار بھلائیوں اور نعمتوں کی کثرت ہے۔

اِنْکَدَرَتْ: (۲/۸۱) یعنی وہ بندش جس نے ان کو اپنے اپنے مدار اور مقام پر باندھ رکھا ہے، کھل جائے گی اور سب تارے اور سیارے کائنات میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ انکدار میں کدرت کا مفہوم بھی شامل ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف منتشر ہی نہیں ہوں گے بلکہ تاریک بھی ہو جائیں گے۔

الکَرْبِ العَظِیْم: (۷۶/۲۱) کرب عظیم سے مراد یا تو ایک بدکردار قوم کے درمیان زندگی بسر کرنے کی مصیبت ہے یا پھر طوفان۔

کُرْسِیُّہٗ: (۲۵۵/۲) اصل میں لفظ ''کرسی'' استعمال ہوا ہے جسے بالعموم حکومت اور اقتدار کے لیے استعارے کے طور پر بولا جاتا ہے، اردو زبان میں بھی اکثر کرسی کا لفظ بول کر حاکمانہ اختیارات مراد لیتے ہیں۔

کَرِیْمٌ: (۴۴/۱۷) اصل میں رسول کریم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، کریم کا لفظ جب انسان کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ وہ بہترین شریفانہ خصائل اور نہایت قابل تعریف صفات سے متصف ہے۔ معمولی خوبیوں کے لے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔

تَکْسِبُوْنَ: (۳۹/۲۴) اصل میں لفظ ''کسب'' استعمال ہوا ہے جس سے مراد قرآن مجید کی اصطلاح میں جزا و سزا کا وہ استحقاق ہے جو آدمی اپنے عمل کے نتیجے میں کماتا ہے۔ نیک عمل کرنے والے کی اصل کمائی یہ ہے کہ وہ اللہ کے اجر کا مستحق بنتا ہے اور گمراہی و بدراہی اختیار کرنے والے کی کمائی وہ سزا ہے جو اسے آخرت میں ملنے والی ہے۔

کَسَبَتْ: (۱۳۴/۲) جو کچھ انہوں نے کمایا، وہ ان کے لئے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لئے ہے، یہ قرآن کا خاص انداز بیان ہے ہم جس چیز کو فعل یا عمل کہتے ہیں قرآن اپنی زبان میں اسے کسب یا کمائی کہتا ہے۔ ہمارا ہر عمل اپنا ایک اچھا یا برا نتیجہ رکھتا ہے جو خدا کی خوشنودی یا ناراضی کی صورت میں ظاہر ہو گا وہی نتیجہ ہماری کمائی ہے، چونکہ قرآن کی نگاہ میں اصل اہمیت اسی نتیجے کی ہے، اس لیے اکثر وہ ہمارے کاموں کو عمل و فعل کے الفاظ سے تعبیر کرنے کے بجائے ''کسب'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

مَاکَسَبَ: (۲/۱۱۱) ما کسب کو بعض مفسرین نے کمائی کے معنی میں لیا ہے یعنی اپنے مال

سے جو منافع اس نے حاصل کیے وہ اس کا کسب تھے اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد اولاد لی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آدمی کا بیٹا بھی اس کا کسب ہے (ابوداؤد، ابن ابی حاتم) یہ دونوں معنی ابولہب کے انجام سے مناسبت رکھتے ہیں کیونکہ جب وہ عدسہ کے مرض میں مبتلا ہوا تو اس کا مال بھی اس کے کسی کام نہیں آیا اور اس کی اولاد نے بھی اسے بے کسی کی موت مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اس کا جنازہ تک عزت کے ساتھ اٹھانے کی اس اولاد کو توفیق نہیں ہوئی۔ اس طرح چند ہی سال کے اندر لوگوں نے اس پیشنگوئی کو پورا ہوتے دیکھ لیا جو ابو لہب کے متعلق اس سورہ میں کی گئی تھی۔

یُکْشَفُ: (۶۸/۴۲) اصل الفاظ ہیں ﴿یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾، ”جس روز پنڈلی کھولی جائے گی“۔ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ محاورے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آپڑنے کو کشف ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس نے بھی اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں اور ثبوت میں کلام عرب سے استشہاد کیا ہے۔ ایک اور قول جو ابن عباس اور ربیع بن انس سے منقول ہے اس میں کشف ساق سے مراد حقائق پر سے پردہ اٹھا لیا گیا ہے۔ اس تاویل کی رو سے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آجائیں گے۔

الْکٰفِرِین: (۲/۲۶۴) یہاں ”کافر“ کا لفظ ناشکرے اور منکر نعمت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمت کو اس کی راہ میں اس کی رضا کے لئے خرچ کرنے کے بجائے خلق کی خوشنودی کے لیے صرف کرتا ہے یا اگر خدا کی راہ میں کچھ مال دیتا بھی ہے، تو اس کے ساتھ اذیت بھی دیتا ہے، وہ دراصل ناشکرا اور اپنے خدا کا احسان فراموش ہے اور جب کہ وہ خود ہی خدا کی رضا کا طالب نہیں ہے تو اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ اسے خواہ مخواہ اپنی رضا کا راستہ دکھائے۔

الْکٰفِرُون: (۴/۱۵۱) یعنی کافر ہونے میں وہ لوگ جو نہ خدا کو مانتے ہیں نہ اس کے رسولوں کو، اور جو خدا کو مانتے ہیں مگر رسولوں کو نہیں مانتے، اور وہ جو کسی رسول کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے، سب یکساں ہیں، ان میں سے کسی کے کافر ہونے میں ذرہ برابر گنجائش نہیں۔

کَفَرَ: (۲۴/۵۵) کفر سے مراد یہاں کفران نعمت بھی ہو سکتا ہے اور انکار حق بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کے مصداق وہ لوگ ہوں گے جو نعمت خلافت پانے کے بعد طریق حق سے ہٹ جائیں، اور دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کے مصداق منافقین ہوں گے جو اللہ کا وعدہ سن لینے کے بعد بھی اپنی منافقانہ روش نہ چھوڑیں۔

کَفَرُوا: (۲/۱۶۱) ”کفر“ کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں بولا جانے لگا۔ ایمان کے معنی ہیں ماننا، قبول کرنا، تسلیم کرلینا اس کے

برعکس کفر کے معنی ہیں نہ ماننا، رد کر دینا انکار کرنا، قرآن کی رو سے کفر کے رویہ کی مختلف صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ انسان سرے سے خدا ہی کو نہ مانے یا اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک اور معبود ماننے سے انکار کر دے یا اسے واحد مالک اور معبود نہ مانے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اس کے احکام اور اس کی ہدایات کو واحد منبع علم و قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

تیسرے یہ کہ اصولاً اس بات کو بھی تسلیم کر لے کہ اسے اللہ ہی کی ہدایت پر چلنا چاہیے مگر اللہ اپنی ہدایات اور اپنے احکام پہنچانے کے لئے جن پیغمبروں کو واسطہ بناتا ہے انہیں تسلیم نہ کرے۔

چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے اور اپنی پسند یا اپنے تعصبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔

پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے عقائد، اخلاق اور قوانین حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں ان کو، یا ان میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے۔

چھٹے یہ کہ نظریے کے طور پر تو ان سب چیزوں کو مان لے مگر عملاً احکام الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے اور دنیوی زندگی میں اپنے رویے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ نافرمانی ہی پر رکھے۔

یہ سب مختلف طرز فکر و عمل اللہ کے مقابلے میں باغیانہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک رویے کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے اس کے علاوہ بعض مقامات پر قرآن میں کفر کا لفظ کفران نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور شکر کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔ شکر کے معنی یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے انسان اس کا احسان مند ہو، اس کے احسان کی قدر کرے، اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی رضا کے مطابق استعمال کرے اور اس کا دل اپنے محسن کے لئے وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو، اس کے مقابلے میں کفر یا کفران نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے محسن کا احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے، یا اس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کر دے، یا اس کی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے، یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ غدر اور بے وفائی کرے، اس نوع کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی، نمک حرامی، غداری اور ناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے

کَفَّارٍ : (۵۰/۲۴) اصل میں لفظ ''کفار'' استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہیں۔ ایک سخت ناشکرا۔ دوسرے سخت منکر حق۔

کَفَّارَہ: (۴/۹۲) کفارہ کے لغوی معنی ہیں ''چھپانے والی چیز'' کسی کار خیر کو گناہ کا ''کفارہ'' قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نیکی اس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہو اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔

يَكْفُرْ: (۱۳۶/۴) کفر کرنے کے بھی دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ آدمی صاف صاف انکار کرے، دوسرے یہ کہ زبان سے تو مانے مگر دل سے نہ مانے، یا اپنے رویے سے ثابت کردے کہ وہ جس چیز کو ماننے کا دعویٰ کر رہا ہے فی الواقع اسے نہیں مانتا۔ یہاں کفر سے یہ دونوں معنی مراد ہیں اور آیت کا مقصود لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ اسلام کے ان اساسی عقیدوں کے ساتھ کفر کی ان دونوں اقسام میں سے جس قسم کا برتاؤ بھی آدمی اختیار کرے گا، اس کا نتیجہ حق سے دوری اور باطل کی راہوں میں سرگشتگی و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

ذَا الْكِفْلِ: (۸۵/۲۱) ذوالکفل کا لفظی ترجمہ "صاحب نصیب"، اور مراد ہے اخلاقی بزرگی اور ثواب آخرت کے لحاظ سے صاحب نصیب، نہ کہ دنیوی فوائد و منافع کے لحاظ سے۔ یہ ان بزرگوں کا نام نہیں بلکہ لقب ہے۔ قرآن مجید میں دو جگہ ان کا ذکر آیا ہے اور دونوں جگہ ان کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے، نام نہیں لیا گیا۔

مفسرین کے اقوال اس معاملے میں بہت مختلف ہیں کہ یہ بزرگ کون ہیں، کس ملک اور قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور کس زمانے میں گزرے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ حضرت زکریا کا دوسرا نام ہے۔ (حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر ابھی آگے آ رہا ہے) کوئی کہتا ہے کہ یہ حضرت الیاس ہیں، کوئی یوشع بن نون کا نام لیتا ہے، کوئی کہتا ہے یہ الیسع ہیں، (حالانکہ یہ بھی غلط ہے، سورہ ص میں ان کا ذکر الگ کیا گیا ہے اور ذوالکفل کا الگ)۔ کوئی انہیں حضرت الیسع کا خلیفہ بتاتا ہے، اور کسی کا قول ہے کہ یہ حضرت ایوب کے بیٹے تھے جو ان کے بعد نبی ہوئے اور ان کا اصلی نام بشر تھا، آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ "یہودیوں کا دعوی ہے کہ یہ حزقیال (حزقی ایل) نبی ہیں جو بنی اسرائیل کی اسیری (۵۹۷ ق م) کے زمانے میں نبوت پر سرفراز ہوئے اور نہر خابور کے کنارے ایک بستی میں فرائض نبوت انجام دیتے رہے۔"

كُفُوًا: (۴/۱۱۲) اصل میں لفظ کفواً استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں نظیر، مشابہ، مماثل، ہم رتبہ، مساوی، نکاح کے معاملہ میں کفو کا لفظ ہماری زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی معاشی حیثیت سے برابر کی جوڑ ہوں۔ پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات میں کوئی نہیں ہے۔ نہ کبھی تھا نہ کبھی ہو سکتا ہے، جو اللہ کے مانند یا اس کا ہم مرتبہ ہو یا جو اپنی صفات، افعال اور اختیارات میں اس سے کسی درجہ میں بھی مشابہت رکھتا ہو۔

كَالِحُوْنَ: (۱۰۴/۲۳) اصل میں لفظ کالحون استعمال کیا گیا ہے۔ کالح عربی زبان میں اس چہرے کو کہتے ہیں جس کی کھال الگ ہو گئی ہو اور دانت باہر آگئے ہوں، جیسے بکرے کی بھنی ہوئی سری، عبداللہ بن مسعود سے کسی نے کالح کے معنی پوچھے تو انہوں نے کہا الم تر الی الراس المشیط؟ کیا تم بھنی ہوئی سیر نہیں دیکھی؟

الْكَلٰلَةَ (۱۷۶/۴) کلالہ کے معنی میں اختلاف ہے، بعض کی رائے میں کلالہ وہ شخص ہے جو

لاولد بھی ہو اور جس کے باپ اور دادا بھی زندہ نہ ہوں، اور بعض کے نزدیک محض لاولد مرنے والے کو کلالہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آخر وقت تک اس معاملہ میں متردد رہے لیکن عام فقہاء نے حضرت ابو بکر کی اس رائے کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کا اطلاق پہلی صورت پر ہی ہوتا ہے، اور خود قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ یہاں کلالہ کی بہن کو نصف ترکہ کا وارث قرار دیا گیا ہے، حالانکہ اگر کلالہ کا باپ زندہ ہو تو بہن کو سرے سے کوئی حصہ پہنچتا ہی نہیں۔

بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ: (۳۹/۳) اللہ کے "فرمان" سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چونکہ ان کی پیدائش اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی فرمان سے خرقِ عادت کے طور پر ہوئی تھی اس لیے ان کو قرآن مجید میں "کلمة من الله" کہا گیا ہے۔

كَلَامَ اللهِ: (۷۵/۲) کلام اللہ سے مراد تورات، زبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو ان کے انبیاء کے ذریعے سے پہنچیں۔

كَلِمَتُهٗ: (۱۷۱/۴) اصل میں لفظ "کلمہ" استعمال ہوا ہے۔ مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت مریم علیہا السلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل استقرار قبول کر لے، عیسائیوں کو ابتداء مسیح علیہ السلام کی پیدائش بے پدر کا یہ راز بتایا گیا۔ مگر انہوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو "کلام" یا "نطق" (Locos) کا ہم معنی سمجھ لیا۔ پھر اس کلام و نطق سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی۔ پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

الْكَهْفِ: (۹/۱۸) عربی زبان میں "کہف" وسیع غار کو کہتے ہیں اور "غار" کا لفظ تنگ کھوہ کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر اردو میں غار کہف کا ہم معنی ہے۔

بِكَاهِنٍ: (۲۹/۵۲) "کاہن" عربی زبان میں جوتشی، غیب گو اور سیانے کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں یہ ایک مستقل پیشہ تھا، کاہنوں کا دعویٰ تھا اور ان کے بارے میں ضعیف الاعتقاد لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ ستارہ شناس ہیں یا ارواح اور شیاطین اور جنوں سے ان کا خاص تعلق ہے جس کی بدولت وہ غیب کی خبریں معلوم کر سکتے ہیں کوئی چیز کھوئی جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں پڑی ہے، کسی کے ہاں چوری ہو جائے تو، وہ بتا سکتے ہیں کہ چور کون ہے۔ کوئی اپنی قسمت پوچھے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ انہی اغراض کے لئے لوگ ان کے پاس جاتے تھے اور وہ کچھ نذر و نیاز لے کر انہیں غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی بسا اوقات بستیوں میں آواز لگاتے پھرتے تھے تا کہ لوگ ان کی طرف رجوع کریں۔ ان کی ایک خاص

وضع قطع ہوتی تھی جس سے وہ الگ پہچانے جاتے تھے۔ان کی زبان بھی عام بول چال سے مختلف ہوتی تھی وہ مقفی اور مسجع فقرے خاص لہجے میں ذرا ترنم سے بولتے تھے اور بالعموم ایسے گول مول فقرے استعمال کرتے تھے جن سے ہر شخص اپنے مطلب کی بات نکال لے۔

كَلِمَة: (۱۴/۲۴) کلمہ طیبہ کے لفظی معنی تو "پاکیزہ بات" کے ہیں مگر اس سے مراد ہے وہ قول حق اور عقیدہ صالحہ جو سراسر حقیقت اور راستی پر مبنی ہو۔یہ قول اور عقیدہ قرآن مجید کی رو سے لازماً وہی ہو سکتا ہے جس میں توحید کا اقرار، انبیاء اور کتب آسمانی کا اقرار، اور آخرت کا اقرار ہو کیونکہ قرآن انہی امور کو بنیادی صداقتوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

كُوِّرَتْ: (۸۱/۱) سورج کے بے نور کر دیے جانے کے لئے یہ ایک بے نظیر استعارہ ہے۔عربی زبان میں تکویر کے معنی لپیٹنے کے ہیں۔سر پر عمامہ باندھنے کے لئے تکویر العمامہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں کیونکہ عمامہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور پھر سر کے گرد اسے لپیٹا جاتا ہے اسی مناسبت سے اس روشنی کو جو سورج سے نکل کر سارے نظام شمسی میں پھیلتی ہے عمامہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز یہ پھیلا ہوا عمامہ سورج پر لپیٹ دیا جائے گا یعنی اس کی روشنی کا پھیلنا بند ہو جائے گا۔

كَيْدِيْ: (۶۸/۴۵) اصل میں لفظ کید استعمال ہوا ہے جس کے معنی کسی کے خلاف خفیہ تدبیر کرنے کے ہیں۔یہ چیز صرف اس صورت میں ایک برائی ہوتی ہے جب یہ ناحق کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے ہو۔ورنہ بجائے خود اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ خصوصاً جب کسی ایسے طریقے کے خلاف یہ طریقہ اختیار کیا جائے جس نے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنالیا ہو۔

كَيْدَهُمْ: (۱۰۵/۲) اصل میں لفظ کید استعمال کیا گیا ہے جو کسی شخص کو نقصان پہنچانے کے لئے خفیہ تدبیر کے معنی میں بولا جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ یہاں خفیہ کیا چیز تھی؟ ساٹھ ہزار کا لشکر کئی ہاتھی لیے ہوئے علانیہ یمن سے مکہ آیا تھا اور اس نے یہ بات چھپا کر نہیں رکھی تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہے اس لئے یہ تدبیر تو خفیہ نہ تھی۔البتہ جو بات خفیہ تھی وہ حبشیوں کی یہ غرض تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھا کر، قریش کو کچل کر، اور تمام اہل عرب کو مرعوب کر کے تجارت کا وہ راستہ عربوں سے چھین لینا چاہتے تھے جو جنوب عرب سے شام و مصر کی طرف جاتا تھا۔اس غرض کو انہوں نے چھپا رکھا تھا اور ظاہر یہ کیا تھا کہ ان کے کلیسا کی جو بے حرمتی عربوں نے کی ہے اس کا بدلہ وہ ان کے معبد ڈھا کر لینا چاہتے ہیں۔

كَأْس: (۴۵/۳۷) اصل میں یہاں شراب کی تصریح نہیں ہے بلکہ کاس (ساغر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن عربی زبان میں کاس کا لفظ بول کر ہمیشہ شراب ہی مراد لی جاتی ہے۔جس پیالے میں شراب کے بجائے دودھ یا پانی ہو، یا جس پیالے میں کچھ نہ ہو اسے کاس نہیں کہتے۔ کاس کا لفظ صرف اسی وقت بولا جاتا ہے جب اس میں شراب ہو۔

(ل)

اللّٰتَ: (۱۹/۵۳)لات کا استھان طائف میں تھا اور بنی ثقیف اس کے اس حد تک معتقد تھے کہ جب ابرہہ ہاتھیوں کی فوج لے کر خانۂ کعبہ کو توڑنے کے لئے مکہ پر چڑھائی کرنے جارہا تھا اس وقت ان لوگوں نے محض اپنے اس معبود کے آستانے کو بچانے کی خاطر اس ظالم کو مکے کا راستہ بتانے کے لیے بدرقے فراہم کیے تاکہ وہ لات کو ہاتھ نہ لگائے، حالانکہ تمام اہل عرب کی طرح ثقیف کے لوگ یہ مانتے تھے کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے، لات کے معنی میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن جریر طبری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اللہ کی تانیث ہے، یعنی اصل میں یہ لفظ اللهة تھا جسے اللات کردیا گیا ہے۔ زمخشری کے نزدیک یہ لوی یلوی سے مشتق ہے جس کے معنی مڑنے اور کسی طرف جھکنے کے ہیں۔ چونکہ مشرکین عبادات کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے اور اس کے آگے جھکتے اور اس کا طواف کرتے تھے اس لیے اس کو لات کہا جانے لگا، ابن عباسؓ اس کو لات بتشدید تاء پڑھتے ہیں اور اسے لت یلت سے مشتق قرار دیتے ہیں جس کے معنی متھنے اور لتھیڑنے کے ہیں۔ ان کا اور مجاہد کا بیان ہے کہ یہ دراصل ایک شخص تھا جو طائف کے قریب ایک چٹان پر رہتا تھا اور حج کے لیے جانے والوں کو ستو پلاتا اور کھانے کھلاتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اسی چٹان پر اس کا استھان بنالیا اور اس کی عبادت کرنے لگے۔ مگر لات کی یہ تشریح ابن عباس اور مجاہد جیسے لوگوں سے مروی ہونے کے باوجود دو وجوہ سے قابل قبول نہیں ہے۔ ایک یہ کہ قرآن میں اسے لات کہا گیا ہے نہ کہ لاتّ۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید ان تینوں کو دیویاں بتارہا ہے اور اس روایت کی رو سے لات مرد تھا نہ کہ عورت۔

یُلْحِدُونَ: (۷/۱۸۰)الحاد کے معنی ہیں وسط سے ہٹ جانا، سیدھے رخ سے منحرف ہوجانا، تیر جب ٹھیک نشانے پر بیٹھنے کے بجائے کسی دوسری طرف جا لگتا ہے تو عربی میں کہتے ہیں اَلْحَدَ السهم الهدف، یعنی تیر نے نشانے سے الحاد کیا۔ خدا کے نام رکھنے میں الحاد یہ ہے کہ خدا کو ایسے نام دیے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں، جو اس کے ادب کے منافی ہوں جن سے عیوب اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں، یا جن سے اس کی ذات اقدس واعلیٰ کے متعلق کسی غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو۔ نیز یہ بھی الحاد ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کے لیے ایسا نام رکھا جائے جو صرف خدا ہی کے لئے موزوں ہو، پھر یہ جو فرمایا کہ اللہ کے نام رکھنے میں جو لوگ الحاد کرتے ہیں، ان کو چھوڑ دو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ سیدھی طرح سمجھانے سے نہیں سمجھتے تو ان کی کج بحثیوں میں تم کو الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں، اپنی گمراہی کا انجام وہ خود دیکھ لیں گے۔

اَلَدُّ الخِصَام: (۲/ ۲۰۴) ''الد الخصام'' کے معنی ہیں ''وہ دشمن جو تمام دشمنوں سے زیادہ ٹیڑھا ہو'' یعنی جو حق کی مخالفت میں ہر ممکن حربے سے کام لے، کسی جھوٹ، کسی بے ایمانی، کسی غدر و بدعہدی اور کسی ٹیڑھی سے ٹیڑھی چال کو بھی استعمال کرنے میں تامل نہ کرے۔

لَطِیْفٌ: (۴۲/ ۱۹) اصل میں لفظ لطیف استعمال ہوا ہے جس کا پورا مفہوم ''مہربان'' سے ادا نہیں ہوتا۔ اس لفظ میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر بڑی شفقت و عنایت رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بڑی باریک بینی کے ساتھ ان کی دقیق ترین ضروریات پر بھی نگاہ رکھتا ہے جن تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی اور انہیں اس طرح پورا کرتا ہے کہ وہ خود بھی محسوس نہیں کرتے کہ ہماری کون سی ضرورت کب کس نے پوری کر دی۔ پھر یہاں بندوں سے مراد محض اہل ایمان نہیں، بلکہ تمام بندے ہیں یعنی اللہ کا یہ لفظ اس کے سب بندوں پر عام ہے۔

لَطِیْفٌ: (۲۲/ ۶۳) 'لطیف'' ہے یعنی غیر محسوس طریقوں سے اپنے ارادے پورے کرنے والا ہے۔ اس کی تدبیریں ایسی ہوتی ہیں کہ لوگ ان کے آغاز میں کبھی ان کے انجام کا تصور تک نہیں کر سکتے، لاکھوں بچے دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، کون جان سکتا ہے کہ ان میں سے کون ابراہیم ہے جو تین چوتھائی دنیا کا روحانی پیشوا ہو گا اور کون چنگیز جو ایشیا اور یورپ کو تہ و بالا کر ڈالے گا۔ خوردبین جب ایجاد ہوئی تھی اس وقت کون تصور کر سکتا تھا کہ یہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم تک نوبت پہنچائے گی۔ کولمبس جب سفر کو نکل رہا تھا تو کسے معلوم تھا کہ یہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی بنا ڈالی جا رہی ہے۔ غرض خدا کے منصوبے ایسے ایسے دقیق اور ناقابل ادراک طریقوں سے پورے ہوتے ہیں کہ جب تک وہ تکمیل کو نہ پہنچ جائیں کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس چیز کے لئے کام ہو رہا ہے۔

اللَّغْو: (۲۳/ ۳) ''لغو'' ہر اس بات اور کام کو کہتے ہیں جو فضول، لایعنی اور لاحاصل ہو، جن باتوں یا کاموں کا کوئی فائدہ نہ ہو جن سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو جن کی کوئی حقیقی ضرورت نہ ہو، جن سے کوئی اچھا مقصد حاصل نہ ہو وہ سب ''لغویات'' ہیں۔

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُم: (۴۹/ ۱۱) اصل میں لفظ لمز استعمال ہوا ہے جس کے اندر طعن و تشنیع کے علاوہ متعدد دوسرے مفہومات بھی شامل ہیں، مثلاً چوٹیں کرنا، پھبتیاں کسنا، الزام دھرنا، اعتراض جڑنا، عیب چینی کرنا اور کھلم کھلا یا زیر لب یا اشاروں سے کسی کو نشانہ ملامت بنانا۔ یہ سب افعال چونکہ آپس کے تعلقات کو بگاڑتے اور معاشرے میں فساد برپا کرتے ہیں اس لیے ان کو حرام کر دیا گیا ہے۔ کلام الٰہی کی بلاغت یہ ہے کہ لا یلمز بعضکم بعضا، (ایک دوسرے پر طعن نہ کرو) کہنے کے بجائے لاتلمزو آ انفسکم (اپنے اوپر طعن نہ کرو) کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں جن سے خود بخود یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ دوسروں پر زبان طعن دراز کرنے والا در اصل خود اپنے آپ کو مطعون کرتا ہے۔

اللَّمَمَ: (۳۲/۵۳) اصل الفاظ ہیں الا اللمم۔ عربی زبان میں لمم کا لفظ کسی چیز کی تھوڑی مقدار، یا اس کے خفیف سے اثر یا اس کے محض قرب، یا اس کے ذرا سی دیر رہنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں الم بالمکان، وہ شخص فلاں جگہ تھوڑی دیر ہی ٹھیرا، یا تھوڑی دیر کے لئے ہی وہاں گیا، الم باطعام، اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ به لمم۔ اس کا دماغ ذرا سا کھسکا ہوا ہے، یا اس میں کچھ جنون کی لٹک ہے۔ یہ لفظ اس معنی میں بولتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک فعل کا ارتکاب تو نہیں کیا مگر ارتکاب کے قریب تک پہنچ گیا۔ فراء کا قول ہے کہ میں نے عربوں کو اس طرح کے فقرے بولتے سنا ہے۔ ضربه ما لمم القتل، فلاں شخص نے اسے اتنا مارا کہ بس مار ڈالنے کی کسر رہ گئی۔ اور الم یفعل، قریب تھا کہ فلاں شخص یہ فعل کر گزرتا۔ شاعر کہتا ہے، الممت فحیت ثم قامت فودعت۔ ”وہ بس ذرا کی ذرا آئی، سلام کیا، اٹھی اور رخصت ہو گئی“۔

فَأَلْهَمَهَا: (۹۱/۸) الہام کا لفظ لہم سے ہے جس کے معنی نگلنے کے ہیں۔ لهم الشیء والتهمه کے معنی ہیں فلاں شخص نے اس چیز کو نگل لیا اور الهمته الشیء کے معنی ہیں میں نے فلاں چیز اس کو نگلوادی یا اس کے حلق سے اتار دی۔ اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے الہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصور یا کسی خیال کو غیر شعوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اتار دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے، نفس انسانی پر اس کی بدی اور اس کی نیکی و پرہیز گاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی دونوں کے رجحانات و میلانات رکھ دیے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات ودیعت کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز برائی، اچھے اخلاق و اعمال اور برے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں، فجور (بدکرداری) ایک قبیح چیز ہے اور تقویٰ (برائیوں سے اجتناب) ایک اچھی چیز۔ یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ اسکی فطرت ان سے آشنا ہے اور خالق نے برے اور بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر اسکو عطا کر دی ہے یہی بات سورہ بلد میں فرمائی گئی ہے کہ ﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ اور ہم نے اس کو خیر و شر کے دونوں نمایاں راستے دکھادئے (آیت ۱۰) اسی کو سورہ دہر میں یوں بیان کیا گیا ہے، ﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ (ہم نے اس کو راستہ دکھادیا خواہ شاکر بن کر رہے یا کافر) (آیت ۳) اور اسی بات کو سورہ قیامہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نفس لوامہ (ضمیر) موجود ہے جو برائی کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے (آیت ۲) اور ہر انسان خواہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے مگر وہ اپنے آپ کو خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔

لَهْوَ الْحَدِيْثِ: (۳۱/۶) اصل الفاظ ہیں ”لهو الحدیث“ یعنی ایسی بات جو آدمی کو اپنے اندر مشغول کر کے ہر دوسری چیز سے غافل کر دے۔ لغت کے اعتبار سے تو ان الفاظ میں کوئی ذم کا پہلو نہیں ہے لیکن استعمال میں ان کا اطلاق بری، فضول اور بیہودہ باتوں پر ہی ہوتا ہے، مثلاً

گپ، خرافات، ہنسی مذاق، داستانیں، افسانے اور ناول، گانا بجانا اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔

اَلْھٰکُمْ: (۱۰۲/۱۳) الھکم لھو سے ہے جس کے اصل معنی غفلت کے ہیں لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ہر اس شغل کے لئے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اتنی بڑھ جائے کہ وہ اس میں منہمک ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے۔ اس مادے سے جب الہاکم کا لفظ بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کسی لہو نے تم کو اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ تمہیں کسی اور چیز کا جو اس سے اہم تر ہے، ہوش باقی نہیں رہا ہے۔ اسی کی دھن تم پر سوار ہے اسی کی فکر میں تم لگے ہوئے ہو اور اس انہماک نے تم کو بالکل غافل کر دیا ہے۔

قَومِ لُوط: (۷/۸۰) یہ قوم اس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج شرق اردن (Trans Jordan) کہا جاتا ہے اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے، بائبل میں اس قوم کے صدر مقام کا نام ''سدوم'' بتایا گیا ہے، جو یا تو بحیرہ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا یا اب بحیرہ مردار میں غرق ہو چکا ہے، تلمود میں لکھا ہے کہ سدوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے اور ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس باغ ہی باغ تھا جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہونے لگتی تھی۔ مگر آج اس قوم کا نام و نشان دنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرہ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے جسے آج تک بحر لوط کہا جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے، اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام و فلسطین و مصر میں گشت لگا کر دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے۔ اہل سدوم کو ان کی قوم اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ شاید ان کا رشتہ داری کا تعلق اسی قوم سے ہو گا۔

یہودیوں کی تحریف کردہ بائبل میں حضرت لوط کی سیرت پر جہاں اور بہت سے سیاہ دھبے لگائے گئے ہیں وہاں ایک دھبہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرت ابراہیم کو لے کر سدوم کے علاقے میں چلے گئے تھے، (پیدائش، باب ۱۳، آیت ۱۔۱۲) مگر قرآن اس غلط بیانی کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے انہیں رسول بنا کر اس قوم کی طرف بھیجا تھا۔

(م)

مَتَاعًا حَسَنًا : (۱۱/۳) دنیا کا سامان زیست قرآن مجید کی رو سے دو قسم کا ہے، ایک وہ سروسامان ہے جو خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو فتنے میں ڈالنے کے لیے دیا جاتا ہے اور جس سے دھوکہ کھا کر ایسے لوگ اپنے آپ کو دنیا پرستی و خدا فراموشی میں اور زیادہ گم کر دیتے ہیں یہ بظاہر تو نعمت ہے مگر بباطن خدا کی پھٹکار اور اس کے عذاب کا پیش خیمہ ہے، قرآن مجید اس کو ''متاع الغرور'' کے الفاظ سے یاد کرتا ہے، دوسرا وہ سروسامان ہے جس سے انسان خوشحال اور قوی بازو ہو کر اپنے خدا کا اور زیادہ شکر گزار بنتا ہے، خدا اور اس کے بندوں کے اور خود اپنے نفس کے حقوق زیادہ اچھی طرح ادا کرتا ہے، خدا کے دیے ہوئے وسائل سے طاقت پا کر دنیا میں خیر و صلاح کی ترقی اور شر و فساد کے استیصال کے لیے زیادہ کارگر کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہ قرآن کی زبان میں ''متاع حسن'' ہے۔

المَتِین: (۵۱/۵۸) اصل میں لفظ ''متین'' استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں مضبوط اور غیر متزلزل جسے کوئی ہلا نہ سکتا ہو۔

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ: (۴۲/۱۱) اصل الفاظ ہیں لیس کمثلہ شیء'' کوئی چیز اس کے مانند جیسی نہیں ہے۔'' مفسرین اور اہل لغت میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس میں لفظ مثل پر کاف (حرف تشبیہ) کا اضافہ محاورے کے طور پر کیا گیا ہے جس سے مقصود محض بات میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے اور عرب میں یہ طرز بیان رائج ہے، مثلاً شاعر کہتا ہے وقتلی کمثل جذوع النخل۔ اور ایک دوسرا شاعر کہتا ہے ما ان کمثلھم فی الناس من احد۔ بعض دوسرے حضرات کا قول یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں کہنے کے بجائے اس کے مثل جیسا کوئی نہیں کہنے میں مبالغہ ہے، مراد یہ ہے کہ اگر بفرض محال اللہ کا کوئی مثل ہوتا تو اس جیسا بھی کوئی نہ ہوتا، کجا کہ خود اللہ جیسا کوئی ہو۔

تَمَاثِیْل: (۳۴/۱۳) اصل لفظ تماثیل استعمال ہوا ہے جو تمثال کی جمع ہے۔ تمثال عربی زبان میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شئے کے مشابہ بنائی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان، کوئی درخت ہو یا پھول یا دریا یا کوئی دوسری بے جان چیز۔ التمثال اسم للشیء المصنوع مشبھا بخلق من اللہ (لسان العرب) ''تمثال نام ہے ہر اس مصنوعی چیز کا جو خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے مانند بنائی گئی ہو۔''۔ التمثال کل ما صور علی صورۃ غیرہ من حیوان وغیر حیوان۔ (تفسیر کشاف) ''تمثال ہر اس تصویر کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مماثل بنائی گئی ہو، خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان۔''

المَجِیْد : (۱/۵۰) "مجید" کا لفظ عربی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، ایک بلند مرتبہ، باعظمت، بزرگ اور صاحب عزت و شرف۔ دوسرے کریم، کثیر العطاء، بہت نفع پہنچانے والا۔ قرآن کے لئے یہ لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال فرمایا گیا ہے۔ قرآن اس لحاظ سے عظیم ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس کے مقابلے میں نہیں لائی جاسکتی۔ اپنی زبان اور ادب کے لحاظ سے بھی وہ معجزہ ہے اور اپنی تعلیم اور حکمت کے لحاظ سے بھی معجزہ۔ جس وقت وہ نازل ہوا تھا اس وقت بھی انسان اس کے مانند کلام بنا کر لانے سے عاجز تھے اور آج بھی عاجز ہیں۔ اس کی کوئی بات کبھی کسی زمانے میں غلط ثابت نہیں کی جاسکی ہے نہ کی جاسکتی ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہے نہ پیچھے سے حملہ آور ہو کر اسے شکست دے سکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ کریم ہے کہ انسان جس قدر زیادہ اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے اسی قدر زیادہ وہ اس کو رہنمائی دیتا ہے اور جتنی زیادہ اس کی پیروی کرے اتنی ہی زیادہ اسے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے فوائد و منافع کی کوئی حد نہیں ہے جہاں جا کر انسان اس سے بے نیاز ہو سکتا ہو، یا جہاں پہنچ کر اس کی نفع بخشی ختم ہو جاتی ہو۔

اَهلِ مَدْیَن: (۷/۸۵) مدین کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا مگر جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی، قدیم زمانہ میں جو تجارتی شاہ راہ بحر احمر کے کنارے یمن سے مکہ اور ینبوع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی اور دوسری تجارتی شاہ راہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی، اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں واقع تھیں، اسی بنا پر عرب کا بچہ بچہ مدین سے واقف تھا اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی، کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات دن اس کے آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔

اہل مدین کے متعلق ایک اور ضروری بات جس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے، یہ ہے کہ یہ لوگ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مدیان کی طرف منسوب ہیں جو ان کی تیسری بیوی قطوراء کے بطن سے تھے، قدیم زمانہ کے قاعدے کے مطابق جو لوگ کسی بڑے آدمی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے اور وہ رفتہ رفتہ اسی کی آل اولاد میں شمار ہو کر بنی فلاں کہلانے لگتے تھے۔ اسی قاعدے پر عرب کی آبادی کا بڑا حصہ بنی اسماعیل کہلایا اور اولاد یعقوب کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہونے والے لوگ سب کے سب بنی اسرائیل کے جامع نام کے تحت کھپ گئے۔ اسی طرح مدین یا مدیان مشہور ہو گیا، اس تاریخی حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ اس قوم کو دین حق کی آواز پہلی مرتبہ حضرت شعیب کے ذریعہ سے پہنچی تھی، درحقیقت بنی اسرائیل کی طرح ابتداءً وہ بھی مسلمان ہی تھے اور شعیب علیہ السلام کے

ظہور کے وقت ان کی حالت ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم کی سی تھی جیسی ظہور موسیٰ علیہ السلام کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد چھ سات سو برس تک مشرک اور بداخلاق قوموں کے درمیان رہتے رہتے یہ لوگ شرک بھی سیکھ گئے تھے اور بداخلاقیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے، مگر اس کے باوجود ایمان کا دعویٰ اور اس پر فخر برقرار تھا۔

اِمْرَاَةُ عِمْرَان: (۳/۳۵) اگر عمران کی عورت سے مراد ''عمران کی بیوی'' لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ وہ عمران نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے بلکہ یہ حضرت مریم کے والد تھے جن کا نام شاید عمران ہو گا۔ (مسیحی روایات میں حضرت مریم کے والد کا نام یوآخیم Ioachim لکھا ہے) اور اگر عمران کی عورت سے مراد آل عمران کی عورت لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت مریم کی والدہ اس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں، لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ معلومات نہیں ہے جس سے ہم قطعی طور پر ان دونوں معنوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکیں کیونکہ تاریخ میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ حضرت مریم کے والد کون تھے اور ان کی والدہ کس قبیلے کی تھیں۔ البتہ اگر یہ روایت صحیح مانی جائے کہ حضرت یحییٰ کی والدہ اور حضرت مریم کی والدہ آپس میں رشتہ کی بہنیں تھیں تو پھر ''عمران کی عورت'' کے معنی قبیلہ عمران کی عورت ہی درست ہوں گے، کیونکہ انجیل لوقا میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے کہ حضرت یحییٰ کی والدہ حضرت ہارون کی اولاد سے تھیں۔ (لوقا: ۱:۵)

مَارِجٍ مِّن نَّار: (۵۵/۱۵) اصل الفاظ ہیں من مارج من نار۔ نار سے مراد ایک خاص نوعیت کی آگ ہے نہ کہ وہ آگ جو لکڑی یا کوئلہ جلانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور مارج کے معنی ہیں خالص شعلہ جس میں دھواں نہ ہو۔ اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پہلا انسان مٹی سے بنایا گیا، پھر تخلیق کے مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے اس کالبد خاکی نے گوشت پوست کے زندہ بشر کی شکل اختیار کی اور آگے اس کی نسل نطفہ سے چلی، اسی طرح پہلا جن خالص آگ کے شعلے، یا آگ کی لپٹ سے پیدا کیا گیا اور بعد میں اس کی ذریت سے جنوں کی نسل پیدا ہوئی۔ اس پہلے جن کی حیثیت جنوں کے معاملے میں وہی ہے جو آدم علیہ السلام کی حیثیت انسانوں کے معاملہ میں ہے۔ زندہ بشر بن جانے کے بعد حضرت آدم اور ان کی نسل سے پیدا ہونے والے انسانوں کے جسم کو اس مٹی سے کوئی مناسبت باقی نہ رہی جس سے ان کو پیدا کیا گیا تھا۔ اگرچہ اب بھی ہمارا جسم پورا کا پورا زمین ہی کے اجزاء سے مرکب ہے لیکن ان اجزاء نے گوشت پوست اور خون کی شکل اختیار کر لی اور جان پڑنے کے بعد وہ تودہ خاک کی بہ نسبت ایک بالکل ہی مختلف چیز بن گیا ہے۔ ایسا ہی معاملہ جنوں کا بھی ہے۔ ان کا وجود بھی اصلاً ایک آتشیں وجود ہی ہے لیکن جس طرح ہم محض تودہ خاک نہیں ہیں اسی طرح وہ بھی محض شعلہ آتش نہیں ہیں۔

ذُوْ مِرَّةٍ: (۵۳/۶) اصل میں لفظ ذو مرۃ استعمال فرمایا گیا ہے۔ ابن عباس اور قتادہ اس

کو خوبصورت اور شاندار کے معنی میں لیتے ہیں۔ مجاہد، حسن بصری، ابن زید اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ اس کے معنی طاقت ور کے ہیں۔ سعید بن مسیب کے نزدیک اس سے مراد صاحب حکمت ہے۔ حدیث میں نبی علیہ ﷺ کا ارشاد ہے: لاتحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی۔ اس ارشاد میں ذومرة کو آپ نے تندرست اور صحیح القویٰ کے معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ عربی محاورے میں یہ لفظ نہایت صائب الرائے اور عاقل و دانا کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں جبریل علیہ السلام کے لیے یہ جامع لفظ اسی لیے منتخب فرمایا ہے کہ ان میں عقلی اور جسمانی، دونوں طرح کی قوتوں کا کمال پایا جاتا ہے۔ اردو زبان میں کوئی لفظ ان تمام معنوں کا جامع نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم نے ترجمے میں اس کے صرف ایک معنی کو اختیار کیا ہے، کیونکہ جسمانی قوتوں کے کمال کا ذکر اس سے پہلے کے فقرے میں آچکا ہے۔

تَتَمَارٰی: (۵۵/۵۳) اصل میں لفظ تتماریٰ استعمال ہوا ہے جس کے معنی شک کرنے کے بھی ہیں اور جھگڑنے کے بھی۔

حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ: (۵/۱۱۱) جو رسی اس کی گردن میں ڈالی جائے گی اس کیلئے حبل من مسد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں یعنی وہ رسی مسد کی قسم سے ہو گی اس کے مختلف معنی اہل لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ خوب مضبوط بٹی ہوئی رسی کو مسد کہتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کھجور کی چھال سے بنی ہوئی رسی کیلئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں مونجھ کی رسی یا اونٹ کی کھال یا اس کے صوف سے بنی ہوئی رسی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد لوہے کے تاروں سے بٹی ہوئی رسی ہے۔

خِتٰمُہٗ مِسْکٌ: (۲۶/۸۳) اصل الفاظ ہیں ختامہ مسک۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جن برتنوں میں وہ شراب رکھی ہو گی ان پر مٹی یا موم کے بجائے مشک کی مہر ہو گی۔ اس مفہوم کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ شراب کی ایک نفیس ترین قسم ہو گی جو نہروں میں بہنے والی شراب سے اشرف و اعلیٰ ہو گی اور اسے جنت کے خدام مشک کی مہر لگے ہوئے برتنوں میں لا کر اہل جنت کو پلائیں گے۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شراب جب پینے والوں کے حلق سے اترے گی تو آخر میں ان کو مشک کی خوشبو محسوس ہو گی۔ یہ کیفیت دنیا کی شرابوں کے بالکل برعکس ہے جن کی بوتل کھلتے ہی بو کا ایک بھپکا ناک میں آتا ہے، پیتے ہوئے بھی ان کی بدبو محسوس ہوتی ہے اور حلق سے جب وہ اترتی ہے تو دماغ تک اس کی سڑاند پہنچ جاتی ہے جس کی وجہ سے بدمزگی کے آثار ان کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں۔

مَطَر: (۱۷۳/۲۶) اس بارش سے مراد پانی نہیں ہے بلکہ پتھروں کی بارش ہے۔

المَاعُون: (۷/۱۰۷) اصل میں لفظ ماعون استعمال ہوا ہے۔ حضرت علی، ابن عمر، سعید بن جبیر، قتادہ، حسن بصری، محمد بن حنفیہ، ضحاک، ابن زید، عکرمہ، مجاہد، عطاء اور زہری رحمھم اللہ کا

قول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے، ابن عباس، ابن مسعودؓ، ابراہیم نخعی ابو مالک اور بہت سے دوسرے حضرات کا قول ہے کہ اس سے مراد عام ضرورت کی اشیاء مثلاً ہنڈیا، ڈول، کلہاڑی، ترازو، نمک، پانی۔ آگ، چقماق (جس کی جانشین اب دیا سلائی ہے) وغیرہ ہیں جو عموماً لوگ ایک دوسرے سے عاریۃً مانگتے رہتے ہیں۔ سعید بن جبیر اور مجاہد کا بھی ایک قول اسی کی تائید میں ہے۔ حضرت علیؓ کا بھی ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ بھی ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی عام ضروریات کی چیزیں بھی۔ عکرمہ سے ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ ماعون کا اعلیٰ مرتبہ زکوٰۃ اور ادنیٰ ترین مرتبہ یہ ہے کہ کسی کو چھلنی، ڈول یا سوئی عاریۃً دی جائے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب محمد ﷺ یہ کہا کرتے تھے (اور بعض روایات میں ہے کہ حضور کے عہد مبارک میں یہ کہا کرتے تھے) کہ ماعون سے مراد ہنڈیا، کلہاڑی، ڈول، ترازو اور ایسی ہی دوسری چیزیں مستعار دینا ہے (ابن جریر، ابن شیبہ، ابو داؤد، نسائی، بزار، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی فی الاوسط، ابن مردویہ، بیہقی فی السنن)۔ سعد بن عیاض ناموں کی تصریح کے بغیر قریب قریب یہی قول رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے نقل کرتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے متعدد صحابہ سے یہ بات سنی تھی) ابن جریر ابن ابی شیبہ) دیلمی، ابن عساکر اور ابو نعیم نے حضرت ابو ہریرہ کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی یہ تفسیر بیان فرمائی کہ اس سے مراد کلہاڑی اور ڈول اور ایسی ہی دوسری چیزیں ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو غالباً یہ دوسرے لوگوں کے علم میں نہ آئی ہوگی۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ پھر کوئی شخص اس آیت کی کوئی اور تفسیر کرتا۔

اصل بات یہ ہے کہ ماعون چھوٹی اور قلیل چیز کو کہتے ہیں جس میں لوگوں کے لئے کوئی منفعت یا فائدہ ہو۔ اس معنی کے لحاظ سے زکوٰۃ بھی ماعون ہے، کیوں کہ وہ بہت سے مال میں سے تھوڑا سا مال ہے جو غریبوں کی مدد کے لئے دینا ہوتا ہے اور وہ دوسری عام ضرورت کی اشیاء بھی ماعون ہیں جن کا ذکر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور ان کے ہم خیال حضرات نے کیا ہے۔ اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ ماعون کا اطلاق ان تمام چھوٹی چیزوں پر ہوتا ہے جو عادتاً ہمسایے ایک دوسرے سے مانگتے رہتے ہیں۔ ان کا مانگنا کوئی ذلت کی بات نہیں ہوتا، کیونکہ غریب اور امیر سب ہی کو کسی نہ کسی وقت ان کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ البتہ ایسی چیزوں کو دینے سے بخل برتنا اخلاقاً ایک ذلیل حرکت سمجھا جاتا ہے۔ عموماً ایسی چیزیں بجائے خود باقی رہتی ہیں اور ہمسایہ ان سے کام لے کر انہیں جوں کا توں واپس دے دیتا ہے۔ اسی ماعون کی تعریف میں یہ بھی آتا ہے کہ کسی کے ہاں مہمان آجائیں اور وہ ہمسائے سے چارپائی یا بستر مانگ لے۔ یا کوئی اپنے ہمسائے کے تنور میں اپنی روٹی پکا لینے کی اجازت مانگے۔ یا کوئی کچھ دنوں کے لئے باہر جا رہا ہو اور حفاظت کے لئے اپنا کوئی قیمتی سامان دوسرے کے ہاں رکھوانا چاہے۔ پس آیت کا مقصود یہ بتانا ہے کہ آخرت

کاانکار آدمی کو اتنا تنگ دل بنادیتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے معمولی ایثار کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔

مَكْرَاللّٰه: (۷/۹۹) اصل میں لفظ مکر استعمال ہوا ہے جس کے معنی عربی زبان میں خفیہ تدبیر کے ہیں، یعنی کسی شخص کے خلاف ایسی چال چلنا کہ جب تک اس پر فیصلہ کن ضرب نہ پڑ جائے اس وقت تک اسے خبر نہ ہو کہ اس کی شامت آنے والی ہے، بلکہ ظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے وہ یہ سمجھتا رہے کہ سب اچھا ہے۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ: (۲۳/۶) رہا لفظ ما ملکت ایمانهم، تو عربی زبان کے محاورے اور قرآن کے استعمالات دونوں اس پر شاہد ہیں کہ اس کا اطلاق لونڈی پر ہوتا ہے یعنی وہ عورت جو آدمی کی ملک میں ہو۔

المَلَائِكَة: (۲/۳۰) ملک کے اصل معنی عربی میں "پیامبر" کے ہیں، اسی کا لفظی ترجمہ فرستادہ یا فرشتہ ہے۔ یہ محض مجرد قوتیں نہیں ہیں، جو تشخص نہ رکھتی ہوں بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں جن سے اللہ اپنی اس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے، یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ سلطنت الٰہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں، جاہل لوگ انہیں غلطی سے خدائی میں حصہ دار سمجھ بیٹھے اور بعض نے انہیں خدا کا رشتہ دار سمجھا اور ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔

المُلْک: (۲/۲۵) اصل میں لفظ ملک استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں بادشاہی، اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت (Sovereignity) کے لئے بولا جاتا ہے۔

المَلِکُ: (۵۹/۲۳) اصل میں لفظ الملک استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل بادشاہ وہی ہے نیز مطلقاً الملک کا لفظ استعمال کرنے سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ کسی خاص علاقے یا مخصوص مملکت کا نہیں بلکہ سارے جہان کا بادشاہ ہے۔ پوری کائنات پر اس کی سلطانی و فرمانروائی محیط ہے، ہر چیز کا وہ مالک ہے۔ ہر شئے اس کے تصرف اور اقتدار اور حکم کی تابع ہے اور اس کی حاکمیت (Sovereignty) کو محدود کرنے والی کوئی شئے نہیں ہے۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کے ان سارے پہلوؤں کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: ﴿وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ (الروم: ۲۶) "زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں اس کے مملوک ہیں سب اس کے تابع فرمان ہیں۔" ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (السجدہ: ۵) "آسمان سے زمین تک وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے"۔ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ (الحدید: ۵) "زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملات رجوع کیے جاتے ہیں"۔ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ﴾ (الفرقان) "بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے"۔ ﴿بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (یٰس: ۸۳) "ہر چیز کی

سلطانی و فرمانروائی اسی کے ہاتھ میں ہے"۔ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ (البروج:١٦) "جس چیز کا ارادہ کرے اسے کر گزرنے والا۔" ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبیاء:٢٣) "جو کچھ وہ کرے اس پر وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں"۔ ﴿وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ﴾ (الرعد:٤١) "اور اللہ فیصلہ کرتا ہے، کوئی اس کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے۔" ﴿وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾ (المومنون:٨٨) "اور وہ پناہ دیتا ہے اور کوئی اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دے سکتا۔" ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (آل عمران:٢٦) "کہو خدایا، ملک کے مالک، تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

ان توضیحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی حاکمیت کے کسی محدود یا مجازی مفہوم میں نہیں بلکہ اس کے پورے مفہوم میں، اس کے مکمل تصور کے لحاظ سے حقیقی بادشاہی ہے بلکہ درحقیقت حاکمیت جس چیز کا نام ہے وہ اگر کہیں پائی جاتی ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی بادشاہی میں ہی پائی جاتی ہے اس کے سوا اور جہاں بھی اس کے ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے خواہ وہ کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر کی ذات ہو یا کوئی طبقہ یا گروہ یا خاندان ہو، یا کوئی قوم ہو، اسے فی الواقع کوئی حاکمیت حاصل نہیں ہے کیونکہ حاکمیت سرے سے اس حکومت کو کہتے ہی نہیں ہیں جو کسی کا عطیہ ہو جو کبھی ملتی ہو اور کبھی سلب ہو جاتی ہو، جسے کسی دوسری طاقت سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہو جس کا قیام و بقاء عارضی و وقتی ہو اور جس کے دائرہ اقتدار کو بہت سی دوسری متصادم قوتیں محدود کرتی ہوں۔

لیکن قرآن مجید صرف یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کائنات کا بادشاہ ہے بلکہ بعد کے فقروں میں یہ تصریح کرتا ہے کہ وہ ایسا بادشاہ ہے جو قدوس ہے، سلام ہے، مومن ہے، مہیمن ہے، عزیز ہے، جبار ہے، متکبر ہے، خالق ہے باری ہے اور مصور ہے۔

المُلْکُ: (١/٦٧) الملک کا لفظ چونکہ مطلقاً استعمال ہوا ہے اس لیے اسے کسی محدود معنوں میں نہیں لیا جا سکتا، لامحالہ اس سے مراد تمام موجوداتِ عالم پر شاہانہ اقتدار ہی ہو سکتا ہے اور اسکے ہاتھ میں اقتدار ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جسمانی ہاتھ رکھتا ہے بلکہ یہ لفظ محاورہ کے طور پر قبضہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی کی طرح ہماری زبان میں جب بھی یہ کہتے ہیں کہ اختیارات فلاں کے ہاتھ میں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہی سارے اختیارات کا مالک ہے کسی دوسرے کا اس میں دخل نہیں ہے۔

مَلَکُوت: (٢٣/٨٨) اصل میں لفظ ملکوت استعمال ہوا ہے جس میں ملک (بادشاہی) اور مِلک (مالکیت) دونوں مفہوم شامل ہیں اور اس کے ساتھ یہ انتہائی مبالغہ کا صیغہ ہے۔

مُلْکًا عَظِیمًا: (٤/٥٤) "ملک عظیم" سے مراد دنیا کی امامت و رہنمائی اور اقوام عالم پر

قائدانہ اقتدار ہے جو کتاب اللہ کا علم پانے اور اس علم و حکمت کے مطابق عمل کرنے سے لازماً حاصل ہوتا ہے۔

یَمْلِکُ: (۷۷/۴۳) مالک سے مراد ہے جہنم کا داروغہ جیسا کہ فحوائے کلام سے خود ظاہر ہو رہا ہے۔

مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ: (۱۶۱/۶) "ابراہیم کا طریقہ" یہ اس راستے کی نشان دہی کے لئے مزید ایک تعریف ہے، اگرچہ اس کو موسیٰ کا طریقہ یا عیسیٰ کا طریقہ بھی کہا جا سکتا تھا مگر حضرت موسیٰ کی طرف دنیا نے یہودیت اور حضرت عیسیٰ کی طرف مسیحیت کو منسوب کر رکھا ہے، اور وہ دونوں یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ یہودیت اور عیسائیت کی پیدائش سے بہت پہلے گزر چکے تھے، نیز مشرکین عرب بھی ان کو راست رو مانتے تھے اور اپنی جہالت کے باوجود کم از کم اتنی بات انہیں بھی تسلیم تھی کہ کعبہ کی بنا رکھنے والا پاکیزہ انسان خالص خدا پرست تھا نہ کہ بت پرست۔

مَنٰوةَ: (۲۰/۵۳) مناۃ کا استھان مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر احمر کے کنارے قدید کے مقام پر تھا اور خاص طور پر خزاعہ اور اوس اور خزرج کے لوگ اس کے بہت معتقد تھے۔ اس کا حج اور طواف کیا جاتا اور اس پر نذر کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔۔ زمانہ حج میں جب حجاج طواف بیت اللہ اور عرفات اور منیٰ سے فارغ ہو جاتے تو وہیں سے مناۃ کی زیارت کے لیے لبیک لبیک کی صدائیں بلند کر دی جاتیں اور جو لوگ اس دوسرے "حج" کی نیت کر لیتے وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہ کرتے تھے۔

لَامَمْنُوعَة: (۳۳/۵۶) لاممنوعہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے باغوں کی طرح وہاں کوئی روک ٹوک نہ ہو گی، نہ پھلوں کے توڑنے اور کھانے میں کوئی امر مانع ہو گا کہ درختوں پر کانٹے ہونے یا زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے توڑنے میں کوئی زحمت پیش آئے۔

اَلْمَنَّ وَالسَّلْوٰی: (۵۷/۲) من اور سلویٰ وہ قدرتی غذائیں تھیں جو اس مہاجرت کے زمانے میں ان لوگوں کو چالیس برس تک مسلسل ملتی رہیں۔ من دھنئے کے بیج جیسی ایک چیز تھی جو اوس کی طرح گرتی اور زمین پر جم جاتی تھی۔ اور سلویٰ بٹیر کی قسم کے پرندے تھے، خدا کے فضل سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم محض انہی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اٹھانی پڑی، حالانکہ آج کسی نہایت متمدن ملک میں بھی اگر چند لاکھ مہاجر یکایک آ پڑیں تو ان کی خوراک کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے۔ (من اور سلویٰ کی تفصیلی کیفیت کے لئے ملاحظہ ہو بائیبل، کتاب خروج، باب ۱۶، گنتی، باب ۱۱، آیت ۷۔۹۔ و ۳۱، ۳۲ و یشوع، باب ۵ آیت ۱۲)

غَيْرُ مَمْنُوْنٍ: (۸/۴۱) اصل میں اجر غیر ممنون کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے دو معنی اور بھی ہیں، ایک یہ کہ وہ ایسا اجر ہو گا جس میں کبھی کوئی کمی نہ آئے گی۔ دوسرے یہ کہ

وہ اجر احسان جتا جتا کر نہیں دیا جائے گا جیسے کہ بخیل کا عطیہ ہوتا ہے کہ اگر وہ جی کڑا کر کے کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو بار بار اس کو جتاتا ہے۔

تَمَنّٰی : (۵۲/۲۲) تمنا کا لفظ اگر پہلے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ شیطان نے اس کی آرزو پوری ہونے میں رخنے ڈالے اور رکاوٹیں پیدا کیں۔ دوسرے معنی میں لیا جائے گو مراد یہ ہوگی کہ جب بھی اس نے کلام الٰہی لوگوں کو سنایا، شیطان نے اس کے بارے میں طرح طرح کے شبہے اور اعتراضات پیدا کیے، عجیب عجیب معنی اس کو پہنائے اور ایک صحیح مطلب کے سوا ہر طرح کے الٹے سیدھے مطلب لوگوں کو سمجھائے۔

اَلْمُھْل: (۲۹/۱۸) لغت میں مہل کے مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں۔ بعض اس کے معنی تیل کی تلچھٹ بتاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ لاوے کے معنی میں آتا ہے یعنی زمین کے وہ مادے جو شدت حرارت سے پگھل گئے ہوں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد پگھلی ہوئی دھات ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی پیپ اور لہو کے ہیں۔

مَیْتًا: (۱۲۲/۶) یہاں موت سے مراد جہالت و بے شعوری کی حالت ہے، اور زندگی سے مراد علم وادراک اور حقیقت شناسی کی حالت، جس شخص کو صحیح اور غلط کی تمیز نہیں اور جسے معلوم نہیں کہ راہ راست کیا ہے وہ طبعیات کے نقطہ نظر سے چاہے ذی حیات ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو انسانیت کی زندگی میسر نہیں ہے، وہ زندہ حیوان تو ضرور ہے مگر زندہ انسان نہیں، زندہ انسان درحقیقت صرف وہ شخص ہے جسے حق اور باطل، نیکی اور بدی، راستی اور ناراستی کا شعور حاصل ہے۔

اَلْمَیْتَۃ: (۳/۵) یعنی وہ جانور جو طبعی موت مر گیا ہو۔

تَمُوْرُ: (۹/۵۲) اصل الفاظ ہیں تمور السماء موراً۔ مور عربی زبان میں گھومنے، اونٹنے، پھڑکنے، جھوم جھوم کر چلنے، چکر کھانے اور بار بار حرکت کرنے کے لئے بولا جاتا ہے، قیامت کے دن آسمان کی جو حالت ہو گی اسے ان الفاظ میں بیان کر کے یہ تصور دلایا گیا ہے کہ اس روز عالم بالا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور دیکھنے والا جب آسمان کی طرف دیکھے گا تو اسے یوں محسوس ہو گا کہ وہ جما جمایا نقشہ جو ہمیشہ ایک ہی شان سے نظر آتا تھا، بگڑ چکا ہے اور ہر طرف ایک اضطراب برپا ہے

موسیٰ: (۱۰/۲۸) بائیبل اور تلمود سے معلوم ہوا ہے کہ بچے کا نام "موسیٰ" فرعون کے گھر رکھا گیا تھا۔ یہ عبرانی زبان کا نہیں بلکہ قبطی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "میں نے اسے پانی سے نکالا"۔ قدیم مصری زبان سے بھی حضرت موسیٰ کے نام کی یہ تخریج صحیح ثابت ہوتی ہے۔ اس زبان میں "مو" پانی کو کہتے ہیں اور "اوشے" کا مطلب تھا "بچایا ہوا"۔

(ن)

النَّاس: (۶/۱۱۴) ناس اور انس اور انسان کے الفاظ لغت ہی کے اعتبار سے لفظ جن کی ضد ہیں۔ جن کے اصل معنی پوشیدہ مخلوق کے ہیں اور جن کو جن اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی آنکھوں سے مخفی ہے۔ اس کے برعکس ناس اور انس کے الفاظ انسان کیلئے بولے ہی اس بنا پر جاتے ہیں کہ وہ ظاہر اور مرئی اور محسوس ہے۔ سورہ قصص آیت ۲۹ میں ہے ﴿آنَسَ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ نَارًا﴾۔ یہاں آنس کے معنی رائی ہیں، یعنی حضرت موسیٰ نے کوہ طور کے کنارے آگ دیکھی۔ سورہ نساء آیت ۶ میں ہے ﴿فَاِنۡ آنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا﴾۔ ''اگر تم محسوس کرو کہ یتیم بچے اب ہوشمند ہوگئے ہیں''۔ یہاں آنستم کے معنی اَحۡسَنۡتُمۡ یا رأیتم ہیں۔ پس ناس کا اطلاق لغت عرب کی رو سے جنوں پر نہیں ہو سکتا۔

لَیُنۡبَذَنَّ: (۴/۱۰۴) اصل میں لینبذن فرمایا گیا ہے۔ نبذ عربی زبان میں کسی کو بے وقعت اور حقیر سمجھ کر پھینک دینے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اپنی مالداری کی وجہ سے وہ دنیا میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہے لیکن قیامت کے روز اسے حقارت کے ساتھ جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

نَبِیًّا: (۵۱/۱۹) ''نبی'' کے معنی میں اہل لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو لفظ نبا سے مشتق قرار دیتے ہیں جس کے معنی خبر کے ہیں اور اس اصل کے لحاظ سے نبی کے معنی ''خبر دینے والے'' کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ نبو ہے یعنی رفعت اور بلندیاں اور اس کے معنی کے لحاظ سے نبی کا مطلب ہے ''بلند مرتبہ'' اور عالی مقام، ازہری نے کسائی سے ایک تیسرا قول بھی نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل نبی ہے جس کے معنی طریق اور راستے کے ہیں، اور انبیاء کو نبی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف جانے کا راستہ ہیں۔

پس کسی شخص کو رسول نبی کہنے کا مطلب یا تو ''عالی پیغمبر'' ہے، یا ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبریں دینے والا پیغمبر'' یا پھر ''وہ پیغمبر جو اللہ کا راستہ بتانے والا ہے''۔

رسول و نبی کا فرق: قرآن مجید میں یہ دونوں الفاظ بالعموم ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی شخصیت کو کہیں صرف رسول کہا گیا ہے اور کہیں صرف نبی اور کہیں رسول اور نبی ایک ساتھ لیکن بعض مقامات پر رسول اور نبی کے الفاظ اس طرح بھی استعمال ہوئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مرتبے یا کام کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی اصطلاحی فرق ہے۔ مثلاً سورہ حج، رکوع ۷، میں فرمایا ﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّا.....﴾ ''ہم نے تم

سے پہلے نہیں بھیجا کوئی رسول اور نہ نبی مگر۔۔۔۔۔" یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ رسول اور نبی دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں جن کے درمیان کوئی معنوی فرق ضرور ہے۔ اسی بنا پر اہل تفسیر میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ اس فرق کی نوعیت کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قطعی دلائل کے ساتھ کوئی بھی رسول اور نبی کی الگ الگ حیثیتوں کا تعین نہیں کر سکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ نبی کی بہ نسبت خاص ہے یعنی ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے، مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا، یا الفاظ دیگر انبیاء میں سے رسول لفظ ان جلیل القدر ہستیوں کے لیے بولا گیا ہے جن کو عام انبیاء کی بہ نسبت زیادہ اہم منصب سپرد کیا گیا تھا۔ اسی کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمد نے حضرت ابوامامہ سے اور حاکم نے حضرت ابوذر سے نقل کی ہے کہ نبی ﷺ سے رسولوں کی تعداد پوچھی گئی تو آپ نے ۳۱۳ یا ۳۱۵ بتائی اور انبیاء کی تعداد پوچھی گئی تو آپ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی۔ اگرچہ اس حدیث کی سندیں ضعیف ہیں مگر کئی سندوں سے ایک بات کا نقل ہونا اس کے ضعف کو بڑی حد تک دور کر دیتا ہے۔

النَّجْمُ: (۶/۵۵) اصل میں لفظ النجم استعمال ہوا ہے جس کے معروف اور متبادر معنی تارے کے ہیں لیکن لغت عرب میں یہ لفظ ایسے پودوں اور بیل بوٹوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے جن کا تناسب نہیں ہوتا۔ مثلاً ترکاریاں، خربوزے، تربوز وغیرہ۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ یہاں یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، سدی اور سفیان ثوری اس کو بے تنے والی نباتات کے معنی میں لیتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد لفظ الشجر (درخت) استعمال فرمایا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہی معنی زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے مجاہد، قتادہ اور حسن بصری کہتے ہیں کہ نجم سے مراد یہاں بھی زمین کے بوٹے نہیں بلکہ آسمان کے تارے ہیں کیونکہ یہی اس کے معروف معنی ہیں، اس لفظ کو سن کر سب سے پہلے آدمی کا ذہن اسی معنی کی طرف جاتا ہے اور شمس و قمر کے بعد تاروں کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا، لیکن ہمارے نزدیک حافظ ابن کثیر کی یہ رائے صحیح ہے کہ زبان اور مضمون دونوں کے لحاظ سے دوسرا مفہوم زیادہ قابل ترجیح نظر آتا ہے۔ قرآن میں ایک دوسرے مقام پر بھی نجوم اور شجر کے سجدہ ریز ہونے کا ذکر آیا ہے اور وہاں نجوم کو تاروں کے سوا اور کسی معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ........ ﴾ (الحج۔۱۸) "یہاں نجوم کا ذکر شمس و قمر کے ساتھ ہے اور شجر کا ذکر پہاڑوں اور جانوروں کے ساتھ، اور فرمایا گیا ہے کہ یہ سب اللہ کے آگے سجدہ ریز ہیں۔"

النَّجْمُ: (۱/۵۳) اصل میں لفظ "النجم" استعمال ہوا ہے۔ ابن عباس، مجاہد اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ اس سے مراد ثریا (Pleiades) ہے۔ ابن جریر اور زمخشری نے اسی قول کو ترجیح دی

ہے، کیونکہ عربی زبان میں جب مطلقاً النجم بولا جاتا ہے تو عموماً اس سے ثریا ہی مراد لیا جاتا ہے، سدی کہتے ہیں کہ اس سے مراد زہرہ (Venus) ہے۔ اور ابو عبیدہ نحوی کا قول ہے کہ یہاں النجم بول کر جنس نجوم مراد لی گئی ہے، یعنی مطلب یہ ہے کہ جب صبح ہوئی اور سب ستارے غروب ہو گئے۔ موقع و محل کے لحاظ سے ہمارے نزدیک یہ آخری قول زیادہ قابل ترجیح ہے۔

نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ: (۱۹/۵۴) یعنی ایک ایسے دن جس کی نحوست کئی روز تک مسلسل جاری رہی۔ سورہ حم السجدہ، آیت ۱۶ میں فی ایام نحسات کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور سورہ الحاقہ آیت ۷ میں فرمایا گیا ہے کہ ہوا کا یہ طوفان مسلسل سات رات اور آٹھ دن جاری رہا۔ مشہور ہے کہ جس دن یہ عذاب شروع ہوا وہ بدھ کا دن تھا۔ اسی سے لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ بدھ کا دن منحوس ہے اور کوئی کام اس دن شروع نہ کرنا چاہیے۔ بعض نہایت ضعیف احادیث بھی اس سلسلے میں نقل کی گئی ہیں جن سے اس دن کی نحوست کا عقیدہ عوام کے ذہن میں بیٹھ گیا ہے۔ مثلاً ابن مردویہ اور خطیب بغدادی کی یہ روایت کہ آخر اربعاء فی الشهر یوم نحس مستمر (مہینے کا آخری بدھ منحوس ہے جس کی نحوست مسلسل جاری رہتی ہے)۔ ابن جوزی اسے موضوع کہتے ہیں۔ ابن رجب نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ حافظ سخاوی کہتے ہیں کہ جتنے طریقوں سے یہ منقول ہوئی ہے وہ سب واہی ہیں۔ اسی طرح طبرانی کی اس روایت کو بھی محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے کہ یوم الاربعاء یوم نحس مستمر (بدھ کا دن پیہم نحوست کا دن ہے)۔ بعض اور روایات میں یہ باتیں بھی مروی ہیں کہ بدھ کو سفر نہ کیا جائے، لین دین نہ کیا جائے۔ ناخن نہ کٹوائے جائیں، مریض کی عیادت نہ کی جائے اور یہ کہ جذام اور برص اسی روز شروع ہوتے ہیں۔ مگر یہ تمام روایات ضعیف ہیں اور ان پر کسی عقیدے کی بنا نہیں رکھی جاسکتی۔ محقق مناوی کہتے ہیں:
توقی الاربعاء علی جهة الطيرة وظن اعتقاد المنجمين حرام شديد التحريم، اذا الايام كلها لله تعالىٰ، لا تنفع لا تضر بذاتها، ”بدفالی کے خیال سے بدھ کے دن کو منحوس سمجھ کر چھوڑنا اور نجومیوں سے اعتقادات اس باب میں رکھنا حرام ہے، سخت حرام ہے کیونکہ سارے دن اللہ کے ہیں، کوئی دن بذات خود نہ نفع پہچانے والا ہے نہ نقصان،“ علامہ آلوسی کہتے ہیں ”سارے دن یکساں ہیں بدھ کی کوئی تخصیص نہیں۔ رات دن میں کوئی گھڑی ایسی نہیں ہے جو کسی کے لئے اچھی اور کسی دوسرے کے لیے بری ہو۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کسی کے لیے موافق اور کسی کے لئے ناموافق حالات پیدا کرتا رہتا ہے“۔

نُحَاسٌ: (۳۵/۵۵) نحاس اس خالص دھوئیں کو کہتے ہیں جس میں شعلہ نہ ہو۔

نَذِیراً: (۱/۲۵) یعنی خبردار کرنے والا، متنبہ کرنے والا، غفلت اور گمراہی کے برے نتائج سے ڈرانے والا۔ اس سے مراد ”فرقان“ بھی ہو سکتا ہے اور وہ ”بندہ“ بھی جس پر فرقان نازل کیا گیا۔ الفاظ ایسے جامع ہیں کہ دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں، اور حقیقت کے اعتبار سے چونکہ دونوں

ایک ہیں اور ایک ہی کام کے لیے بھیجے گئے ہیں، اس لیے کہنا چاہیے کہ دونوں ہی مراد ہیں۔
نَذْر: (۲/۲۷۰) نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے بر آنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اوپر لازم کرلے، جو اس کے ذمے فرض نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو اور اللہ سے مانگی گئی ہو، اور اس کے بر آنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے وہ اللہ ہی کے لیے ہو تو ایسی نذر اللہ کی اطاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو ایسی نذر کا ماننا معصیت اور اس کا پورا کرنا موجب عذاب ہے۔
نَزَّل: (۲۵/۱) اصل میں لفظ نزل استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں بتدریج، تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کرنا۔ اس تمہیدی مضمون کی مناسبت آگے چل کر آیت ۳۲ (رکوع ۳) کے مطالعہ سے معلوم ہوگی جہاں کفار مکہ کے اس اعتراض پر گفتگو کی گئی ہے کہ "یہ قرآن پورا کا پورا ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا"؟
المُنزِلین: (۲۳/۲۹) "اتارنے" سے مراد محض اتارنا ہی نہیں ہے بلکہ عربی محاورے کے مطابق اس میں "میزبانی" کا مفہوم بھی شامل ہے۔ گویا اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ خدایا اب ہم تیرے مہمان ہیں اور تو ہی ہمارا میزبان ہے۔
نَسْرًا: (۷۱/۲۳) نسر حمیر کے علاقے میں قبیلہ حمیر کی شاخ آل ذوالکلاع کا معبود تھا اور بلخع کے مقام پر اس کا بت نصب تھا جس کی شکل گدھ کی تھی۔ سبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام نسور لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مندر کو وہ لوگ بیت نسور اور اس کے پجاریوں کو اہل نسور کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے جو آثار عرب اور اس کے متصل علاقوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گدھ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔
نُسُکِی: (۶/۱۶۲) اصل میں لفظ "نسک" استعمال ہوا ہے جس کے معنی قربانی کے بھی ہیں اور اس کا اطلاق عمومیت کے ساتھ بندگی و پرستش کی دوسری تمام صورتوں پر بھی ہوتا ہے۔
مَنسَکًا: (۲۲/۶۷) یہاں منسک کا لفظ قربانی کے معنی میں نہیں بلکہ پورے نظام عبادت کے معنی میں ہے۔ اس سے پہلے اسی لفظ کا ترجمہ "قربانی کا قاعدہ" کیا گیا تھا۔ کیونکہ وہاں بعد کا فقرہ "تاکہ لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں" اس کے وسیع معانی میں سے صرف قربانی مراد ہونے کی تصریح کر رہا تھا لیکن یہاں اسے محض "قربانی" کے معنی میں لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ عبادت کو بھی اگر "پرستش" کے بجائے "بندگی" کے وسیع تر مفہوم میں لیا جائے تو مدعا سے قریب تر ہوگا۔ اس طرح منسک (طریق بندگی) کے وہی معنی ہو جائیں گے جو شریعت اور منہاج کے معنی ہیں اور یہ اسی مضمون کا اعادہ ہوگا جو سورہ مائدہ میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ "ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی" (آیت ۴۸)۔

النَّسِیٓءُ: (۹ر۳۷) عرب میں نسی دو طرح کی تھی۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ جنگ وجدل اور غارت گری اور خون کے انتقام لینے کی خاطر کسی حرام مہینے کو حلال قرار دے لیتے تھے اور اس کے بدلے میں کسی حلال مہینے کو حرام کر کے حرام مہینوں کی تعداد پوری کر دیتے تھے، دوسری صورت یہ تھی کہ قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لئے اس میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیتے تھے تا کہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے اور وہ ان زحمتوں سے بچ جائیں جو قمری حساب کے مطابق مختلف موسموں میں حج کے گردش کرتے رہنے سے پیش آتی ہے۔ اس طرح ۳۶ سال تک حج اپنے اصلی وقت کے خلاف دوسری تاریخوں میں ہوتا رہتا تھا اور صرف سینتیسویں سال ایک مرتبہ اصل ذی الحجہ کی ۹۔۱۰ تاریخ کو ادا ہوتا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ نے اپنے خطبہ میں فرمائی تھی کہ ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق السموٰت والارض۔ "یعنی اس سال حج کا وقت گردش کرتا ہوا ٹھیک اپنی اس تاریخ پر آ گیا جو قدرتی حساب سے اس کی اصل تاریخ ہے۔"

اس آیت میں نسی کو حرام اور ممنوع قرار دے کر جہلائے عرب کی ان دونوں اغراض کو باطل کر دیا گیا ہے، پہلی غرض تو ظاہر ہے کہ صریح طور پر ایک گناہ تھی، اس کے تو معنی ہی یہ تھے کہ خدا کے حرام کیے ہوئے کو حلال بھی کر لیا جائے اور پھر حیلہ بازی کر کے پابندی قانون کی ظاہری شکل بھی بنا کر رکھ دی جائے، رہی دوسری غرض تو سرسری نگاہ میں وہ معصوم اور مبنی بر مصلحت نظر آتی ہے لیکن درحقیقت وہ بھی خدا کے قانون سے بغاوت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عائد کردہ فرائض کے لئے شمسی حساب کے بجائے قمری حساب جن اہم مصالح کی بنا پر اختیار کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے بندے زمانے کی تمام گردشوں میں، ہر قسم کے حالات اور کیفیات میں اس کے احکام کی اطاعت کے خوگر ہوں، مثلاً رمضان ہے تو وہ کبھی گرمی میں اور کبھی برسات میں اور کبھی سردیوں میں آتا ہے، اور اہل ایمان ان سب بدلتے ہوئے حالات میں روزے رکھ کر فرمانبرداری کا ثبوت بھی دیتے ہیں اور بہترین اخلاقی تربیت بھی پاتے ہیں۔ اسی طرح حج بھی قمری حساب سے مختلف موسموں میں آتا ہے اور ان سب طرح کے اچھے اور برے حالات میں خدا کی رضا کے لیے سفر کر کے بندے اپنے خدا کی آزمائش میں پورے بھی اترتے ہیں اور بندگی میں پختگی بھی حاصل کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی گروہ اپنے سفر اور اپنی تجارت اور اپنے میلوں ٹھیلوں کی سہولت کی خاطر حج کو کسی خوشگوار موسم میں ہمیشہ کے لئے قائم کر دے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے مسلمان کوئی کانفرنس کر کے طے کر لیں کہ آئندہ سے رمضان کا مہینہ دسمبر یا جنوری کے مطابق کر دیا جائے گا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ بندوں نے اپنے خدا سے بغاوت کی اور خودمختار بن بیٹھے۔ اسی چیز کا نام کفر ہے۔ علاوہ بریں ایک عالمگیر دین جو سب انسانوں کے لیے ہے، آخر کس شمسی مہینے کو روزے اور حج کے لیے مقرر کرے؟ جو مہینہ بھی مقرر کیا جائے گا وہ زمین

کے تمام باشندوں کے لیے یکساں سہولت کا موسم نہیں ہو سکتا۔ کہیں وہ گرمی کا زمانہ ہو گا اور کہیں سردی کا۔ کہیں وہ بارشوں کا موسم ہو گا اور کہیں خشکی کا، کہیں فصلیں کاٹنے کا زمانہ ہو گا اور کہیں بونے کا۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ نسی کی منسوخی کا یہ اعلان ۹ ہجری کے حج کے موقع پر کیا گیا اور اگلے سال ۱۰ ہجری کا حج ٹھیک ان تاریخوں میں ہوا جو قمری حساب کے مطابق تھیں۔ اس کے بعد سے آج تک حج اپنی صحیح تاریخوں میں ہو رہا ہے۔

یُنشِرُون: (۲۱/۲۱) اصل میں لفظ ینشرون استعمال ہوا ہے جو ''انشار'' سے مشتق ہے۔ انشار کے معنی ہیں بے جان پڑی ہوئی چیز کو اٹھا کھڑا کرنا۔ اگرچہ اس لفظ کو قرآن مجید میں بالعموم زندگی بعد موت کے لیے استعمال کیا گیا ہے لیکن اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر، اصل لغوی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ بے جان مادے میں زندگی پھونک دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور موقع و محل کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لفظ یہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن ہستیوں کو انہوں نے خدا قرار دے رکھا ہے اور اپنا معبود بنایا ہے، کیا ان میں کوئی ایسا ہے جو مادہ غیر ذی حیات میں زندگی پیدا کرتا ہو؟ اگر ایک اللہ کے سوا کسی میں یہ طاقت نہیں ہے اور مشرکین عرب خود مانتے تھے کہ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے تو پھر وہ ان کو خدا اور معبود کس لئے مان رہے ہیں؟

نَاشِئَةَ اللَّیْلِ: (۷۳/۶) اصل میں لفظ ناشئۃ اللیل استعمال کیا گیا ہے جس کے متعلق مفسرین اور اہل لغت کے چار مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ناشئۃ سے مراد نفس ناشئہ ہے، یعنی وہ شخص جو رات کو اٹھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد رات کے اوقات ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں رات کو اٹھنا اور چوتھا قول یہ ہے کہ اس لفظ کا اطلاق محض رات کو اٹھنے پر نہیں ہوتا بلکہ سو کر اٹھنے پر ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ اور مجاہدؒ نے اسی چوتھے قول کو اختیار کیا ہے۔

النُّصُب: (۵/۳) اصل میں لفظ ''نصب'' استعمال ہوا ہے، اس سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو، خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی مورت ہو یا نہ ہو، ہماری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ آستانہ یا استھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا سے، یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔

نُصُبٍ: (۷۰/۴۳) اصل الفاظ ہیں الیٰ نُصُبٍ یُوفِضُونَ ۔ نصب کے معنی میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض نے اس سے مراد بت لیے ہیں اور ان کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ داور محشر کی مقرر کی ہوئی جگہ کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے جیسے آج وہ اپنے بتوں کے استھانوں کی طرف دوڑتے ہیں اور بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد وہ نشان لیے ہیں جو دوڑ کا مقابلہ کرنے والوں کے لیے لگائے جاتے ہیں تا کہ ہر ایک دوسرے سے پہلے مقرر نشان پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

اَنصارُاللّٰہ: (۳/۵۲)دین اسلام کی اقامت میں حصہ لینے کو قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ''اللہ کی مدد کرنے'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے، زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ واختیار کی آزادی عطا کی ہے اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے پر اپنی خدائی طاقت سے مجبور نہیں کرتا،اس کے بجائے وہ دلیل اور نصیحت سے انسان کو اس بات کا قائل کرنا چاہتا ہے کہ انکار نافرمانی اور بغاوت کی آزادی رکھنے کے باوجود اس کے لیے حق یہی ہے اور اس کی فلاح ونجات کا راستہ بھی یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی واطاعت اختیار کرے،اس طرح فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہ راست پر لانے کی تدبیر کرنا،یہ دراصل اللہ کا کام ہے،اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں،ان کو اللہ اپنا رفیق ومددگار قرار دیتا ہے،اور یہ وہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہوسکتی ہے، نماز،روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ وغلام ہوتا ہے، مگر تبلیغ دین اور اقامت دین کی جدوجہد میں بندے کو خدا کی رفاقت ومددگاری کا شرف حاصل ہوتا ہے جو اس دنیا میں روحانی ارتقا کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔

مُنتَصِرِیْن: (۵۱/۴۵)اصل الفاظ ہیں ما کانوا منتصرین۔انتصار کا لفظ عربی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس کے ایک معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے حملہ سے بچانا اور دوسرے معنی ہیں حملہ کرنے والے سے بدلہ لینا۔

نَصْرًا عَزِیْزًا: (۴۸/۳)اصل میں لفظ نصرا عزیزا استعمال ہوا ہے۔عزیز کے معنی زبردست کے ہیں اور بے نظیر، بے مثل اور نادر کے بھی۔پہلے معنی کے لحاظ سے اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اس صلح کے ذریعہ سے اللہ نے آپ کی ایسی مدد کی ہے جس سے آپ کے دشمن عاجز ہوجائیں گے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ شاذونادر ہی کبھی کسی کی مدد کا ایسا عجیب طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ بظاہر جو چیز لوگوں کو محض ایک صلح نامہ اور وہ بھی دب کر کیا ہوا صلح نامہ نظر آتی ہے وہی ایک فیصلہ کن فتح بن جانے والی ہے۔

نَصٰرٰی: (۵/۱۴)لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ ''نصاریٰ'' کا لفظ ''ناصرہ'' سے ماخوذ ہے جو مسیح علیہ السلام کا وطن تھا،دراصل اس کا ماخذ ''نصرت'' ہے اور اس کی بنا وہ قول ہے جو مسیح علیہ السلام کے سوال ﴿مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ﴾ (خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں؟) کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا کہ ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ (ہم اللہ کے کام میں مددگار ہیں) عیسائی مصنفین کو بالعموم محض ظاہری مشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ میں ناصریہ (Nazarenes) کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا اور جنہیں حقارت کے ساتھ ناصری اور ایبونی کہا جاتا تھا،انہی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے لیکن یہاں قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ انہوں نے خود کہا تھا کہ ہم ''نصاریٰ'' ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ

عیسائیوں نے اپنا نام کبھی ناصری نہیں رکھا، (اس مسئلہ کی مزید تشریح کے لیے صفحہ نمبر ۷۵۱ پر ضمیمہ میں الگ نوٹ درج ہے)۔

نِعمَتِی: (۱۵۰/۲) نعمت سے مراد وہی امامت اور پیشوائی کی نعمت ہے جو بنی اسرائیل سے سلب کر کے اس امت کو دی گئی تھی، دنیا میں ایک امت کی راست روی کا یہ انتہائی ثمرہ ہے کہ وہ اللہ کے امر تشریعی سے اقوام و امم کی رہنما و پیشوا بنائی جائے اور نوع انسانی کو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلانے کی خدمت اس کے سپرد کی جائے۔

فَسَيُنْغِضُونَ: (۵۱/۱۷) انغاض کے معنی ہیں سر کو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کی طرف ہلانا، جس طرح اظہار تعجب کے لیے یا مذاق اڑانے کے لیے آدمی کرتا ہے۔

النَّفّٰثٰتِ: (۴/۱۱۳) اصل الفاظ ہیں نفاثات فی العقد۔ عقد جمع ہے عقدہ کی جس کے معنی گرہ کے ہیں، جیسی مثلاً تاگے یا رسی میں ڈالی جاتی ہے۔ نفث کے معنی پھونکنے کے ہیں۔ نفاثات جمع ہے نفاثۃ کی جس کو اگر علامہ کی طرح سمجھا جائے تو مراد بہت پھونکنے والے مرد ہوں گے اور اگر مونث کا صیغہ سمجھا جائے تو مراد بہت پھونکنے والی عورتیں بھی ہو سکتی ہیں اور نفوس یا جماعتیں بھی، کیونکہ عربی میں نفس اور جماعت دونوں مونث ہیں۔ گرہ میں پھونکنے کا لفظ اکثر بلکہ تمام تر مفسرین کے نزدیک جادو کے لئے استعارہ ہے، کیونکہ جادوگر عموماً کسی ڈور یا تاگے میں گرہ دیتے اور اس پر پھونکتے چلے جاتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں طلوع فجر کے رب کی پناہ مانگتا ہوں جادوگروں یا جادوگرنیوں کے شر سے۔ اس مفہوم کی تائید وہ روایات بھی کرتی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب جادو ہوا تھا تو جبریل علیہ السلام نے آ کر حضور کو معوذتین پڑھنے کی ہدایت کی تھی اور معوذتین میں ہی ایک فقرہ ہے جو براہ راست جادو سے تعلق رکھتا ہے۔ ابو مسلم اصفہانی اور زمخشری نے نفاثات فی العقد کا ایک اور مفہوم بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد عورتوں کی مکاری اور مردوں کے عزائم اور آراء اور خیالات پر ان کی اثراندازی ہے اور اس کو جادوگری سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ عورتوں کی محبت میں مبتلا ہو کر آدمی کا وہ حال ہو جاتا ہے گویا اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ یہ تفسیر اگرچہ پر لطف ہے لیکن اس تفسیر کے خلاف ہے جو سلف سے مسلم چلی آتی ہے اور ان حالات سے بھی یہ مطابقت نہیں رکھتی جن میں معوذتین نازل ہوئی ہیں جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔

جادو کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ اس میں چونکہ دوسرے شخص پر برا اثر ڈالنے کیلئے شیاطین یا ارواح خبیثہ یا ستاروں کی مدد مانگی جاتی ہے اس لئے قرآن میں اسے کفر کہا گیا ہے: ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ...﴾ "سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ شیاطین نے کفر کیا تھا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے" (البقرہ۔ ۱۰۲)۔ لیکن اگر اس میں کوئی کلمہ کفر یا کوئی فعل شرک نہ بھی ہو تو وہ بالاتفاق حرام ہے اور نبی ﷺ نے اسے سات ایسے کبیرہ گناہوں

میں شمار کیا ہے جو انسان کو برباد کر دینے والے ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا سات غارت گر چیزوں سے پرہیز کرو۔ لوگوں نے پوچھا وہ کیا ہیں یا رسول اللہ؟ فرمایا خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلہ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلنا، اور بھولی بھالی عفیف مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

نَافِلَةً: (۱۷/۷۹) نفل کے معنی ہیں "فرض سے زائد" اس سے خود بخود یہ اشارہ نکل آیا ہے کہ وہ پانچوں جن کے اوقات کا نظام پہلی آیت میں بیان کیا گیا تھا، فرض ہیں، اور یہ چھٹی نماز فرض سے زائد ہے۔

الْاَنْفَالُ: (۸/۱) انفال جمع ہے نفل کی، عربی زبان میں نفل اس چیز کو کہتے ہیں جو واجب یا حق سے زائد ہو، جب یہ تابع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ رضا کارانہ خدمت ہوتی ہے جو ایک بندہ اپنے آقا کے لیے فرض سے بڑھ کر تطوعاً بجالاتا ہے اور جب یہ متبوع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ عطیہ وانعام ہوتا ہے جو آقا اپنے بندے کو اس کے حق سے زائد دیتا ہے۔

نَقِیْبًا: (۵/۱۲) نقیب کے معنی نگرانی اور تفتیش کرنے والے کے ہیں، بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر قبیلہ پر ایک ایک نقیب خود اسی قبیلہ سے مقرر کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ ان کے حالات پر نظر رکھے اور انہیں بے دینی و بد اخلاقی سے بچانے کی کوشش کرتا رہے، بائیبل کی کتاب گنتی میں بارہ "سرداروں" کا ذکر موجود ہے، مگر ان کی وہ حیثیت جو یہاں لفظ "نقیب" سے قرآن میں بیان کی گئی ہے، بائیبل کے بیان سے ظاہر نہیں ہوتی، بائیبل انہیں صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور قرآن ان کی حیثیت اخلاقی و دینی نگران کار کی قرار دیتا ہے۔

نَکَحْتُمُ: (۳۳/۴۹) یہ عبارت اس باب میں صریح ہے کہ یہاں لفظ نکاح کا اطلاق صرف عقد پر کیا گیا ہے۔ علمائے لغت میں اس امر پر بہت کچھ اختلاف ہوا ہے کہ عربی زبان میں نکاح کے اصل معنی کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ لفظ وطی اور عقد کے درمیان لفظاً مشترک ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان دونوں میں معنی مشترک ہے۔ تیسرا کہتا ہے کہ اس کے اصل معنی عقد تزویج کے ہیں اور وطی کے لئے اس کو مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ اور چوتھا کہتا ہے کہ اس کے اصل معنی وطی کے ہیں اور عقد کے لیے یہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ثبوت میں ہر گروہ نے کلام عرب سے شواہد پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن راغب اصفہانی نے پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ اصل النکاح العقد ثم استعیر للجماع و محال ان یکون فی الاصل الجماع ثم استعیر للعقد۔ "لفظ نکاح کے اصل معنی عقد ہی کے ہیں پھر یہ لفظ استعارۃً جماع کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور یہ بات محال ہے کہ اس کے اصل معنی جماع کے ہوں اور استعارے کے طور پر اسے

عقد کے لئے استعمال کیا گیا ہو۔" اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ جتنے الفاظ بھی جماع کے لئے عربی زبان یا دنیا کی کسی دوسری زبان میں حقیقۃً وضع کئے گئے ہیں وہ سب فحش ہیں۔ کوئی شریف آدمی کسی مہذب مجلس میں ان کو زبان پر لانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اب آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لفظ حقیقتاً اس فعل کے لئے وضع کیا گیا ہو اسے کوئی معاشرہ شادی بیاہ کے لئے مجاز و استعارے کے طور پر استعمال کرے۔ اس معنی کو ادا کرنے کے لئے تو دنیا کی ہر زبان میں مہذب الفاظ ہی استعمال کئے گئے ہیں نہ کہ فحش الفاظ۔

جہاں تک قرآن اور سنت کا تعلق ہے۔ ان میں نکاح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے مراد یا تو مجرد عقد ہے یا پھر وطی بعد عقد۔ لیکن وطی بلا عقد کے لئے اس کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح کی وطی کو تو قرآن اور سنت زنا اور سفاح کہتے ہیں نہ کہ نکاح۔

نکِیر: (۲۲/۴۴) اصل میں لفظ نکیر استعمال ہوا ہے جس کا پورا مفہوم عقوت یا کسی دوسرے لفظ سے ادا نہیں ہوتا۔ یہ لفظ دو معنی دیتا ہے۔ ایک یہ کہ کسی شخص کی بری روش پر ناخوشی کا اظہار کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو ایسی سزا دی جائے جو اس کی حالت دگرگوں کر دے۔ اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا جائے۔ کوئی دیکھے تو پہچان نہ سکے کہ یہ وہی شخص ہے۔

المُنکَر: (۱۶/۹۰) جس سے ہر وہ برائی مراد ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں ہمیشہ برا کہتے رہے اور تمام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

نُکِسُوا عَلٰی رُءُوْسِہِم: (۲۱/۶۵) اصل میں نکسوا علی رؤوسھم (اوندھا دئے گئے اپنے سروں کے بل) فرمایا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ انھوں نے خجالت کے مارے سر جھکا لیے۔ لیکن موقع و محل اور اسلوب بیان اس معنی کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ صحیح مطلب، جو سلسلہ کلام اور انداز کلام پر نظر کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا جواب سنتے ہی پہلے تو انہوں نے اپنے دلوں میں سوچا کہ واقعی ظالم تو تم خود ہو، کیسے بے بس اور بے اختیار معبودوں کو خدا بنائے بیٹھے ہو جو اپنی زبان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان پر کیا بیتی اور کون انہیں مار کر رکھ گیا، آخر یہ ہماری کیا مدد کریں گے جب کہ خود اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے لیکن اس کے بعد فوراً ہی ان پر ضد اور جہالت سوار ہو گئی اور جیسا کہ ضد کا خاصہ ہے، اس کے سوسار ہوتے ہی ان کی عقل اوندھ گئی۔ دماغ سیدھا سوچتے سوچتے یکایک الٹا سوچنے لگا۔

مُنِیب: (۵۰/۳۳) اصل الفاظ ہیں "قلب منیب" لے کر آیا ہے۔ منیب انابت سے ہے جس کے معنی ایک طرف رخ کرنے اور بار بار اسی کی طرف پلٹنے کے ہیں۔ جیسے قطب نما کی سوئی ہمیشہ قبلہ ہی کی طرف رخ کیے رہتی ہے اور آپ خواہ کتنا ہی ہلائیں جلائیں وہ پھر قبلہ ہی کی سمت میں آجاتی ہے۔ پس قلب منیب سے مراد ایسا دل ہے جو ہر طرف سے رخ پھیر کر اللہ کی طرف مڑ گیا اور پھر زندگی بھر جو احوال بھی اس پر گزرے ان میں وہ بار بار اسی کی طرف پلٹتا رہا۔ اسی مفہوم کو ہم نے دل گرویدہ کے الفاظ سے ادا کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں اصلی قدر اس شخص

کی ہے جو محض زبان سے نہیں بلکہ پورے خلوص کے ساتھ سچے دل سے اسی کا ہو کر رہ جائے۔

نُوُر: (۳۵/۲۴) نور سے مراد وہ چیز ہے جس کی بدولت اشیاء کا ظہور ہوتا ہے، یعنی جو آپ سے آپ ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرے۔ انسان کے ذہن میں نور اور روشنی کا اصل مفہوم یہی ہے۔ کچھ نہ سوجھنے کی کیفیت کا نام انسان نے اندھیرا اور تاریکی اور ظلمت رکھا ہے اور اس کے برعکس جب سب کچھ سجھائی دینے لگے اور ہر چیز ظاہر ہو جائے تو آدمی کہتا ہے کہ روشنی ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ نور کا استعمال اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ نہ اس معنی میں کہ معاذ اللہ وہ کوئی شعاع ہے جو ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور ہماری آنکھ کے پردے پر پڑ کر دماغ کے مرکز بینائی کو متاثر کرتی ہے۔ روشنی کی یہ مخصوص کیفیت اس معنی کی حقیقت میں شامل نہیں ہے جس کے لیے انسانی ذہن نے یہ لفظ اختراع کیا ہے، بلکہ اس پر اس لفظ کا اطلاق ہم ان روشنیوں کے لحاظ سے کرتے ہیں جو اس مادی دنیا کے اندر ہمارے تجربے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے انسانی زبان کے جتنے الفاظ بھی بولے جاتے ہیں وہ اپنے اصل بنیادی مفہوم کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں نہ کہ ان کے مادی مدلولات کے اعتبار سے، مثلاً ہم اس کے لیے دیکھنے کا لفظ بولتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ انسان اور حیوان کی طرح آنکھ نامی ایک عضو کے ذریعہ سے دیکھتا ہے، ہم اس کے لیے سننے کا لفظ بولتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ہماری طرح کانوں کے ذریعہ سے سنتا ہے۔ اس کے لیے ہم پکڑ اور گرفت کے الفاظ بولتے ہیں، یہ اس معنی میں نہیں کہ وہ ہاتھ نام کے آلہ سے پکڑتا ہے۔ یہ سب الفاظ اس کے لئے ہمیشہ ایک اطلاقی شان میں بولے جاتے ہیں اور صرف ایک کم عقل آدمی ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ سماعت اور بینائی اور گرفت کی کوئی دوسری صورت اس محدود اور مخصوص قسم کی سماعت و بینائی اور گرفت کے سوا ہونی غیر ممکن ہے جو ہمارے تجربہ میں آتی ہے۔ اسی طرح نور کے متعلق بھی یہ خیال کرنا محض ایک تن خیالی ہے کہ اس کے معنی کا مصفاق صرف اس شعاع ہی کی صورت میں پایا جا سکتا ہے جو کسی چمکنے والے جرم سے نکل کر آنکھ کے پردے پر منعکس ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کا مصداق اس محدود معنی میں نہیں ہے بلکہ مطلق معنی میں ہے، یعنی اس کائنات میں وہی ایک اصل "سبب ظہور" ہے، باقی یہ تاریکی اور ظلمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری روشنی دینے والی چیزیں بھی اسی کی بخشی ہوئی روشنی اور روشن گر ہیں، ورنہ ان کے پاس اپنا کچھ نہیں جس سے وہ یہ کرشمہ دکھا سکیں۔

نور کا لفظ علم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے برعکس جہل کو تاریکی اور ظلمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس معنی میں بھی کائنات کا نور ہے کہ یہاں حقائق کا علم اور راہ راست کا علم اگر مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔ اس سے فیض حاصل کیے بغیر جہالت کی تاریکی اور نتیجہ ضلالت و گمراہی کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے۔

(ہ)

فَتَهَجَّدْ: (۷۹/۱۷) کے معنی ہیں نیند توڑ کر اٹھنے کے۔ پس رات کے وقت تہجد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رات کا ایک حصہ سونے کے بعد پھر اٹھ کر نماز پڑھی جائے۔

تَهْجُرُوْنَ: (۶۷/۲۳) دیکھئے ص ۲۰۸۔

مَهْجُوْرًا: (۳۰/۲۵) اصل میں لفظ مهجور استعمال ہوا ہے۔ جس کے کئی معنی ہیں۔ اگر اسے هجر سے مشتق مانا جائے تو معنی ہوں گے متروک، یعنی ان لوگوں نے قرآن کو قابل التفات ہی نہ سمجھا، نہ اسے قبول کیا اور نہ اس سے کوئی اثر لیا، اور اگر هُجر سے مشتق مانا جائے تو اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے اسے ہذیان اور بکواس سمجھا۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے اسے اپنے ہذیان اوا پنی بکواس کا ہدف بنا لیا اور اس پر طرح طرح کی باتیں چھانٹتے رہے۔

هَمْسًا: (۱۰۸/۲۰) اصل میں لفظ همس استعمال ہوا ہے جو قدموں کی آہٹ، چپکے چپکے بولنے کی آواز، اونٹ کے چلنے کی آواز اور ایسی ہی ہلکی آوازوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہاں کوئی آواز بجز چلنے والوں کے قدموں کی آہٹ اور چپکے چپکے بات کرنے والوں کی کھسر پھسر کے نہیں سنی جائے گی۔ ایک پر ہیبت سماں بندھا ہوا ہو گا۔

الْمُهَيْمِن: (۲۳/۵۹) اصل میں لفظ المهيمن استعمال ہوا ہے جس کے تین معنی ہیں۔ ایک نگہبانی اور حفاظت کرنے والا۔ دوسرے شاہد جو دیکھ رہا ہو کہ کون کیا کرتا ہے۔ تیسرے قائم بامور الخلق، یعنی جس نے لوگوں کی ضروریات اور حاجات پوری کرنے کا ذمہ اٹھا رکھا ہو۔ یہاں بھی چونکہ مطلقاً لفظ المهيمن استعمال کیا گیا ہے اور اس فاعل کا کوئی مفعول بیان نہیں کیا گیا کہ وہ کس کا نگہبان و محافظ، کس کا شاہد اور کس کی خبر گیری کی ذمہ داری اٹھانے والا ہے، اس لیے اس اطلاق سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ تمام مخلوقات کی نگہبانی و حفاظت کر رہا ہے، سب کے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور کائنات کی ہر مخلوق کی خبر گیری اور پرورش اور ضروریات کی فراہمی کا اس نے ذمہ اٹھا رکھا ہے۔

هَضِيْم: (۱۴۸/۲۶) اصل میں لفظ هضيم استعمال ہوا ہے جس سے مراد کھجور کے ایسے خوشے ہیں جو پھلوں سے لد کر جھک گئے ہوں اور جن کے پھل پکنے کے بعد نرمی اور رطوبت کی وجہ سے پھٹے پڑتے ہوں۔

هَلْ: (۱/۷۶) پہلا فقرہ ہے هل اتىٰ على الانسان۔ اکثر مفسرین و مترجمین نے یہاں هل کو قد کے معنی میں لیا ہے اور وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ بے شک یا بلاشبہ انسان پر ایسا ایک وقت

آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ ھل عربی زبان میں "کیا" کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے، اور اس سے مقصود ہر حال میں سوال ہی نہیں ہوتا بلکہ مختلف مواقع پر یہ بظاہر سوالیہ لفظ مختلف معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی تو ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں اور کسی سے پوچھتے ہیں "کیا یہ واقعہ پیش آیا ہے؟" کبھی ہمارا مقصود سوال کرنا نہیں ہوتا بلکہ کسی بات کا انکار کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے اس سے پوچھتے ہیں کہ "کیا میں نے تمہاری رقم ادا کر دی"؟ اور کبھی ہمارا مقصود محض اقرار ہی کرانا نہیں ہوتا بلکہ سوال ہم اس غرض کے لئے کرتے ہیں کہ مخاطب کے ذہن کو ایک اور بات سوچنے پر مجبور کر دیں جو لازماً اس کے اقرار سے بطور نتیجہ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھتے ہیں "کیا میں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی کی ہے؟" اس سے مقصود صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ آپ نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی مقصود ہوتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے اس کے ساتھ میں برائی کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔ آیت زیر بحث میں سوالیہ فقرہ دراصل اسی آخری معنی میں ارشاد ہوا ہے۔ اس سے مقصود انسان سے صرف یہی اقرار کرانا نہیں ہے کہ فی الواقع اس پر ایک وقت ایسا گزرا ہے بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی ہے کہ جس خدا نے اس کی تخلیق کا آغاز ایسی حقیر سی حالت سے کر کے اسے پورا انسان بنا کھڑا کیا وہ آخر اسے دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز ہو گا؟

هُمَزَةٍ لُمَزَة: (۱۰۴/۱) اصل الفاظ ہیں **همزة لمزة**۔ عربی زبان میں **همز** اور **لمز** معنی کے اعتبار سے باہم اتنے قریب ہیں کہ کبھی دونوں ہم معنی استعمال ہوتے ہیں اور کبھی دونوں میں فرق ہوتا ہے مگر ایسا کہ فرق خود اہل زبان میں سے کچھ لوگ **همز** کا جو مفہوم بیان کرتے ہیں، کچھ دوسرے لوگ وہی مفہوم **لمز** کا بیان کرتے ہیں اور اس کے برعکس کچھ لوگ **لمز** کے جو معنی بیان کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے نزدیک **همز** کے معنی ہیں۔ یہاں چونکہ دونوں لفظ ایک ساتھ آئے ہیں اور **همزہ لمزہ** کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اس لیے دونوں مل کر یہ معنی دیتے ہیں کہ اس شخص کی عادت ہی یہ بن گئی ہے کہ وہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے، کسی کو دیکھ کر انگلیاں اٹھاتا اور آنکھوں سے اشارے کرتا ہے، کسی کے نسب پر طعن کرتا ہے، کسی کی ذات میں کیڑے نکالتا ہے، کسی پر منہ در منہ چوٹیں کرتا ہے، کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی برائیاں کرتا ہے، کہیں چغلیاں کھا کر اور لگائی بجھائی کر کے دوستوں کو لڑواتا اور کہیں بھائیوں میں پھوٹ ڈلواتا ہے، لوگوں کے برے برے نام رکھتا ہے ان پر چوٹیں کرتا ہے اور ان کو عیب لگاتا ہے۔

هُوداً او نصاریٰ: (۱۳۵/۲) یہودیت اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور عیسائیت: جن عقائد اور مخصوص

مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔

هَاوِيَةٌ: (۱۰۱/۹) اصل الفاظ ہیں امہ هاوية "اس کی ماں ھاویہ ہوگی" ھاویہ ھوی سے ہے جس کے معنی اونچی جگہ سے نیچی جگہ گرنے کے ہیں اور ھاویہ اس گہرے گڑھے کے لئے بولا جاتا ہے جس میں کوئی چیز گرے۔ جہنم کو ھاویہ کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ وہ بہت عمیق ہوگی اور اہل جہنم اس میں اوپر سے پھینکے جائیں گے۔

مُهَيْمِنًا: (۵/۴۸) اصل میں لفظ "مهیمن" استعمال ہوا ہے۔ عربی میں هيمن يهيمن هيمنة کے معنی محافظت، نگرانی، شہادت، امانت، تائید اور حمایت کے ہیں هيمن الرجل الشيء یعنی آدمی نے فلاں چیز کی حفاظت و نگہبانی کی۔ هيمن الطير علیٰ فراخه، یعنی پرندے نے اپنے چوزے کو اپنے پروں میں لے کر محفوظ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا: انی داع فهيمنوا، یعنی میں دعا کرتا ہوں تم تائید میں آمین کو، اسی سے لفظ ھمیان ہے جسے اردو میں ہمیانی کہتے ہیں، یعنی وہ تھیلی جس میں آدمی اپنا مال رکھ کر محفوظ کرتا ہے۔ پس قرآن کو الکتاب پر مهیمن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی کتب آسمانی میں دی گئی تھیں، اپنے اندر لے کر محفوظ کر دیا ہے، وہ ان پر نگہبان ہے اس معنی میں کہ اب ان کی تعلیمات برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا، وہ ان کا مؤید ہے اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام جس حد تک موجود ہے قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، وہ ان پر گواہ ہے اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کے کلام اور لوگوں کے کلام کی جو آمیزش ہو گئی ہے قرآن کی شہادت سے اس کو پھر چھانٹا جا سکتا ہے، جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے وہ خدا کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام۔

(و)

ذِی الْاَوْتَادِ: (۸۹/۱۰) فرعون کے لئے ذو الاوتاد (میخوں والا) کے الفاظ اس سے پہلے سورہ ص آیت ۱۲ میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی فوجوں کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو اور میخوں والا کا مطلب فوجوں والا ہو، کیونکہ انہی کی بدولت اس کی سلطنت اس طرح جمی ہوئی تھی جیسے خیمہ میخوں کے ذریعہ سے مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد فوجوں کی کثرت ہو اور مطلب یہ ہو کہ اس کے لشکر جہاں بھی جا کر ٹھیرتے تھے وہاں ہر طرف ان کے خیموں کی میخیں ہی میخیں ٹھکی نظر آتی تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ میخیں ہوں جن سے ٹھونک کر وہ لوگوں کو عذاب دیتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اہرام مصر کو میخوں سے تشبیہ دی گئی ہو کیونکہ وہ فراعنہ کی عظمت و شوکت کے وہ آثار ہیں جو صدیوں سے زمین پر جمے کھڑے ہیں۔

ذُو الْاَوْتَادِ: (۳۸/۱۲) فرعون کے لئے "ذی الاوتاد" (میخوں والا) یا تو اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ اس کی سلطنت ایسی مضبوط تھی گویا میخ زمین پر ٹھکی ہوئی ہو یا اس بنا پر کہ اس کے کثیر التعداد لشکر جہاں ٹھیرتے تھے وہاں ہر طرف میخیں ہی میخیں ٹھکی نظر آتی تھیں۔ اس بنا پر وہ جس سے ناراض ہوتا تھا اسے میخیں ٹھونک کر عذاب دیا کرتا تھا اور ممکن ہے کہ میخوں سے مراد اہرام مصر ہوں جو زمین کے اندر میخ کی طرح ٹھکے ہوئے ہیں۔

مِیْثَاقًا: (۴/۱۵۴) یہودیوں کے اس قول کی طرف سورۂ بقرہ آیت ۸۸ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ در حقیقت یہ لوگ تمام باطل پرست جہلاء کی طرح اس بات پر فخر کرتے تھے کہ جو خیالات اور تعصبات اور رسم و رواج ہم نے اپنے باپ دادا سے پائے ہیں ان پر ہمارا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ کسی طرح ہم ان سے نہیں ہٹائے جا سکتے۔ جب بھی خدا کی طرف سے پیغمبروں نے آکر ان کو سمجھانے کی کوشش کی، انہوں نے ان کو یہی جواب دیا کہ تم خواہ کوئی دلیل اور کوئی آیت لے آؤ ہم تمہاری کسی بات کا اثر نہ لیں گے، جو کچھ مانتے اور کرتے چلے آئے ہیں وہی مانتے رہیں گے اور وہی کیے چلے جائیں گے۔ (ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ، حاشیہ نمبر ۹۴)۔

مِیْثَاقٌ: (۸/۷۲) آیت میں معاہدہ کے لئے میثاق کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا مادہ وثوق ہے جو عربی زبان کی طرح اردو زبان میں بھی بھروسے اور اعتماد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میثاق ہر اس چیز کو کہیں گے جس کی بنا پر کوئی قوم بطریق معروف یہ اعتماد کرنے میں حق بجانب ہو کہ ہمارے اور اس کے درمیان جنگ نہیں ہے، قطع نظر اس سے کہ ہمارا اس کے ساتھ صریح طور پر عدم

محاربہ کا عہد و پیمان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

مِیثَاقًا غَلِیظًا: (۲۱/۴) پختہ عہد سے مراد نکاح ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں ایک مضبوط پیمان وفا ہے جس کے استحکام پر بھروسہ کر کے ہی ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ کرتی ہے۔ اب اگر مرد اپنی خواہش سے اس کو توڑتا ہے تو اسے وہ معاوضہ واپس لینے کا حق نہیں ہے جو اس نے معاہدہ کرتے وقت پیش کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو سورہ بقرہ، حاشیہ ۲۵۱)

وُجُوهٌ: (۸۸/۲) چہروں کا لفظ یہاں اشخاص کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چونکہ انسان کے جسم کی نمایاں ترین چیز اس کا چہرہ ہے جس سے اس کی شخصیت پہچانی جاتی ہے اور انسان پر اچھی یا بری کیفیات بھی گزرتی ہیں ان کا اظہار اس کے چہرے سے ہی ہوتا ہے، اس لئے ''کچھ لوگ'' کہنے کے بجائے ''کچھ چہرے'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

أَوْحَىٰ: (۶۸/۱۶) وحی کے لغوی معنی خفیہ اور لطیف اشارے کے ہیں جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا کوئی اور محسوس نہ کر سکے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ القاء (دل میں بات ڈال دینے) اور الہام (مخفی وتلقین) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے وہ چونکہ کسی مکتب درسگاہ میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیف طریقوں سے دی جاتی ہے کہ بظاہر کوئی تعلیم دیتا اور کوئی تعلیم پاتا نظر نہیں آتا، اس لئے اس کو قرآن میں وحی، الہام اور القاء کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب تینوں الفاظ الگ الگ اصطلاحوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لفظ وحی، انبیاء کیلیے مخصوص ہو گیا ہے۔ الہام واولیاء اور بندگان خاص کے لیے خاص کر دیا گیا ہے اور القاء نسبۃً عام ہے۔

وَحْيًا: (۵۱/۴۲) یہاں وحی سے مراد القاء، الہام، دل میں کوئی بات ڈال دینا یا خواب میں کچھ دکھا دینا، جیسے حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف کو دکھایا گیا (یوسف آیات ۴۔۱۰۰۔ الصافات ۱۰۲)۔

أَوْحَيْنَا: (۱۶۳/۴۔۱۶۴) وحی کے معنی ہیں اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات ڈالنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا، پیغام بھیجنا۔

دوسرے انبیاء علیہم السلام پر تو وحی اس طرح آتی تھی کہ ایک آواز آ رہی ہے یا فرشتہ پیغام سنا رہا ہے اور وہ سن رہے ہیں لیکن موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ خاص معاملہ برتا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے گفتگو کی، بندے اور خدا کے درمیان اس طرح کی باتیں ہوتی تھیں جیسے دو شخص آپس میں بات کرتے ہیں، مثال کے لیے اس گفتگو کا حوالہ کافی ہے جو سورہ طٰہٰ میں نقل کی گئی ہے۔ بائیبل میں بھی حضرت موسیٰ کی اس خصوصیت کا ذکر اسی طرح کیا گیا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ ''جیسے کوئی شخص اپنے دوست سے بات کرتا ہے ویسے ہی خداوند روبرو ہو کر موسیٰ سے باتیں کرتا تھا'' (خروج ۱۱:۳۳)

وَدًّا: (۲۳/۷۱) ود قبیلہ قضاعہ کی شاخ بنی کلب بن وبرہ کا معبود تھا جس کا استھان انہوں

نے دومۃ الجندل میں بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات میں اس کا نام ودم ایم (ود باپو) لکھا ہوا ملتا ہے۔ کلبی کا بیان ہے کہ اس کا بت ایک عظیم الجثہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور اس کا نام ان کے ہاں ود تھا۔ اسی کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام عبد ود ملتا ہے۔

مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ: (۱۰/۴۵) اصل الفاظ ہیں من ورائھم جھنم۔ وراء کا لفظ عربی زبان میں ہر اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو آدمی کی نظر سے اوجھل ہو۔ خواہ وہ آگے ہو یا پیچھے، اس لئے دوسرا ترجمہ ان الفاظ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ان کے پیچھے جہنم ہے" اگر پہلے معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہو گا کہ وہ بے خبر منہ اٹھائے اس راہ پر دوڑے جا رہے ہیں اور انہیں احساس نہیں ہے کہ آگے جہنم ہے جس میں وہ جا کر گرنے والے ہیں۔ دوسرے معنی لینے کی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ وہ آخرت سے بے فکر ہو کر اپنی اس شرارت میں مشغول ہیں اور نہیں پتہ نہیں ہے کہ جہنم ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔

وَارِدُهَا: (۱۹/۷۱) وارد ہونے کے معنی بعض روایات میں داخل ہونے کے بیان کیے گئے ہیں، مگر ان میں سے کسی کی سند بھی نبی ﷺ تک قابل اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچتی۔ اور پھر یہ بات قرآن مجید اور ان کثیر التعداد صحیح احادیث کے بھی خلاف ہے جن میں مومنین صالحین کے دوزخ میں جانے کی قطعی نفی کی گئی ہے۔ مزید برآں لغت میں بھی ورود کے معنی دخول کے نہیں ہیں۔ اس لیے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ جہنم پر گزر تو سب کا ہو گا مگر، جیسا کہ بعد والی آیت بتا رہی ہے، پرہیز گار لوگ اس سے بچا لیے جائیں اور اور ظالم اس میں جھونک دیے جائیں گے۔

اَوْزِعْنِی: (۱۹/۲۷) اصل الفاظ ہیں رب اوزعنی۔ وزع کے اصل معنی عربی زبان میں روکنے کے ہیں۔

الْمِيْزَانَ: (۴۲/۱۷) میزان سے مراد اللہ کی شریعت ہے جو ترازو کی طرح تول کر صحیح اور غلط، حق اور باطل، ظلم اور عدل، راستی اور ناراستی کا فرق واضح کر دیتی ہے۔ اوپر نبی ﷺ کی زبان سے یہ کہلوایا گیا ہے کہ امرت لاعدل بینکم (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں)۔ یہاں بتا دیا گیا کہ اس کتاب پاک کے ساتھ وہ میزان آ گئی ہے جس کے ذریعہ سے یہ انصاف قائم کیا جائے گا۔

مَوَازِيْنُهٗ: (۱۰۱/۶) اصل میں لفظ موازین استعمال ہوا ہے جو موزون کی جمع بھی ہو سکتا ہے اور میزان کی جمع بھی۔ اگر اس کو موزون کی جمع قرار دیا جائے تو موازین سے مراد وہ اعمال ہوں گے جن کا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی وزن ہو جو اس کے ہاں کسی قدر کے مستحق ہوں اور اگر اسے میزان کی جمع قرار دیا جائے تو موازین سے مراد ترازو کے پلڑے ہوں گے۔ پہلی صورت میں موازین کے بھاری اور ہلکے ہونے کا مطلب نیک اعمال کا برے اعمال کے مقابلے میں بھاری یا ہلکا

ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف نیکیاں ہی وزنی اور قابل قدر ہیں۔ دوسری صورت میں موازین کے بھاری ہونے کا مطلب اللہ جل شانہ کی میزانِ عدل میں نیکیوں کے پلڑے کا برائیوں کے پلڑے کی بہ نسبت زیادہ بھاری ہونا ہے اور ان کا ہلکا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بھلائیوں کا پلڑا برائیوں کے پلڑے کی بہ نسبت ہلکا ہو۔ اس کے علاوہ عربی زبان کے محاورے میں میزان کا لفظ وزن کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس معنی کے لحاظ سے وزن کے بھاری اور ہلکا ہونے سے مراد بھلائیوں کا وزن بھاری یا ہلکا ہونا ہے۔ بہر حال موازین کو خواہ موزون کے معنی میں لیا جائے یا میزان کے معنی میں یا وزن کے معنی میں، مدعا ایک ہی رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ آدمی اعمال کی جو پونجی لے کر آیا ہے وہ وزنی ہے یا بے وزن یا اس کی بھلائیوں کا وزن اس کی برائیوں کے وزن سے زیادہ ہے یا کم۔ یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے جن کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس کا مطلب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے ''اور وزن اس روز حق ہوگا پھر جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے'' (آیات ۸۔۹)۔ سورہ کہف میں ارشاد ہوا ہے ''اے نبی ان لوگوں سے کہو کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی وجہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انہیں وزن نہ دیں گے'' (آیت ۱۰۴۔۱۰۵) سورہ انبیاء میں فرمایا ''قیامت کے روز ہم ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم لے آئیں گے اور حساب لگانے کے لئے ہم کافی ہیں'' (آیت ۴۷)۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ کفر اور حق سے انکار بجائے خود اتنی بڑی برائی ہے کہ وہ برائیوں کے پلڑے کو لازماً جھکا دے گی اور کافر کی کوئی نیکی ایسی نہ ہوگی کہ بھلائیوں کے پلڑے میں اس کا کوئی وزن ہو جس سے اس کی نیکی کا پلڑا جھک سکے۔ البتہ مومن کے پلڑے میں ایمان کا وزن بھی ہوگا اور اس کے ساتھ ان نیکیوں کا وزن بھی جو اس نے دنیا میں کیں۔ دوسری طرف اس کی جو بدی بھی ہوگی وہ بدی کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا کہ آیا نیکی کا پلڑا جھکا ہوا ہے یا بدی کا۔

لَمُوْسِعُون: (۵۱/۴۷) الفاظ ہیں وانا لموسعون۔ موسع کے معنی طاقت و مقدرت رکھنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں اور وسیع کرنے والے کے بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ آسمان ہم نے کسی کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے زور سے بنایا ہے اور اس کی تخلیق ہماری قدرت سے باہر نہ تھی۔ پھر یہ تصور تم لوگوں کے دماغ میں آخر کیسے آ گیا کہ ہم تمہیں

دوبارہ پیدا نہ کرسکیں گے؟ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کائنات کو ہم بس ایک دفعہ بنا کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ مسلسل اس میں توسیع کررہے ہیں اور ہر آن اس میں ہماری تخلیق کے نئے نئے کرشمے رونما ہو رہے ہیں۔ ایسی زبردست خلاق ہستی کو آخر تم نے اعادہ خلق سے عاجز کیوں سمجھ رکھا ہے؟

وَاسِع: (۳/۷۳) اصل میں لفظ "واسع" استعمال ہوا ہے جو بالعموم قرآن میں تین مواقع پر آیا کرتا ہے۔ ایک وہ موقع جہاں انسانوں کے کسی گروہ کی تنگ خیالی و تنگ نظری کا ذکر آتا ہے اور اسے اس حقیقت پر متنبہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اللہ تمہاری طرح تنگ نظر نہیں ہے۔ دوسرا وہ موقع جہاں کسی کے بخل اور تنگ دلی اور کم حوصلگی پر ملامت کرتے ہوئے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ فراخ دست ہے، تمہاری طرح بخیل نہیں ہے۔ تیسرا وہ موقع جہاں لوگ اپنے تخیل کی تنگی کے سبب سے اللہ کی طرف کسی قسم کی محدودیت منسوب کرتے ہیں اور انہیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ غیر محدود ہے۔ (ملاحظہ ہو سورہ بقرہ، حاشیہ نمبر ۱۱۶)

الوَسْوَاس: (۱۱۴/۴) اصل میں الوسواس الخناس کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ وسواس کے معنی ہیں بار بار وسوسہ ڈالنے والا۔ اور وسوسے کے معنی ہیں پے در پے ایسے طریقے یا طریقوں سے کسی کے دل میں کوئی بری بات ڈالنا کہ جس کے دل میں وہ ڈالی جارہی ہو اسے یہ محسوس نہ ہوسکے کہ وسوسہ انداز اس کے دل میں ایک بری بات ڈال رہا ہے۔ وسوسے کے لفظ میں خود تکرار کا مفہوم شامل ہے، جیسے زلزلہ میں حرکت کی تکرار کا مفہوم شامل ہے۔ چونکہ انسان صرف ایک دفعہ بہکانے سے نہیں بہکتا بلکہ اسے بہکانے کی پے در پے کوشش کرنی ہوتی ہے اس لئے ایسی کوشش کو وسوسہ اور کوشش کرنے والے کو وسواس کہا جاتا ہے، رہا لفظ خناس تو یہ خنوس سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے کے بعد چھپنے یا آنے کے بعد پیچھے ہٹ جانے کے ہیں اور خناس چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس لیے اس کے معنی یہ فعل بکثرت کرنے والے کے ہوئے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ وسوسہ ڈالنے والے کو بار بار وسوسہ اندازی کے لئے آدمی کے پاس آنا پڑتا ہے اور ساتھ ساتھ جب اسے وسواس بھی کہا گیا تو دونوں الفاظ کے ملنے سے خود بخود یہ مفہوم پیدا ہوگیا کہ وسوسہ ڈال ڈال کر وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور پھر پے در پے وسوسہ اندازی کیلئے پلٹ کر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک مرتبہ اس کی وسوسہ اندازی کی کوشش جب ناکام ہوتی ہے تو وہ چلا جاتا ہے پھر وہی کوشش کرنے کے لئے دوبارہ سہ بارہ اور بار بار آتا رہتا ہے۔

وَصِيلَة: (۵/۱۰۳) وصیلہ، اگر بکری کا پہلا بچہ نر ہوتا تو وہ خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا، اور اگر وہ پہلی بار مادہ جنتی تو اسے اپنے لیے رکھ لیا جاتا تھا لیکن اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوئے ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کے بجائے یونہی خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کا نام وصیلہ تھا۔

وَضَعَهَا: (۵۵/۱۰) اصل الفاظ ہیں زمین کو "انام" کے لئے وضع کیا۔ وضع کرنے سے

مراد ہے تالیف کرنا، بنانا، تیار کرنا، رکھنا، ثبت کرنا۔

اَشَدُّ وَطْاً : (۶/۷۳)اصل میں لفظ اشد وطا استعمال ہوا ہے جس کے معنی میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں اسے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ رات کو عبادت کے لیے اٹھنا اور دیر تک کھڑے رہنا چونکہ طبیعت کے خلاف ہے اور نفس اس وقت آرام کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس لیے یہ فعل ایک ایسا مجاہدہ ہے جو نفس کو دبانے اور اس پر قابو پانے کی بڑی زبردست تاثیر رکھتا ہے۔ اس طریقے سے جو شخص اپنے آپ پر قابو پالے اور اپنے جسم و ذہن پر تسلط حاصل کر کے اپنی اس طاقت کو خدا کی راہ میں استعمال کرنے پر قادر ہو جائے وہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ دین حق کی دعوت کو دنیا میں غالب کرنے کے لئے کام کر سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دل اور زبان کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا اور اس حالت میں آدمی جو کچھ اپنی زبان سے کہتا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی کے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے کا بڑا کارگر ذریعہ ہے کیونکہ رات کی تنہائی میں جو شخص اپنا آرام چھوڑ کر عبادت کے لئے اٹھے گا وہ لامحالہ اخلاص ہی کی بنا پر ایسا کرے گا اس میں ریاکاری کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ چوتھا مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت چونکہ دن کی عبادت کی بہ نسبت آدمی پر زیادہ گراں ہوتی ہے اس لیے اس کا التزام کرنے سے آدمی میں بڑی ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے، وہ خدا کی راہ میں زیادہ مضبوطی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو زیادہ استقامت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے۔

تُوعَدُون : (۵/۵۱)اصل میں لفظ توعدون استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اگر وعد سے ہو تو اس کا مطلب ہو گا "جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے" اور وعید سے ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ "جس چیز کا تم کو ڈراوا دیا جارہا ہے" زبان کے لحاظ سے دونوں مطالب یکساں درست ہیں لیکن موقع و محل کے ساتھ دوسرا مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو کفر و شرک اور فسق و فجور میں غرق تھے اور یہ بات ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ کبھی ان کو محاسبے اور جزائے اعمال سے بھی سابقہ پیش آنے والا ہے، اسی لئے ہم نے توعدون کو وعدے کے بجائے وعید کے معنی میں لیا ہے۔

وَعْدًا مَّسْئُولًا : (۱۶/۲۵)اصل الفاظ ہیں وعدا مسئولا، یعنی ایسا وعدہ جس کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

مُتَوَفِّيک : (۵۵/۳)اصل میں لفظ "متوفیک" استعمال ہوا ہے۔ توفی کے اصل معنی لینے اور وصول کرنے کے ہیں۔ "روح قبض کرنا" اس لفظ کا مجازی استعمال ہے نہ کہ اصل لغوی معنی۔ یہاں یہ لفظ انگریزی لفظ (To recall) کے معنی میں مستعمل ہوا ہے یعنی کسی عہدہ دار کو اس کے منصب سے واپس بلا لینا، چونکہ بنی اسرائیل صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمائشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جارہی تھی، پے در پے کئی انبیاء کو

قتل کر چکے تھے اور ہر اس بندہ صالح کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انہیں دعوت دیتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کرنے اور انہیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بیک وقت مبعوث کیا جن کے ساتھ مامور من اللہ ہونے کی ایسی کھلی کھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو حق و صداقت سے انتہا درجہ کا عناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلہ میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ ان دونوں پیغمبروں کی دعوت رد کر دی بلکہ ان کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش پر قلم کرا دیا اور ان کے علماء و فقہاء نے سازش کر کے حضرت عیسیٰ کو رومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمائش پر مزید وقت اور قوت صرف کرنا بالکل فضول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بلا لیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔

يَتَوَفّٰكُمْ: (۱۰/ ۱۰۴) متن میں لفظ یتوفکم ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے ''جو تمہیں موت دیتا ہے''، لیکن اس لفظی ترجمے سے اصل روح ظاہر نہیں ہوتی، اس ارشاد کی روح یہ ہے کہ ''وہ جس کے قبضے میں تمہاری جان ہے جو تم پر ایسا مکمل حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے کہ جب تک اس کی مرضی ہو اسی وقت تک تم جی سکتے ہو اور جس وقت اس کا اشارہ ہو جائے اسی آن تمہیں اپنی جان اس جان آفریں کے حوالے کر دینی پڑتی ہے، میں صرف اسی کی پرستش اور اسی کی بندگی و غلامی اور اسی کی اطاعت و فرمانبرداری کا قائل ہوں۔''

وَقَبَ: (۱۱۳/ ۳) وقب کے معنی داخل ہونے یا چھا جانے کے ہیں، رات کی تاریکی کے شر سے خاص طور پر اس لئے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اکثر جرائم اور مظالم رات ہی کے وقت ہوتے ہیں، موذی جانور بھی رات ہی کو نکلتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک اشکال یہ پیش آتا ہے کہ متعدد صحیح احادیث میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت آئی ہے کہ رات کو چاند نکلا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اللہ کی پناہ مانگو، ھذا الغاسق اذا وقب، یعنی یہ الغاسق اذا وقب ہے (احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن المنذر، حاکم، ابن مردویہ) اس کی تاویل میں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اذا وقب کا مطلب یہاں اذا خسف ہے یعنی جبکہ وہ گہنا جائے یا چاند گرہن اس کو ڈھانک لے، لیکن کسی روایت میں بھی یہ نہیں آیا ہے کہ جس وقت حضور نے چاند کی طرف اشارہ کر کے یہ بات فرمائی اس وقت وہ گرہن میں تھا اور لغت عرب میں بھی اذا وقب کے معنی اذا خسف کسی طرح نہیں ہو سکتے، ہمارے نزدیک اس حدیث کی صحیح تاویل یہ ہے کہ چاند نکلنے کا وقت چونکہ رات ہی کو ہوتا ہے دن کو اگر چاند آسمان پر ہوتا بھی ہے تو روشن نہیں ہوتا اس لئے حضور کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس کے یعنی چاند کے آنے کے وقت

یعنی رات سے خدا کی پناہ مانگو، کیونکہ چاند کی روشنی مدافعت کرنے والے کے لئے اتنی مددگار نہیں ہو سکتی جتنی حملہ کرنے والے کے لئے ہوتی ہے اور جرم کا شکار ہونیوالے کے لئے اتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی مجرم کے لئے ہوا کرتی ہے۔ اسی بنا پر حدیث رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ان الشمس اذا غربت انتشرت الشیاطین، فاکفتوا صبیانکم واحبسوا مراشیکم حتی تذھب فحمة العشاء، "جب سورج غروب ہو جائے تو شیاطین ہر طرف پھیل جاتے ہیں لہذا اپنے بچوں کو سمیٹ لو اور اپنے جانوروں کو باندھ رکھو جب تک رات کی تاریکی ختم نہ ہو جائے"۔

الوَاقِعَة: (۱/۵۶) اس ارشاد میں قیامت کے لئے "واقعہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی قریب قریب وہی ہیں جس کیلئے اردو زبان میں ہونی شدنی کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ یعنی وہ ایسی چیز ہے جسے لازماً پیش آ کر ہی رہنا ہے۔ پھر اس کے پیش آنے کو "وقعة" کہا گیا ہے جو عربی زبان میں کسی بڑے حادثہ کے اچانک برپا ہو جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیس لوقعتها کاذبة کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے وقوع کا ٹل جانا اور اس کا آتے آتے رک جانا اور اس کی آمد کا پھیر دیا جانا ممکن نہ ہو گا، یا بالفاظ دیگر کوئی طاقت پھر اس کو واقعہ سے غیر واقعہ بنا دینے والی نہ ہو گی۔ دوسرے یہ کہ کوئی متنفس اس وقت یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہو گا کہ وہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔

مَوٰقِعِ النُّجُوم: (۷۵/۵۶) تاروں اور سیاروں کے مواقع سے مراد ان کے مقامات، ان کی منزلیں اور ان کے مدار ہیں اور قرآن کے بلند پایہ کتاب ہونے پر ان کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ عالم بالا میں اجرام فلکی کا نظام جیسا محکم اور مضبوط ہے ویسا ہی مضبوط اور محکم یہ کلام بھی ہے خدا نے وہ نظام بنایا ہے اسی خدا نے یہ کلام بھی نازل کیا ہے، کائنات کی بے شمار کہکشانوں (Galaxies) اور انہی کہکشانوں کے اندر بے حد و حساب تاروں (Stars) اور سیاروں (Planets) میں جو کمال درجہ کا ربط و نظم قائم ہے در آں حالیکہ بظاہر وہ بالکل بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی طرح یہ کتاب بھی ایک کامل درجہ کا مربوط و منظم ضابطہ حیات پیش کرتی ہے جس میں عقائد کی بنیاد پر اخلاق، عبادات، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، قانون و عدالت، صلح و جنگ، غرض انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مفصل ہدایات دی گئی ہیں اور ان میں کوئی چیز کسی دوسری چیز سے بے جوڑ نہیں ہے، در آنحالیکہ یہ نظام فکر متفرق آیات اور مختلف مواقع پر دیے ہوئے خطبوں میں بیان کیا گیا ہے، پھر جس طرح خدا کے باندھے ہوئے عالم بالا کا نظام اٹل ہے جس میں کبھی ذرہ برابر فرق واقع نہیں ہوتا، اسی طرح اس کتاب میں بھی جو حقائق بیان کیے گئے ہیں اور جو ہدایات دی گئی ہیں وہ بھی اٹل ہیں، ان کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا۔

المُتَّقِین: (۱۵/۵۱) اس سیاق و سباق میں لفظ متقی صاف طور پر یہ معنی دے رہا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی دی ہوئی خبر پر یقین لا کر

آخرت کو مان لیا اور وہ رویہ اختیار کر لیا جو حیاتِ اخروی کی کامیابی کے لیے انہیں بتایا گیا تھا اور اس روش سے اجتناب کیا جس کے متعلق انہیں بتادیا گیا تھا کہ یہ خدا کے عذاب میں مبتلا کرنے والی ہے۔

الْمُتَّقِيْن: (۳۱/۷۸) یہاں متقیوں کا لفظ ان لوگوں کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے جو کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا تھا، اس لیے لامحالہ اس لفظ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی آیات کو مانا اور دنیا میں یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کی کہ انہیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

وَكَزَه: (۱۵/۲۸) اصل میں لفظ "وکز" استعمال ہوا ہے جس کے معنی تھپڑ مارنے کے بھی ہیں اور گھونسا مارنے کے بھی۔ ہم نے اس خیال سے تھپڑ سے موت واقع ہو جانا گھونسے کی بہ نسبت بعید تر ہے، اس کا ترجمہ گھونسا مارنا کیا ہے۔

وَكِيْلًا: (۲/۱۷) وکیل، یعنی اعتماد اور بھروسے کا مدار، جس پر توکل کیا جائے، جس کے سپرد اپنے معاملات کر دیے جائیں جس کی طرف ہدایت اور استمداد کے لئے رجوع کیا جائے۔

وَكِيْلًا: (۹/۷۳) وکیل اس شخص کو کہتے ہیں جس پر اعتماد کر کے کوئی شخص اپنا معاملہ اس کے سپرد کر دے۔ قریب قریب اسی معنی میں ہم اردو زبان میں وکیل کا لفظ اس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کے حوالہ اپنا مقدمہ کر کے ایک آدمی مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے وہ اچھی طرح مقدمہ لڑے گا اور اسے خود اپنا مقدمہ لڑنے کی حاجت نہ رہے گی۔

يَتَوَكَّلُوْنَ: (۳۶/۴۲) توکل کے معنی یہ ہیں کہ: اولاً آدمی کو اللہ کی رہنمائی پر کامل اعتماد ہو اور وہ یہ سمجھے کہ حقیقت کا جو علم، اخلاق کے جو اصول، حلال و حرام کے جو حدود اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو قواعد و ضوابط اللہ نے دیے ہیں وہی برحق ہیں اور انہی کی پیروی میں انسان کی خیر ہے، ثانیاً آدمی کا بھروسا اپنی طاقت، قابلیت اور اپنے ذرائع وسائل، اپنی تدابیر اور اللہ کے سوا دوسروں کی امداد و اعانت پر نہ ہو بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے کہ دنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں اسکی کامیابی کا اصل انحصار اللہ کی توفیق و تائید پر ہے اور اللہ کی توفیق و تائید کا وہ اسی صورت میں مستحق ہو سکتا ہے جبکہ وہ اس کی رضا کو مقصود بنا کر اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کرتے ہوئے کام کرے، ثالثاً آدمی کو ان وعدوں پر پورا بھروسا ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عمل صالح کا رویہ اختیار کرنے والے اور باطل کے بجائے حق کے لئے کام کرنے والے بندوں سے کیے ہیں اور انہی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے وہ ان تمام فوائد اور منافع اور لذائذ کو لات مار دے جو باطل راہ پر جانے کی صورت میں اسے حاصل ہوتے نظر آتے ہیں، اور ان کے سارے نقصانات اور تکلیفوں اور محرومیوں کو انگیز کر جائے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اس کے نصیب میں آئیں۔ توکل کے معنی کی اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کا کتنا گہرا تعلق ہے اور اس کے بغیر جو ایمان محض خالی خولی اعتراف و اقرار کی حد تک ہو اس

سے وہ شاندار نتائج کیوں نہیں حاصل ہو سکتے جن کا وعدہ ایمان لا کر توکل کرنے والوں سے کیا گیا ہے۔

اَوْلِيَآءَ : (۶/۴۲) اصل میں لفظ اولیاء استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم عربی زبان میں بہت وسیع ہے۔ معبودان باطل کے متعلق گمراہ انسانوں کے مختلف عقائد اور بہت سے مختلف طرز عمل ہیں جن کو قرآن مجید میں "اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کا تتبع کرنے سے لفظ "ولی" کے حسب ذیل مفہومات معلوم ہوتے ہیں:۔

۱۔ جس کے کہنے پر آدمی چلے، جس کی ہدایات پر عمل کرے اور جس کے مقرر کیے ہوئے طریقوں، رسموں اور قوانین وضوابط کی پیروی کرے (النساء، آیات ۱۱۸ تا ۱۲۰۔ الاعراف ۳، ۲۷ تا ۳۰)

۲۔ جس کی رہنمائی (Guidance) پر آدمی اعتماد کرے اور یہ سمجھے کہ وہ اسے صحیح راستہ بتانے والا اور غلطی سے بچانے والا ہے (البقرہ ۲۵۷۔ بنی اسرائیل ۹۷۔ الکہف ۱۷۔ ۵۰۔ الجاثیہ ۱۹۔)

۳۔ جس سے متعلق آدمی یہ سمجھے کہ میں دنیا میں خواہ کچھ کرتا رہوں، وہ مجھے اس کے برے نتائج سے اور اگر خدا ہے اور آخرت بھی ہونے والی ہے تو اس کے عذاب سے بچالے گا۔ (النساء ۱۲۳۔ ۱۷۳۔ الانعام ۵۱، الرعد ۳۷، العنکوبت ۲۲، الاحزاب ۶۵، الزمر ۳)۔

۴۔ جس کے متعلق آدمی یہ سمجھے کہ وہ دنیا میں فوق الفطری طریقے سے اس کی مدد کرتا ہے، آفات ومصائب سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اسے روزگار دلواتا ہے، اولاد دیتا ہے، مرادیں برلاتا ہے۔ اور دوسری ہر طرح کی حاجتیں پوری کرتا ہے (ہود، ۲۰، الرعد ۱۶، العنکبوت، ۴۱)

بعض مقامات پر قرآن میں ولی کا لفظ ان میں سے کسی ایک معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر جامعیت کے ساتھ اس کے سارے ہی مفہومات مراد ہیں۔ آیت زیر تشریح بھی انہی میں سے ایک ہے۔ یہاں اللہ کے سوا دوسروں کو ولی بنانے سے مراد مذکورہ بالا چاروں معنوں میں ان کو اپنا سرپرست بنانا اور حامی ومددگار سمجھنا ہے۔

اَوْلِيَآءَ : (۱۰/۴۵) یہاں ولی کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک وہ دیویاں اور دیوتا اور زندہ یا مردہ پیشوا جن کے متعلق مشرکین نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو شخص ان کا متوسل ہو وہ خواہ دنیا میں کچھ ہی کرتا رہے، خدا کے ہاں اس کی پکڑ نہ ہو سکے گی کیونکہ ان کی مداخلت اسے خدا کے غضب سے بچالے گی۔ دوسرے وہ سردار اور لیڈر اور امراء وحکام جنہیں خدا سے بے نیاز ہو کر لوگ اپنا رہنما اور مطاع بناتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی کرتے ہیں اور انہیں خوش کرنے کے لیے خدا کو ناخوش کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ یہ آیت ایسے سب لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ جب اس روش کے نتیجے میں جہنم سے ان کو سابقہ پیش آئے گا تو ان دونوں قسم کے سرپرستوں میں سے کوئی بھی انہیں بچانے کے لئے آگے نہ بڑھے گا (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم تفسیر الشوریٰ، حاشیہ نمبر ۶)

اَوْلٰی لَکَ: (۷۵/۳۵) مفسرین نے اولیٰ لک کے متعدد معنی بیان کیے ہیں۔ تف ہے تجھ پر۔ ہلاکت ہے تیرے لئے۔ خرابی، یا تباہی، یا کمبختی ہے تیرے لئے، لیکن ہمارے نزدیک موقع و محل کے لحاظ سے اس کا مناسب ترین مفہوم وہ ہے جو حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "جب تو اپنے خالق سے کفر کرنے کی جرأت کر چکا ہے تو پھر تجھ جیسے آدمی کو یہی چال زیب دیتی ہے جو تو چل رہا ہے"۔ یہ اسی طرح کا طنزیہ کلام ہے جیسے قرآن مجید میں ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں عذاب دیتے ہوئے مجرم انسان سے کہا جائے گا کہ ﴿ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ﴾ "لے چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو"۔ (الدخان:۴۹)

مَوْلٰکُمْ: (۵۷/۱۵) اصل الفاظ ہیں ھی مولاکم "دوزخ ہی تمہاری مولیٰ ہے"۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہی تمہارے لیے موزوں جگہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ کو تو تم نے اپنا مولیٰ بنایا نہیں کہ وہ تمہاری خبرگیری کرے، اب تو دوزخ ہی تمہاری مولیٰ ہے، وہی تمہاری خوب خبرگیری کرے گی۔

مَوْلیٰ: (۴۴/۴۱) اصل میں لفظ مولیٰ استعمال کیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی تعلق کی بنا پر دوسرے شخص کی حمایت کرے، قطع نظر اس سے کہ وہ رشتہ داری کا تعلق ہو یا دوستی کا یا کسی اور قسم کا۔

وَلَایَتِھِمْ: (۸/۷۲) "ولایت" کا لفظ عربی زبان میں حمایت، نصرت، مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قرابت، سرپرستی اور اس سے ملتے جلتے مفہومات کے لیے بولا جاتا ہے، اور اس آیت کے سیاق و سباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے اور شہریوں کا اپنی ریاست سے اور خود شہریوں کا آپس میں ہوتا ہے۔ پس یہ آیت "دستوری و سیاسی ولایت" کو اسلامی ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے اور ان حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتہ سے خارج قرار دیتی ہے، اس عدم ولایت کے قانونی نتائج بہت وسیع ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے، مثال کے طور پر صرف اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ اسی عدم ولایت کی بنا پر دارالکفر اور دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرے کے قانونی ولی (Guardian) نہیں بن سکتے، باہم شادی بیاہ نہیں کر سکتے، اور اسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے ہاں ذمہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دارالکفر سے شہریت کا تعلق نہ توڑا ہو، علاوہ بریں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اس کی رو سے دولت اسلامیہ کی ذمہ داری ان مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کی حدود کے اندر رہتے ہیں۔

وَھَّاجًا: (۷۸/۱۳) مراد ہے سورج، اصل میں لفظ وھاج استعمال ہوا ہے جس کے معنی نہایت گرم کے بھی ہیں اور نہایت روشن کے بھی، اس لیے ترجمے میں ہم نے دونوں معنی درج

کر دیے ہیں۔ اس مختصر فقرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے جس عظیم الشان نشان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا قطر زمین کے قطر سے ۱۰۹ گنا اور اس کا حجم زمین کے حجم سے ۳ لاکھ ۳۳ ہزار گنا زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل دور ہونے کے باوجود اس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان اگر برہنہ آنکھ سے اس کی طرف نظر جمانے کی کوشش کرے تو اپنی بینائی کھو بیٹھے اور اس کی گرمی کا یہ حال ہے کہ زمین کے بعض حصوں میں اس کی تپش کی وجہ سے درجہ حرارت ۱۴۰ ڈگری فاہرن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اللہ ہی کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اس سے ٹھیک ایسے فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اس سے بہت قریب ہونے کے باعث یہ بے انتہا گرم ہے اور نہ بہت دور ہونے کے باعث بے انتہا سرد، اسی وجہ سے یہاں انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی ممکن ہوئی ہے۔ اسی سے قوت کے بے حساب خزانے نکل کر زمین پر پہنچ رہے ہیں جو ہمارے لیے سبب حیات بنے ہوئے ہیں۔ اسی سے ہماری فصلیں پک رہی ہیں اور ہر مخلوق کو غذا بہم پہنچ رہی ہے۔ اسی کی حرارت سمندروں کے پانی کو گرم کر کے وہ بھاپیں اٹھاتی ہے جو ہواؤں کے ذریعہ سے زمین کے مختلف حصوں پر پھیلتی اور بارش کی شکل میں برستی ہیں۔ اس سورج میں اللہ نے ایسی زبردست بھٹی سلگا رکھی ہے جو اربوں سال سے روشنی، حرارت اور مختلف اقسام کی شعاعیں سارے نظام شمسی میں پھینکے چلی جا رہی ہے۔

(ی)

اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ: (۳۸/۴۵) اصل الفاظ اولی الایدی والابصار (ہاتھوں اور نگاہوں والے)۔ ہاتھ سے مراد جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ قوت وقدرت ہے اور ان انبیاء کو صاحب قوت وقدرت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نہایت باعمل لوگ تھے، اللہ کی اطاعت کرنے اور معصیتوں سے بچنے کی زبردست طاقت رکھتے تھے، اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے انہوں نے بڑی کوششیں کی تھیں۔ نگاہ سے مراد آنکھوں کی بینائی نہیں بلکہ دل کی بصیرت ہے۔ وہ حق بیں اور حقیقت شناس لوگ تھے۔ دنیا میں اندھوں کی طرح نہیں چلتے تھے بلکہ آنکھیں کھول کر علم ومعرفت کی پوری روشنی میں ہدایت کا سیدھا راستہ دیکھتے ہوئے چلتے تھے۔ ان الفاظ میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جو لوگ بدعمل اور گمراہ ہیں وہ درحقیقت ہاتھوں اور آنکھوں، دونوں سے محروم ہیں۔ ہاتھ والا حقیقت میں وہی ہے جو اللہ کی راہ میں کام کرے اور آنکھوں والا وہی ہے جو حق کی روشنی اور باطل کی تاریکی میں امتیاز کرے

ذَا الْاَیْدِ: (۳۸/۱۷) اصل الفاظ ہیں ذو الاید "ہاتھوں والا"۔ ہاتھ کا لفظ صرف عربی زبان ہی میں نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی قوت وقدرت کے لئے استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ حضرت داؤد کے لیے جب ان کی صفت کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ وہ "ہاتھوں والے" تھے تو اس کا مطلب لازماً یہی ہوگا کہ وہ بڑی قوتوں کے مالک تھے۔ ان قوتوں سے بہت سی قوتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ مثلاً جسمانی طاقت، جس کا مظاہرہ انہوں نے جالوت سے جنگ کے موقع پر کیا تھا۔ فوجی اور سیاسی طاقت جس سے انہوں نے گردوپیش کی مشرک قوموں کو شکست دے کر ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کر دی تھی، اخلاقی طاقت، جس کی بدولت انہوں نے بادشاہی میں

فقیری کی اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے اور اس کے حدود کی پابندی کرتے رہے۔ اور عبادت کی طاقت جس کا حال یہ تھا کہ حکومت وفرمانروائی اور جہاد فی سبیل اللہ کی مصروفیتوں کے باوجود، صحیحین کی روایت کے مطابق، وہ ہمیشہ ایک دن بیچ میں روزہ رکھتے تھے اور روزانہ ایک تہائی رات نماز میں گزارتے تھے۔ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں حضرت ابوالدرداء کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت داؤد کا ذکر آتا تھا تو نبی ﷺ فرمایا کرتے تھے۔ کان اعبد البشر۔ "وہ سب سے زیادہ عبادت گزار آدمی تھے"۔

یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ: (۵۴/۱۷) بعض لوگوں نے یسرنا القرآن کے الفاظ سے یہ غلط مطلب نکال لیا ہے کہ قرآن ایک آسان کتاب ہے، اسے سمجھنے کے لیے کسی علم کی ضرورت نہیں حتیٰ

کہ عربی زبان تک سے واقفیت کے بغیر جو شخص چاہے اس کی تفسیر کر سکتا ہے۔ اور حدیث وفقہ سے بے نیاز ہو کر اس کی آیات سے جو احکام چاہے مستنبط کر سکتا ہے۔ حالانکہ جس سیاق و سباق میں یہ الفاظ آئے ہیں اس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد کا مدعا لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ نصیحت کا ایک ذریعہ تو ہیں وہ عبرتناک عذاب جو سرکش قوموں پر نازل ہوئے اور دوسرا ذریعہ ہے یہ قرآن جو دلائل اور وعظ و تلقین سے تم کو سیدھا راستہ بتا رہا ہے۔ اس ذریعہ کے مقابلے میں نصیحت کا یہ ذریعہ زیادہ آسان ہے۔ پھر کیوں تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور عذاب ہی دیکھنے پر اصرار کیے جاتے ہو؟ یہ تو سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اپنے نبی کے ذریعہ سے یہ کتاب بھیج کر وہ تمہیں خبردار کر رہا ہے کہ جن راہوں پر تم لوگ جا رہے ہو وہ کس تباہی کی طرف جاتی ہیں اور تمہاری خیر کس راہ میں ہے۔ نصیحت کا یہ طریقہ اسی لیے تو اختیار کیا گیا ہے کہ تباہی کے گڈھے میں گرنے سے پہلے تمہیں اس سے بچالیا جائے۔ اب اس سے زیادہ نادان اور کون ہو گا جو سیدھی طرح سمجھانے سے نہ مانے اور گڑھے میں گر کر ہی تسلیم کرے کہ واقعی یہ گڑھا تھا۔

یَغُوْث : (۲۳/۷۱) یغوث قبیلہ طے کی شاخ انعم اور قبیلہ مذحج کی بعض شاخوں کا معبود تھا مذحج والوں نے یمن اور حجاز کے درمیان جرش کے مقام پر اس کا بت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی بعض کا نام عبد یغوث ملتا ہے۔

یَقْطِین: (۱۴۶/۳۷) اصل الفاظ ہیں شجرة من یقطین۔ یقطین عربی زبان میں ایک ایسے درخت کو کہتے ہیں جو کسی تنے پر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ بیل کی شکل میں پھیلتا ہے، جیسے کدو، تربوز، ککڑی وغیرہ، بہرحال وہاں کوئی ایسی بیل معجزانہ طریقہ پر پیدا کر دی گئی تھی جس کے پتے حضرت یونس پر سایہ بھی کریں اور اس کے پھل ان کے لئے بیک وقت غذا کا کام بھی دیں اور پانی کا کام بھی۔

تَیَمَّمُوْا: (۴۳/۴) تیمم کے معنی قصد کرنے کے ہیں، مطلب یہ کہ جب پانی نہ ملے یا پانی ہو اور اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

المَیْمَنَة: (۸/۵۶) اصل میں لفظ اصحاب المیمنة استعمال ہوا ہے۔ میمنہ عربی قاعدے کے مطابق یمین سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں اور یمن سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی ہیں فال نیک۔ اگر اس کو یمین سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنی ہوں گے "سیدھے والے" لیکن اس سے لغوی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کا مطلب ہے عالی مرتبہ لوگ۔ اہل عرب سیدھے ہاتھ کو قوت اور رفعت اور عزت کا نشان سمجھتے تھے۔ جس کا احترام مقصود ہوتا تھا اسے مجلس میں سیدھے ہاتھ پر بٹھاتے تھے۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے تو کہتے فلان منی بالیمین۔ "وہ تو میرے سیدھے ہاتھ کی طرف ہے"۔ اردو میں کسی شخص کو کسی بڑی ہستی کا دست راست اس معنی میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا خاص آدمی ہے اور اگر اس کو یمن سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنة کے معنی ہوں گے خوش نصیب اور نیک بخت لوگ۔

اليَمِين: (۲۸/۳۷) اصل الفاظ ہیں کنتم تاتوننا عن الیمین۔ ''تم ہمارے پاس یمین کی راہ سے آتے تھے۔'' یمین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اگر اس کو قوت وطاقت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ ہم کمزور تھے اور تم ہم پر غالب تھے۔ اس لئے ہم تمہارے فریب میں آگئے، اور اگر اسے قسم کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں اطمینان دلایا تھا کہ حق وہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو۔

ایَّام: (۱۴/۴۵) اصل الفاظ ہیں الذین لا یرجون ایام الله۔ لفظی ترجمہ یہ ہو گا ''جو لوگ اللہ کے دنوں کی توقع نہیں رکھتے'' لیکن عربی محاورے میں ایسے مواقع پر ایام سے مراد محض دن نہیں بلکہ وہ یادگار دن ہوتے ہیں جن میں اہم تاریخی واقعات پیش آئے ہوں۔ مثلاً ایام العرب کا لفظ تاریخ عرب کے اہم واقعات اور قبائل عرب کی ان بڑی بڑی لڑائیوں کے لیئے بولا جاتا ہے جنہیں بعد کی نسلیں صدیوں تک یاد کرتی رہی ہیں۔ یہاں ایام اللہ سے مراد کسی قوم کے وہ برے دن ہیں جب اللہ کا غضب اس پر ٹوٹ پڑے اور اپنے کرتوتوں کی پاداش میں وہ تباہ کر کے رکھ دی جائے۔ اس معنی کے لحاظ سے ہم نے اس فقرے کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ''جو اللہ کی طرف سے برے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے''۔ یعنی جن کو یہ خیال نہیں ہے کہ کبھی وہ دن آئے گا جب ہمارے افعال پر ہماری شامت آئے گی اور اسی غفلت نے ان کو ظلم و ستم پر دلیر کر دیا ہے۔

ایَّام الله: (۵/۱۴) ''ایام'' کا لفظ عربی زبان میں اصطلاحاً یادگار تاریخی واقعات کے لیے بولا جاتا ہے۔ ''ایام اللہ'' سے مراد تاریخ انسانی کے وہ اہم ابواب ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے گزشتہ زمانہ کی قوموں اور بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کے اعمال کے لحاظ سے جزا یا سزا دی ہے۔

ایَّام مَعْلُومَات: (۲۸/۲۲) ایام معلومات (چند مقرر دنوں) سے مراد کون سے دن ہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان سے مراد ذوالحجہ کے پہلے دس دن ہیں۔ ابن عباس، حسن بصری، ابراہیم نخعی، قتادہ اور متعدد دوسرے صحابہ و تابعین سے یہ قول منسوب ہے۔ امام ابو حنیفہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد کا بھی ایک قول اسی کی تائید میں ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یوم النحر (یعنی ۱۰ ذی الحجہ) اور اس کے بعد کے تین دن ہیں۔ اس کی تائید میں ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابراہیم نخعیؒ، حسن اور عطاء کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں اور امام شافعی و احمد سے بھی ایک ایک قول اس کے حق میں منقول ہوا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد تین دن ہیں یوم النحر اور دو دن اس کے بعد۔ اس کی تائید میں حضرت عمر، علی، ابن عمر، ابن عباس، انس بن مالک، ابوہریرہ، سعید بن مسیب اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کے اقوال منقول ہیں۔ فقہاء میں سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے یہی قول اختیار کیا ہے اور مذہب حنفی و مالکی میں اسی پر فتویٰ ہے۔ باقی کچھ شاذ اقوال بھی ہیں، مثلاً کسی نے ایام النحر کے بعد صرف ایک دن مزید قربانی کا مانا ہے لیکن یہ کمزور اقوال ہیں جن کی دلیل مضبوط نہیں ہے۔

قومِ یونس: (۱۰/۹۸) یونس علیہ السلام (جن کا نام بائیبل میں یوناہ ہے اور جن کا زمانہ ۸٦۰۔۷۸۴ قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے) اگرچہ اسرائیلی نبی تھے مگر ان کو اشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق بھیجا گیا تھا اور اسی بنا پر اشوریوں کو یہاں قوم یونس کہا گیا ہے۔ اس قوم کو مرکز اس زمانہ میں نینوئ کا مشہور شہر تھا جس کے وسیع کھنڈرات آج تک دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ شہر موصل کے عین مقابل پائے جاتے ہیں اور اسی علاقے میں ''یونس نبی'' کے نام سے ایک مقام بھی موجود ہے، اس قوم کے عروج کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا دارالسلطنت نینوئ تقریباً ٦۰ میل کے دور میں پھیلا ہوا تھا۔

قرآن میں اس قصہ کی طرف تین جگہ صرف اشارات کیے گئے ہیں، کوئی تفصیل نہیں دی گئی (ملاحظہ ہو سورہ انبیاء آیات ۸۷۔۸۸، الصافات۔۱۳۹۔۱۴۸۔ اور القلم، ۴۸۔۵۰) اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قوم کن خاص وجوہ کی بنا پر خدا کے اس قانون سے مستثنٰی کی گئی کہ ''عذاب کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کسی کا ایمان اس کے لیے نافع نہیں ہوتا'' بائیبل میں ''یوناہ'' کے نام سے جو مختصر سا صحیفہ ہے اس میں کچھ تفصیل تو ملتی ہے مگر وہ چنداں قابل اعتماد نہیں ہے، کیونکہ اول تو نہ وہ آسمانی صحیفہ ہے نہ خود یونس علیہ السلام کا اپنا لکھا ہوا ہے بلکہ ان کے چار پانچ سو برس بعد کسی نامعلوم شخص نے اسے تاریخ یونس کے طور پر لکھ کر مجموعہ کتب مقدسہ میں شامل کر دیا ہے دوسرے اس میں بعض صریح مہملات بھی پائے جاتے ہیں جو ماننے کے قابل نہیں ہیں، تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو مفسرین قرآن نے بیان کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام چونکہ عذاب کی اطلاع دینے کے بعد اللہ کی اجازت کے بغیر اپنا مستقر چھوڑ کر چلے گئے تھے اس لیے جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ واستغفار کی تو اللہ تعالٰی نے انہیں معاف کر دیا، قرآن مجید میں خدائی دستور کے جو اصول و کلیات بیان کیے گئے ہیں ان میں مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالٰی کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کر لیتا، پس جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود ہی وہ ہجرت کر گیا تو اللہ تعالٰی کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا کیونکہ اس پر اتمام حجت کی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔

فہرست الفاظ

(ابجدی ترتیب)

ہماری اہم مطبوعات

تفسیر قرآن کے اصول	علامہ حمید الدین فراہیؒ	100.00
ترجمہ قرآن مجید	مولانا امین احسن اصلاحیؒ	300.00
تدبر حدیث (شرح موطا امام مالک)	مولانا امین احسن اصلاحیؒ	220.00
فلسفے کے بنیادی مسائل (قرآن حکیم کی روشنی میں)	مولانا امین احسن اصلاحیؒ	100.00
حقیقت نماز	مولانا امین احسن اصلاحیؒ	25.00
اصول فہم قرآن	مولانا امین احسن اصلاحیؒ	20.00
مبادی تدبر قرآن	مولانا امین احسن اصلاحیؒ	100.00
حیات رسول امی	خالد مسعودؒ	200.00
عصری اور اسلامی تصور امن۔ایک تقابلی مطالعہ	ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی جامعی	220.00
عہد نبوی کے میدان جنگ	ڈاکٹر حمید اللہؒ (پیرس)	25.00
علم وہدایت کے چراغ	عبدالرحمٰن پرواز اصلاحیؒ	50.00
نظام حق کے معمار	عبدالرحمٰن پرواز اصلاحیؒ	50.00
حقیقت حج	پروفیسر الطاف احمد اعظمی	100.00
فن غریب الحدیث کا آغاز وارتقا	ترجمہ ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	150.00
روشنی کے مینار	حافظ محمد ادریس	60.00
مغرب اور اسلامی بنیاد پرستی	ڈاکٹر محمد ارشد	100.00
قرآن مجید سمجھ کر پڑھیں	مولانا عتیق الرحمان اصلاحی	10.00

Distributed by

Al-Balagh Publications

10-Azami Apartment,N-1, Abul Fazl Enclave

Jamia Nagar, New Delhi-110025